کاروانِ رفتہ

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

مکتبہ اسلوب۔ کراچی

اشاعت اوّل — ۱۹۸۳ء

طابع — حقی آفسٹ پریس

لیاقت آباد۔ کراچی

قیمت — تیس روپے

مکتبہ اسلوب کراچی

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۱۹ کراچی ۱۸

اس کتاب کی اشاعت کے موقع پر مجھے اپنے چھوٹے بھائی

محمد نعمت اللہ قادری مرحوم

(پیدائش ۱۹۳۴ء - وفات ۲ر اپریل ۱۹۸۱)

کی یاد بے چین اور بے قرار کیے ہوتے ہے
اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے

محمد ایوب قادری

فہرست

دیباچہ

دبستانِ شبلی سے مراد اگر ایک مخصوص حلقے کے اہلِ قلم نہ ہوں، اور اس اصطلاح کو وسیع معنوں میں استعمال کیا جائے تو وہ تمام اہلِ قلم جو ادب اور تاریخ سے یکساں دلچسپی رکھتے ہیں، اُن کو دبستانِ شبلی کے وابستگان میں شمار کرنا چاہیے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر محمد ایوب قادری کو بھی دبستانِ شبلی کا نمایندہ سمجھا جاسکتا ہے کہ انہوں نے تاریخی وسوانحی اور ادبی موضوعات پر یکساں طور پر دادِ تحقیق دی ہے۔ قادری صاحب نے اپنی تقریباً دو درجن تصنیفات و تالیفات اور مرتبات کے ذریعے تحقیق کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے، جس کی مثالیں موجودہ زمانے میں بہت کم ملتی ہیں۔

قادری صاحب کے ادبی و علمی کاموں کو اگر چند لفظوں میں بیان کیا جائے تو بات کچھ اس طرح ہوگی کہ انہوں نے اردو میں حوالہ جاتی ادب پر بے حد اہم کام کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری زبان میں سب سے زیادہ کمی ایسی نوعیت کے کام کی ہے۔ حالانکہ یہی کام ہر طرح کی تحقیق کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے محقق جب کسی موضوع پر کام کرتے ہیں تو اُن کا زیادہ وقت اس تلاش میں صرف ہوتا ہے کہ اُن کے موضوع سے متعلق مواد کہاں ملے گا۔ قادری صاحب نے اہلِ تحقیق کی اسی مشکل کو آسان کیا ہے۔

قادری صاحب گزشتہ ربع صدی سے علم و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اُن کی علمی لگن کو دیکھ کر وہ علمائے سلف یاد آتے ہیں جنھوں نے ہر طرح کی آسایشوں سے بے نیاز رہ کر خدمتِ علم ہی کو اپنا اصل کام سمجھا۔ قادری صاحب سے میرے مراسم تقریباً ۲۶ برسوں سے ہیں۔ میں نے اس دوران میں اُنھیں علمی و ادبی موضوعات کے علاوہ کبھی کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ جب بھی ملے کسی نہ کسی علمی کام کی لگن میں سرشار ملے۔ کبھی کسی قدیم مطبوعہ کتاب کا ذکر ہے تو کبھی کسی مخطوطے کا۔ کبھی کسی گمنام مصنف کے حالات کی تلاش ہے تو کبھی کسی معروف مصنف کے کم معروف پہلو پر روشنی ڈالی جارہی ہے۔ خدا اُنھیں تا دیر سلامت رکھے کہ اُن سے مل کر یہ خوشی ہوتی ہے کہ ہمارا معاشرہ اُن "دیوانوں" سے ابھی خالی نہیں ہوا جو ہمیشہ "بکارِ علم ہشیار" رہتے ہیں۔

قادری صاحب کی زیرِ نظر کتاب ان سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف اخبارات و رسائل میں وقتاً فوقتاً لکھے۔ یہ مضامین، جیساکہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے،

مرحومین کے بارے میں ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں، جو متعلقہ افراد کی وفات کے فوراً بعد لکھے گئے اور بعض مضامین ایسے افراد کے متعلق ہیں جن کا انتقال ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۴ء تک کے دوران ہوا۔ اس دور کے جن افراد پر لکھا گیا ہے، اُن کے بارے میں بعض نئی معلومات کی فراہمی کا بطورِ خاص خیال رکھا گیا ہے۔ بعد کے دور کے اشخاص پر لکھتے ہوئے، اُن کے مکمل حالات زندگی قلمبند کیے گئے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ قادری صاحب نے ان اشخاص سے اپنے ذاتی تعلقات کی روداد بھی بیان کردی ہے۔ اس اعتبار سے یہ مضامین شخصی خاکے بھی ہیں اور مختصر سوانح عمریاں بھی۔ دوسرے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ قادری صاحب نے بیک وقت خاکہ نگار اور سوانح نویس کا فریضہ انجام دے کر خاکہ نگاری اور سوانح نویسی کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان مضامین کی دلچسپی اور افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

ان مضامین کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ کچھ افراد کے بارے میں قادری صاحب نے ایسی معلومات پیش کی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قادری صاحب نے ان افراد کی زندگی ہی میں اُن سے اُن کے متعلق بنیادی معلومات حاصل کرلی تھیں مثلاً ابنِ انشا کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ خود ابنِ انشا کی فراہم کردہ معلومات پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان معلومات کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔

قادری صاحب کے شخصی و سوانحی مضامین کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہ ایک مجموعے میں نہیں سما سکتے۔ جو مضامین زیرِ نظر مجموعے میں شامل نہیں ہو سکے۔ انھیں دوسری جلد میں شائع کیا جائے گا۔ اور جب تک یہ جلد شائع ہوگی، اُس وقت تک مزید مضامین لکھے جاچکے ہوں گے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں۔ اگر "کاروانِ رفتہ" بھی مالک رام صاحب کی گراں قدر تصنیف "تذکرہ معاصرین" کی طرح ایک سلسلہ وار کتاب بن جائے گی۔

کراچی ۳۰ جون ۱۹۸۳ء

مشفق خواجہ

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمّت نہیں رہی

یاروں نے کتنی دُور بسائی ہیں بستیاں

پیر جی محمّد یوسف (جاورہ)

ریاست جاورہ ہندوستان کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ پیر جی محمدؒ یوسف ولد جلال خاں جاورہ کے مشہور و معروف حضرات میں سے تھے۔ ان کے والد ریاست کے ذمّہ دار عہدیدار تھے۔ خود محمدؒ یوسف صاحب بھی ریاست کی طرف سے مُختلف عہدوں پر سرفراز رہے۔ وہ کئی کتابوں کے مُصنّف تھے۔ پیری مُریدی کا بھی سلسلہ تھا۔ ۱۳۲۱ھ میں تقریباً پچھتّر سال کی عمر میں انہوں نے اپنے خُود نوشت حالات لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تصانیف مخزن الانوار (ترجمہ گنج الاسرار)، پیراہنِ یوسفی (ترجمہ مثنوی مولانا رومؒ) مثنوی حسن یوسف، مثنوی جمالِ یوسف، مثنوی وصالِ یوسف، مولود شریف منظوم، چار باغ (ترجمہ چار گلزار) مولد حسنین ولادتِ سبطین، شرح یوسفی دیوان حافظ، تاریخ یوسفی دربار جاورہ، مظہر العجائب یوسفی (ملفوظاتِ شاہ عبدالرحیم شاہجہاں پوری)، میلادِ غوثیہ یوسفی، کُلیاتِ یوسفی، ماتم پنجتن وغیرہ ہیں۔ ان میں بیشتر طبع ہو چکی ہیں۔ پیراہنِ یوسفی اور شرح یوسفی مشہور و معروف ہیں۔ ۔ ۔ پیر جی محمدؒ یوسف تفضیلی مسلک رکھتے تھے۔ پہلے خواجہ احمدؒ رائے بریلوی اور خواجہ محمدؒ ثاقب نقشبندی سے فیض حاصل کیا۔ پھر شاہ دلدار علی مذاقؔ بدایونی و شاہ جی عبدالرحیم شاہجہاں پوری سے اکتساب فیض فرمایا۔ آخر الذکر ہر دو حضرات کے افکار و خیالات سے پیر جی محمدؒ یوسف متاثر تھے۔ ۲۹ جمادی الثانی ۱۳۲۹ھ مطابق ۲۸ جون ۱۹۱۱ء کو ان کا انتقال ہوا۔ ع رہے نام اللہ کا۔ اب سوانح عمری یوسفی[1] کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

---

[1] سوانح عمری یوسفی کا قلمی نسخہ راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

"۱۲۴۶ھ میں بمقام اندور پیدا ہوا۔ اور بفضلِ الٰہی ۱۳۲۱ھ میں بمقام گلشن آباد عرف جاورہ بعمر ۷۵ سال کے پہنچا۔ سوانح عمری اپنی مع حسب و نسب کے حوالۂ قلم کی۔ تا شاہدِ حال روزگار پر ہے۔ حق سبحانہٗ تعالیٰ انجام بخیر کرے ۔ ۔ ۔ ۔ واضح ہو۔ کہ نام راقم کا اس وقت پیرجی محمد یوسف خاں ولد محمد جلال خاں ہے۔ راقم کے دادا محمد جلال خاں صاحب قوم افغان الکوزئی باشندۂ رام پور تھے۔ ۔ ۔ ۔ میں پچیس سال تک مقام اندور میں زیر سایہ والد ماجد محمد جلال خاں صاحب رسالدار رہا۔ ازاں جملہ حضرتِ والد ماجد نے سولہ سال کی عمر تک، اساتذہ کو ملازم رکھ کر علم فارسی و تلاوت قرآن مجید سے تعلیم دلائی۔ جبکہ ۱۲۶۳ھ میں ریاست ہلکر اندور میں مدرسہ قائم ہوا، تو راقم نے (مدرسہ ہٰذا میں) تین سال تک علم فارسی حاصل کیا۔ اور کتب ہائے درسی، منتہی مثل ابوالفضل، طاہر وحید، مینا بازار، پنج رقعہ، سہ نثر ظہوری، رسائل طغریٰ اور توقیعاتِ کسریٰ مولوی صاحب سے پڑھے، اور استعدادِ کامل فنِ فارسی میں حاصل کر کے سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔"

۱۲۷۲ھ میں نواب محمد غوث خاں رئیس جاورہ نے اپنی پیشی میں پیرجی محمد یوسف صاحب کو ملازم رکھا۔ ایک سال کے بعد انقلاب ۱۸۵۷ء کا آغاز ہوا۔ دوسری ریاستوں کی طرح ریاست جاورہ بھی انگریزوں کی معین و مددگار تھی۔ پیرجی محمد یوسف صاحب نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں انگریزی مقاصد کی برآری میں پوری کوشش کی، خود لکھتے ہیں

"اسی ایام میں ماموں صاحب عبدالستار خاں بمعیت قوم ولائتیاں کے برداشتہ خاطر ہو کر مندسور گئے اور شاہزادہ فیروز شاہ کے نائب بلقب نواب مامور ہوئے۔ ہزارہا مخلوق اطراف و جوانب سے مجتمع ہوئی۔ اس اثنا میں ایک ہرکارہ سرکاری متعینہ وکیل حاضر باشی

شور صاحب بہادر پولٹیکل ایجنٹ چھاؤنی نیمچہ کا خط لے کر آتا تھا کہ مندسور میں شاہزادہ کے یہاں گرفتار ہوا۔ چونکہ اس خطِ وکیل میں حال پولٹیکل ایجنٹ صاحب کا تحریر تھا۔ باغیانِ مندسور نے نواب صاحب بہادر کو انگریزوں کا طرفدار جان کر فوج لوٹنے شہر جاورہ کو بھیجنا مقرر کیا، اور ہرکارہ کو پھانسی دینے کا حکم دیا نواب صاحب بہادر (جاورہ) نے جو بحیلہ سازی خود کو ظاہر میں دوست شاہزادہ کا ظاہر کر رکھا تھا، پوشیدہ راقم کو نزدیک شاہزادہ کے بھیجا، تاکہ از راہ سالوسی و چاپلوسی کے شاہزادہ کو راضی کر دے کہ اس طوفانِ بے تمیزی سے نجات ہوئے۔ اور ہرکارہ اس بلا سے چھوٹے۔ چنانچہ راقم اس عین غدر میں سوار ہو کر تنہا مندسور گیا، اور ماموں صاحب عبدالستار خاں سے یہ خیال ظاہر کر کے حسب مشورہ ان کے بوقت شب شاہزادہ کی خدمت میں گیا۔ اور بگفتگوئے شائستہ ہم بالجاجت اور ہم باد باغت احسان ماضیہ نواب صاحب بہادر کو حجابِ نظر خشمگیں شاہزادہ کر کے نقشہ ان پر جمایا۔ اور ارادہ فاسد سے ان کو باز رکھ کر ہرکارے کو ہمراہ لے کر حاضر ہوا۔"

اس زمانہ میں پولٹیکل ایجنٹ کے حسب منشا نواب جاورہ اسونڈ واڑہ میں انقلابیوں سے مقابلہ کے لئے گئے۔ اس مہم میں بھی پیر جی محمد یوسف صاحب نے حصہ لیا۔ پھر مہد پور اور مندسور کے انقلابیوں کو گرفتار کرانے میں معین و مددگار رہے۔ اور بقول خود بجلدو اس خدمت کے افسر گرائی و منصرم فوجداری دربارہ جاورہ" مقرر ہوئے۔ نیز نواب جاورہ نے خلعت اور سندِ خیر خواہی سے سرفراز فرمایا۔ ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ میں نواب محمد غوث خاں رئیس جاورہ کا انتقال ہوا، اور ان کے صاحبزادے محمد اسمٰعیل مسندنشین ہوئے۔ محمد اسمٰعیل خاں کی

عمر اس وقت دس سال تھی، اس لئے ریاست کا تمام تر انتظام حضرت نور خاں کے سپرد ہوا۔ پیر جی محمد یوسف صاحب نے کئی سال سیر و سیاحت میں بسر کئے اور ۱۲۸۷ھ میں پھر محکمۂ فوجداری ان کے سپرد ہوا۔

۱۲۹۰ھ میں نواب محمد اسمٰعیل خاں کو اختیارات ملے پیر جی محمد یوسف خاں نے آہستہ آہستہ نواب صاحب کے مزاج میں کافی دخل حاصل کیا اور اپنے حریفوں کے مقابلہ میں ہمیشہ کامیاب رہے۔

۱۲۹۲ھ میں خان جہان خاں ریاست ٹونک کے کامدار (نائب) مقرر ہوئے۔ اور انہوں نے پیر جی محمد یوسف خاں کو اپنا مشیر مقرر کیا۔ اور ان کو صدر پرگنہ (ٹونک) کا تحصیلدار مقرر کیا، اور پیر جی محمد یوسف صاحب نواب ٹونک کے الطاف و اکرام سے بھی بہرہ ور رہے ۱۲۹۵ھ میں دفعتاً خان جہان خاں ایک حادثہ میں فوت ہو گئے۔ اس لئے پیر جی جاورہ واپس آ گئے۔ اور ریاست جاورہ میں عہدۂ فوجداری پر مامور ہو گئے، اس کے بعد کامداری کے عہدہ پر فائز رہے۔ ۱۳۱۰ھ میں صاحبزادگانِ نواب جاورہ کے اتالیق مقرر ہوئے۔ ۱۳۱۳ھ میں نواب محمد اسمٰعیل خاں رئیس جاورہ کا انتقال ہوا۔ اور ان کے بعد ان کے بیٹے محمد افتخار علی خاں مسند نشینِ ریاست ہوئے، اور یار محمد خاں نائب مقرر ہوئے۔ آخر عمر میں پیر جی محمد یوسف خاں کو چند مقدمات در پیش ہوئے۔ بعض میں کامیاب رہے۔ بعض میں ناکام۔

سوانح عمری یوسفی کا اختتام ان سطور پر ہوا ہے۔

"الحمد للہ علیٰ احسانہ، کہ حالاتِ گذشتہ تمام عمر کا اس نے اپنے فضل و کرم سے اس انسان ضعیف البنیان کو نسیان سے بھرا ہوا ہے۔ پھر تمام و کمال اس پیرانہ سالی میں یاد دلایا۔ کہ مشرح زبان زد خامہ کیا۔ کہ یہ

اوراق اس کو ہمیشہ بیان کریں گے۔ اللہ تعالےٰ ان اوراق کو
دائم و قائم رکھے۔ پس راقم نے یہ سب حالات عرصہ پندرہ یوم
میں تحریر کئے، اور نقل اس کی بتاریخ ۱۵ رجب المرجب ۱۳۲۱ھ
مطابق ۷ اکتوبر ۱۹۰۳ء میں اختتام کو پہنچائی اللہ تعالےٰ انجام
اس کا بخیر کرے۔ آمین "

حکیم نجم الغنی خاں رامپوری

روہیلوں کے عہدِ اقتدار میں روہیل کھنڈ کے اکثر قصبات و بلاد علوم و فنون کا مرکز بن گئے تھے۔ اطراف و جوانب سے علماء و فضلاء اور شعراء و حکماء اس علاقے میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ مولوی نجم الغنی کے بزرگ ملا محمد سعید خان تیرہ سے ترک سکونت کر کے پہلے دہلی آئے یہ خاندان چنگیز خان کی نسل میں چغتہ برلاس ہے۔ محمد سعید خان نے اس دور کے نامور عالم اور محدث شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ ان ہی سے تمام علوم مروجہ حاصل کئے اور شاہ صاحبؒ کے ہمراہ حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی بہرہ اندوز ہوئے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے انتقال (۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) کے بعد وہ روہیلوں کے مرکزی شہر بریلی آئے۔ اس وقت زمام اقتدار حافظ الملک حافظ رحمت خان کے ہاتھ میں تھی۔ حافظ صاحب نے ملا سعید خان کو اپنے فرزندِ اکبر عنایت خان کی تعلیم و تربیت پر مقرر کیا، اور سعید خان کا بریلی ہی میں انتقال ہوا۔

شجاع الدولہ نواب وزیر کی ہوس ملک گیری اور ناعاقبت اندیشی سے حافظ رحمت خان کی شہادت کے بعد روہیلوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا نواب فیض اللہ خان ابن نواب علی محمد خان کو رام پور کا علاقہ ملا۔ بچے کھچے خاندانوں نے رام پور کا رُخ کیا۔ ملا سعید خان کے پانچ فرزند بھی بریلی کی سکونت ترک کر کے رام پور پہنچے، ان میں ایک ملا عبدالرحمان تھے۔ جو ظاہری و باطنی علوم میں کامل تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ ان کو "فضائل مآب" اور "فضیلت پناہ" لکھتے تھے۔ ۱۲۲۴ھ میں ملا عبدالرحمان کا انتقال ہوا۔ ان کے

صاحبزادے مولوی عبدالعلی خان تھے جو نہایت فاضل اور رام پور میں مفتی عدالت تھے۔ ان کو شاعری کا بھی ذوق تھا، اور علی تخلص کرتے تھے، ۱۲۰۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ وہ حکیم نجم الغنی کے حقیقی دادا تھے۔ ان کے صاحبزادے مولوی عبدالغنی تھے۔ جو ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے، انھوں نے رام پور کے مشاہیر و اکابر علما مفتی شرف الدین، ملا غفران اور مولوی عبدالعلی خان ریاضی دان وغیرہ سے تحصیل علوم کی۔ کچھ دنوں رام پور میں وکالت کی، پھر وہ اودے پور میواڑ چلے گئے اور وہاں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد رام پور آ گئے۔ ۱۲/ اپریل ۱۸۹۹ء کو مولوی عبدالغنی کا رام پور میں انتقال ہوا۔ ان ہی کے فرزند مولوی نجم الغنی رام پوری ہیں جو اپنے دور کے نامور عالم، مدرس، مصنف اور مورخ گزرے ہیں، انھوں نے اردو کے تاریخی و علمی سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

مولوی نجم الغنی رام پوری ۱۰/ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۸/ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو رامپور میں پیدا ہوئے، نجم الغنی (۱۲۷۶) ان کا تاریخی نام ہے۔ وہ اپنے والد کے اکلوتے فرزند تھے، اُن کی پرورش و تربیت پر خاص توجہ دی گئی۔ مولوی نجم الغنی کی عمر ابھی چار سال تھی کہ ان کے والد مولوی عبدالغنی ۱۸۶۳ء میں بسلسلۂ ملازمت اودے پور چلے گئے، لہٰذا ان کی ابتدائی تعلیم تمام تر اودے پور میں ہوئی۔

مولوی نجم الغنی نے عربی و فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد مولوی عبدالغنی سے اودے پور میں پڑھیں، اور پھر وہ ۱۳۰۱ھ میں رام پور آ گئے۔ انھوں نے علوم مروجہ کی تحصیل علمائے رام پور سے کی، فلسفۂ قدیم کی بعض کتب مولانا عبدالحق خیرآبادی سے پڑھیں اور عربی ادب کی تحصیل مولانا طیب عرب مکی سے کی، دوسرے تمام علوم شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ سے حاصل کیے۔ ۱۸۸۹ء میں مدرسہ عالیہ رام پور میں درس نظامی کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا، اس کے بعد علم طب کی تحصیل کی۔ اطبائے لکھنؤ اور اپنے ماموں حکیم اعظم خان رام پوری سے استفادہ کیا حکیم اعظم خان

اپنے دور کے نامور حکیم تھے۔

تحصیلِ علوم میں مولوی نجم الغنی نہایت محنت اور کوشش کرتے تھے۔ ٹمٹماتے چراغ کے سامنے رات رات بھر مطالعۂ کتب میں گزار دیتے۔ ایک مرتبہ رات کو مطالعہ کے دوران چراغ کی لو سے ان کی پگڑی میں آگ لگ گئی لیکن بروقت آگاہ ہو گئے۔ طالب علمی کے زمانے میں طعام ولباس کی بھی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ ان کے شوقِ علم کا اندازہ اس واقعہ سے لگائیے کہ اپنے ایک اُستاد کے یہاں کیاریوں کو سینچنے کے لئے روزانہ کنوئیں سے پانی کھینچتے تھے، اور اس کام کو انجام دینے میں اکثر ان کے ہاتھوں میں آبلے پڑ جاتے تھے۔ ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو مولوی نجم الغنی رام پور میں ایک طبیب کے یہاں پڑھنے جایا کرتے تھے، ان کا مکان مولانا کے گھر سے کافی فاصلے پر تھا۔ ایک روز جبکہ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ وہ پڑھنے کے لئے گئے، اُستاد نے کہلا دیا ابھی بارش ہو رہی ہے سہ پہر کو آنا۔ نجم الغنی بھیگتے ہوئے واپس چلے آئے، اتفاق سے اس روز بارش نہیں تھمی۔ سہ پہر کو پھر بھیگتے بھاگتے اُستاد کے یہاں پہنچے۔ اُستاد اِن کے ذوقِ علم سے متاثر ہوئے اور اپنے تساہل کی معافی چاہی۔

تحصیلِ علم کے بعد نجم الغنی نے طب کا مشغلہ اختیار کیا۔ رجوعِ خلق خوب ہونے لگی۔ بعض پیچیدہ بیماریوں کے علاج بھی کئے، اس کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا کام جاری رہا۔ چونکہ ان کے والد ریاست اودے پور میواڑ میں نیک نامی سے خدمات انجام دے چکے تھے، لہٰذا اودے پور میں مولوی نجم الغنی کی طلبی ہوئی اور یکم نومبر ۱۹۰۱ء کو اودے پور ہائی اسکول میں بحیثیت ہیڈ مولوی تقرر عمل میں آیا۔ اودے پور میں قیام کے زمانے میں تصنیف وتالیف کا کام جاری رہا، بلکہ جلد ہی ان کی اچھی خاصی شہرت ہو گئی اور مُلک کے مشاہیر اِن سے ملاقات کے لیے اودے پور پہنچنے لگے۔

اوائل جولائی ۱۹۲۴ء میں اودے پور کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن

مالوف رام پور آ گئے اور سارا وقت مطالعۂ کتب اور تصنیف و تالیف میں صرف کرنے لگے، جو کام بڑے بڑے علمی اداروں کے کرنے کے تھے وہ مولوی نجم الغنی نے تنہا انجام دیئے۔ ریاست رام پور کی معارف پروری کی بدولت اودے پور کے قیام کے زمانے میں نجم الغنی کو پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ مگر رام پور آنے کے بعد وظیفے کی رقم سو روپیہ ماہانہ ہو گئی، طعام اور سواری وغیرہ کا انتظام ریاست کی طرف سے اسکے علاوہ تھا۔

ایک مرتبہ ان کو نواب حامد علی خان رئیس رام پور (ف ۱۹۳۰ء) کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا، صورت یہ ہوئی کہ روہیلہ ریاست کے بانی نواب علی محمدؐ خان (ر ۱۱۶۲ھ) کو ایک روہیلہ سردار داؤد خان نے پرورش کیا تھا۔ وہ داؤد خان کو ایک لڑائی میں موضع بانکولی تحصیل بہیڑی (ضلع بریلی) سے کم سنی میں ہاتھ لگے تھے۔ جاٹ قبیلہ کے چشم و چراغ تھے۔ داؤد خان کے کوئی اولاد نہیں تھی، اس نے علی محمدؐ خان کی نہایت اعلیٰ پیمانے پر پرورش اور تعلیم و تربیت کی اور اپنا جانشیں مقرر کیا۔ علی محمدؐ خان روہیلوں کے سردار اور ریاست کے بانی ہوئے، یہی بات حکیم نجم الغنی نے اپنی کتاب اخبار الصنادید (تاریخ روہیل کھنڈ) طبع اوّل ۱۹۰۴ء میں لکھ دی، بھلا یہ بات نواب حامد علی خان کو کب گوارا ہو سکتی تھی۔ نواب کی رشتہ داری جانسٹھ کے سادات میں ہو چکی تھی۔ اور سادات جانسٹھ نے ایک "شجرہ سیادت" بھی مرتب کر دیا تھا، نواب حامد علی خان نے حکیم نجم الغنی خان کو اودے پور سے طلب کر لیا۔ نواب نے نہایت غم و غصہ کا اظہار کیا اور فیصلہ ہوا کہ اخبار الصنادید (طبع اوّل ۱۹۰۴ء) بحق سرکار ضبط اور نذرِ آتش، اس کتاب کا ایک ایک نسخہ حاصل کر کے جلایا گیا اور کتاب پر جو رقم خرچ ہوئی تھی وہ نجم الغنی خان کو ادا کی گئی، خاکسار کے خاندان میں اخبار الصنادید کا وہ نادر نسخہ (طبع اوّل) محفوظ تھا۔ جو اب پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی زینت ہے اور طبع اوّل کا ایک جلا ہوا نسخہ ترقیٔ اردو بورڈ کراچی کے کتب خانے میں بھی ہے۔ ۱۹۱۸ء میں نجم الغنی خان نے اخبار الصنادید کا دوسرا ایڈیشن تیار کر کے شائع کرایا۔ جس میں نواب حامد علی خان رئیس رام پور

کے حسب الحکم سادات کا نسب نامہ شامل کیا گیا۔ مگر اتفاق کی بات نواب حامد علی خان ۱۹۳۰ء میں فوت ہو گئے اور نجم الغنی خان زندہ رہے۔ چنانچہ ان کے قلم حقیقت رقم نے ایک کتاب "مختصر تاریخ ریاست رام پور" لکھ کر اصل حقیقت پھر لکھ دی نجم الغنی کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہماری نظر سے گزرا ہے اور اس کی ایک ٹائپ شدہ نقل ہم نے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی لائبریری میں داخل کر دی ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اخبار الصادید پر اپنے ایک خط میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

لاہور۔ ۱۴ دسمبر ۱۹۱۸ء

مخدوم و مکرم جناب قبلہ حکیم صاحب .... اَلسّلامُ علیکم

اخبار الصادید کی دو جلدوں کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ میں نے پہلی جلد کو بالخصوص نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا۔ قوم افغان کی اصلیت پر آپ نے خوب روشنی ڈالی ہے۔ کشامرہ غالباً اور افاغنہ یقیناً اسرائیلی الاصل ہیں۔ قاضی امیر احمد شاہ رضوانی جو خود افغان ہیں، ایک دفعہ مجھ سے فرماتے تھے۔ کہ لفظ "فغ" قدیم فارسی میں بمعنی "بت" آیا ہے اور افغان میں الف سالبہ ہے چونکہ ایران نے انہیں افغان کے نام سے موسوم کیا ہے۔

میرے خیال میں حال کی پشتو زبان میں بہت سے الفاظ عبرانی اصل کے موجود ہیں، اگر تحقیق کی جائے تو مجھے یقین ہے نہایت بار آور ہو گی اور آپ کا طرز تحریر نہایت سادہ اور مؤثر اور بحیثیت مجموعی آپ کی تصنیف تاریخ کا عمدہ نمونہ ہے۔

والسلام

آپ کا مخلص

محمدؐ اقبال بیرسٹر ایٹ لاء

حکیم نجم الغنی خان کا سارا وقت مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف میں صرف ہوتا تھا۔ وہ دن کا ایک حصہ رام پور کے سرکاری کتب خانے میں گزارتے تھے اور بقیہ حصہ اپنے گھر پر تصنیف و تالیف میں صرف کرتے تھے، لوگوں سے بہت کم ملتے

تھے۔ رام پور کا ایک خاص محدود علمی حلقہ تھا جس سے ان کا رابطہ تھا۔ اکثر لوگ ان کی علمی حیثیت اور مرتبہ سے بھی بے خبر تھے، جب خواجہ حسن نظامی، نواب حبیب الرحمان خان شروانی، عبدالحلیم شرر، مولوی رضی الدین بسمل بدایونی (مولف کنز التاریخ) اور علامہ شبلی نعمانی جیسے مشاہیر ملت، مولوی نجم الغنی سے ملنے ان کے مکان پر جاتے تھے تو اہل محلہ کو نجم الغنی کی حیثیت اور علمی مرتبہ کا اندازہ ہوتا تھا۔

حکیم نجم الغنی خان کی زندگی بہت سادہ تھی۔ صبح کو جب تک وہ بیس ۲۰ صفحے نہیں لکھ لیتے تھے مکان سے نہیں نکلتے تھے۔ ان کے اوقات نہایت منضبط تھے۔ اسی اصول پرستی اور نظام الاوقات کی پابندی کا نتیجہ ہے، کہ انہوں نے اتنی ضخیم کتابیں یادگار چھوڑیں۔

حکیم نجم الغنی خان نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا ہے، کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا ہے، بہت سی قلمی کتابیں ان کی تصانیف کے ذریعے اہل علم سے متعارف ہوئیں۔ تاریخ اودھ پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے، وہ ان کی محنت اور تدوین کی زندہ مثال ہے۔ نصف صدی گزرنے کے بعد بھی اس موضوع پر مزید کوئی قابل قدر کام نہیں ہوا۔ وہ تاریخ کو مذہب یا عقیدے کے قلم سے نہیں لکھتے تھے۔

حکیم نجم الغنی خان کو کتابوں کی ہمیشہ تلاش رہتی تھی، کتابوں اور تاریخی آثار دیکھنے کے لئے اکثر سفر بھی کرتے تھے، استاد محترم مولوی اسد علی خان رام پوری (۱۹۵۶ء) اور مولانا حکیم عبدالغفور آنولوی (۱۹۶۴ء) کا بیان ہے کہ نجم الغنی خان اکثر آنولہ، بریلی اور بدایوں آتے، ان بستیوں کے پرانے خاندانوں کے افراد سے ملتے اور ان کے پرانے ذخیروں، کتابوں اور کاغذات کو دیکھتے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں حکیم نجم الغنی آنولہ آئے اور بعض اہل شہر کے ہمراہ وہ اہائی چھترا (رام نگر) کا قلعہ دیکھنے گئے۔ مولوی اسد علی مرحوم کا بیان ہے کہ وہ روہیل کھنڈ کے آثار و عمارات پر بھی کتاب لکھنے کے لئے مواد جمع کر رہے تھے۔ جو غالباً تیار نہ ہو سکی۔

جب ۱۹۳۰ء میں نواب حامد علی خان کا انتقال ہو گیا اور نواب رضا علی خاں (ف ۱۹۶۶ء)

سریر آرائے حکومت ہوئے تو انہوں نے ریاست کے نظم و نسق میں بعض تبدیلیاں اور اصلاحات کیں اور ریاست کی آمدنی و خرچ کو متوازن کرنے کی غرض سے بہت سے وظیفے بند کر دیئے، مولوی نجم الغنی بھی اِس لپیٹ میں آئے۔ مگر بعض حضرات کی سفارش سے ان کا وظیفہ بحال رہا اور ان کو ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو کتب خانہ سرکاری کا ناظم مقرر کر دیا گیا یہ ذمہ داری برائے نام تھی۔ اِس معاملے میں خواجہ حسن نظامی نے خاص طور سے کوشش کی تھی۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں حکیم نجم الغنی خاں کی ملاقات کا مندرجہ ذیل الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

"اس (ناشتہ) کے بعد مولانا نجم الغنی صاحب مورخ سے ملنے گیا جو موجودہ زمانے کے سب سے عمدہ اور بہت زیادہ اور نہایت محققانہ اور آزادانہ اور بے باکانہ لکھنے والے مورخ ہیں۔ شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ صاحب مرحوم دہلوی نے آخر زمانے میں تاریخ کی بہت بڑی بڑی جلدیں لکھی ہیں۔ مگر مولانا نجم الغنی خان صاحب کی کتابیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں، اور ضخامت میں بھی زیادہ ہیں، تاریخ کے علاوہ طب وغیرہ علوم و فنون کی بھی بہت اچھی اچھی کتابیں لکھی ہیں شہرۂ آفاق فلاسفروں اور مصنفوں کی طرح ایک نہایت مختصر اور سادہ مکان میں بیٹھے تھے۔ چاروں طرف کتابوں اور نئے مسودات کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ساٹھ ستر کے قریب عمر ہے۔ بال سب سفید ہو گئے ہیں، مگر کام کرنے کی انرجی اور مستعدی جوانوں سے زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ بہت عمدہ پھل کھلائے، پان کھلائے اور اپنی تازہ تصانیف بھی دکھلائیں ایک کتاب اودے پور کی نسبت لکھی ہے۔ مولانا شبلی مرحوم نے "اورنگ زیب پر ایک نظر" کے نام سے بہت اچھی کتاب شائع کی تھی۔ مگر وہ راجپوتانے کے واقعات سے بے خبر تھے۔ مولانا نجم الغنی خاں صاحب نے راجپوتانہ کی مستند تاریخوں سے اورنگ زیب کی

تاریخی حمایت کا حق ادا کیا ہے، اور اودے پور کے مہارانا کے اِس غرور اور گھمنڈ کو توڑ پھوڑ کر مسمار کر دیا ہے۔ جس میں آج تک وہ مبتلا ہے۔ موجودہ مہارانا کے والد ۱۹۱۱ء کے شاہی دربار میں دہلی آئے تو شہر کے باہر ٹھہرے، کیونکہ ان کے یہاں یہ عہد ہے۔ کہ دہلی میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہونگے۔ انگریزوں نے بھی اودے پور کے خیالی پلاؤ کی مخالفت نہیں کی اور مہارانا کو دہلی کے اندر آنے کے لئے مجبور نہیں کیا تاکہ ان کی آن بان باقی رہے۔ مگر مولانا نجم الغنی صاحب کی اِس تاریخ کو پڑھ کر اودے پور کے سب نشے ہرن ہو جائیں گے اور وہ طلسم ٹوٹ جائے گا جو اودے پور کی فرضی روایتوں نے ہندو قوم کے دل و دماغ میں بنا رکھا ہے کہ اودے پور کا مہارانا کبھی مسلمان سلطنت کے سامنے نہیں جُھکا اور کبھی مسلمانوں سے مغلوب نہیں ہوا۔

میں نے مولانا سے یہ کتاب لے لی اور میں اس کو اپنے اہتمام سے اور اپنے خرچ سے شائع کروں گا۔ مولانا نے اس کا نام "تاریخ اودے پور" رکھا ہے۔ مگر میں نے اس کے نئے نام تجویز کئے ہیں، جن میں سے ایک "غرور شکن" ہے اور دوسرا "اودے پور کا فرضی طلسم" ہے۔ یہ کتاب خدا نے چاہا بہت جلد شائع ہو جائے گی۔ مولانا نجم الغنی صاحب بہت زیادہ کام کرتے ہیں۔ ان کی عمر اور ان کی صحت کو دیکھ کر مجھے بہت غیرت آئی، کہ مجھے اپنے زیادہ کام کا فخر رہتا ہے۔ حالانکہ مولانا نجم الغنی صاحب مجھ سے زیادہ بوڑھے ہیں، مگر کئی حصے زیادہ کام کرتے ہیں۔

رخصت ہوا تو مولانا سواری تک پہنچانے آئے قدیمی بزرگوں کی تہذیب و شائستگی کا وہ ایک مکمل نمونہ ہیں۔[1]

---

[1] ضمیمہ نظام المشائخ دہلی، اگست ۱۹۳۰ء۔ صفحہ ۱۷، ۱۸

مسلسل علمی کام کرنے کی وجہ سے مولوی نجم الغنی بیمار رہنے لگے۔ جون ۱۹۳۲ء
میں دردِ سر کا دورہ پڑا، علاج کی غرض سے بریلی گئے پہلے سرکاری اسپتال میں
علاج ہوا، پھر ایک انگریز اسپیشل ڈاکٹر کو دکھایا مگر وقت پورا ہو چکا تھا۔ ۳۰ جون
۱۹۳۲ء کو بریلی سے رام پور روانہ ہوئے اور راستے ہی میں اپنی جان، ۳۰ جون
اور یکم جولائی کی درمیانی شب میں جانِ آفریں کے سپرد کر دی، وہ رام پور میں
شاہ درگاہی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ جناب رشید اللہ خان رام پوری خوشنویس
مدرسہ عالیہ رام پور نے مندرجہ ذیل تاریخ ہجری کہی ہے۔

گفتمش مصرعہ تاریخ رشید رفت با حوصلہ سوئے جنت
۱۳۵۱ھ

حاجی فیاض خان رام پوری نے تاریخ عیسوی نکالی ہے:۔

یافت ہاتف چو در رنج و الم فیاض را
گفت "شد واصل بحق نجم الغنی اہلِ صفا"
۱۹۳۲ء

شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ نجمی تخلص کرتے تھے وہ اپنی ضخیم اور وقیع
تصنیفات و تالیفات کی بدولت زندہ جاوید ہیں۔ اِن کی تالیفات کی فہرست
درج ذیل ہے:۔

۱۔ مذاہب الاسلام:۔ اس میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا تفصیلی بیان ہے۔
کئی بار مطبع پیسہ اخبار لاہور۔ مطبع احمدی رام پور اور مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع
ہو چکی ہے۔ ابھی حال میں خاکسار کے مقدمہ کے ساتھ لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

۲۔ عقود الجواہر فی احوال الجواہر
۳۔ سلک الجواہر فی احوال الجواہر
یہ دونوں رسالے بوہروں کے حالات میں ہیں اور مطبع نیر اعظم مراد آباد میں چھپے ہیں۔

۴۔ اخبار الصنادید ۲ حصے:۔ یہ روہیلوں اور روہیل کھنڈ کی مفصل تاریخ
ہے، پہلا ایڈیشن پیسہ اخبار لاہور میں چھپا تھا اور دوسرا ایڈیشن ۱۹۱۸ء میں مطبع
نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۵۔ تاریخ اودھ:۔ یہ اودھ کی مفصل و مستند تاریخ ہے۔ پہلی مرتبہ نیر اعظم مراد آباد

سے چار جلدوں میں اور دوبارہ مطبع نول کشور لکھنؤ سے پانچ جلدوں میں شائع ہوئی۔ ابھی حال میں خاکسار کے مقدمہ کے ساتھ نفیس اکیڈمی کراچی نے شائع کی ہے۔

۶- کارنامۂ راجپوتاں :- راجستھان کی تاریخ ہے۔ بریلی سے شائع ہوئی ہے۔

۷- وقائع راجستھان :- یہ بھی راجپوتانے کی تاریخ ہے۔ اور مطبع روزنامہ ہمدم لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

۸- تاریخ راجپوتانہ :- یہ کتاب مطبع پیسہ اخبار لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

۹- نہج الادب :- فارسی قواعد، اصول ادب، صنائع و بدائع اور علم بیان پر مفصل تصنیف ہے، ۱۹۱۹ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

۱۰- رسالہ نجم الغنی :- یہ نہج الادب کا خلاصہ ہے، مطبع احمدی رام پور سے شائع ہوا۔

۱۱- منتہی القواعد عرف قواعد حامدی :- یہ اردو زبان میں ہے مطبع نیر اعظم مراد آباد سے شائع ہوئی ہے۔

۱۲- شرح نکتہ رسالہ عبدالواسع ہانسوی :- یہ فارسی رسالہ منتہی القواعد کے ساتھ چھپا ہے۔

۱۳- بحر الفصاحت :- یہ اپنے موضوع پر اہم اور ضخیم کتاب ہے، پنجاب یونیورسٹی کے اردو فاضل کے کورس میں داخل رہی ہے۔ ایک مرتبہ رام پور میں اور دو مرتبہ مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

۱۴- مفتاح البلاغت :- یہ بحر الفصاحت کا انتخاب ہے اور پیسہ اخبار لاہور سے شائع ہوا ہے۔

۱۵- خواص الادویہ :- یہ کتاب ادویۂ مفردہ کے بیان میں ہے۔ تین جلدوں میں مطبع پیسہ اخبار لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

۱۶- خزانۃ الادویہ :- یہ کتاب چار جلدوں میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

۱۷- خزائن الادویہ :- یہ کتاب آٹھ ضخیم جلدوں میں مطبع پیسہ اخبار لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

۱۸- قرابادین نجم الغنی :- یہ مرکب ادویہ کے بیان میں ضخیم کتاب ہے۔ مطبع

نول کشور لکھنؤ سے دو مرتبہ چھپ چکی ہے۔

۱۹- القول الفیصل فی شرح الطہر المتخلل:- شرح وقایہ کے مسئلہ طہر متخلل کی شرح عربی زبان میں ہے۔ مذاہب الاسلام کے آخر میں یہ رسالہ مطبع احمدی رام پور سے ۱۹۰۱ئ میں چھپا ہے۔

۲۰- مختصر الاصول:- یہ کتاب اصولِ فقہ میں ہے مطبع نیر اعظم مُراد آباد سے شائع ہوئی ہے۔

۲۱- مزیل الغواشی:- اصول شاشی کی شرح ہے۔ مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

۲۲- تہذیبُ العقائد:- عقائد نسفی کی شرح ہے کئی مرتبہ مطبع نامی لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

۲۳- تعلیم الایمان:- فقہ اکبر کی ضخیم شرح ہے۔ مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے۔

۲۴- تذکرۃ السلوک:- تصوّف و سُلوک سے متعلق کتاب ہے آخر میں مصطلحاتِ صوفیہ کی فہرست باعتبار حروفِ تہجّی شامل کر دی گئی ہے۔ مطبع نیّر اعظم مراد آباد سے شائع ہو چکی ہے۔

۲۵- شرح سراجی:- علمِ فرائض میں نہایت اہم اور مُفید کتاب ہے۔ مطبع سرکاری رام پور میں طبع ہوئی ہے

۲۶- معیار الافکار:- یہ فارسی زبان کا رسالہ مطبع احمدی رام پور سے شائع ہوا ہے۔

۲۷- شرح چہل کاف:- یہ رسالہ مطبع نیّر اعظم مراد آباد سے شائع ہوا ہے۔

۲۸- مفتاح المطالب:- یہ رسالہ قرآن کی آیات سے فال نکالنے کے بیان میں ہے اور شیخ محی الدین ابنِ عربی کے ایک عربی رسالہ کا اُردو ترجمہ ہے مطبع سرور قیصری رام پور سے شائع ہو چکا ہے۔

۲۹- تاریخ ریاست حیدر آباد دکن:- حیدر آباد دکن کی مفصّل تاریخ ہے۔ مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

۳۰- مختصر تاریخ رام پور (قلمی):- اس کی کیفیت بیان کی جا چکی ہے۔

۳۱- تسہیل اللغات:- یہ کتاب اُردو زبان میں لغات و مصطلحات پر لکھی تھی ۱۹۲۸ئ تک حروف سین تک لکھی جا چکی تھی معلوم نہیں مکمل ہو سکی یا نہیں۔

۳۲- تاریخ اودے پور:- جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

نجیب آباد (ضلع بجنور، صوبہ یوپی) کا مشہور قصبہ ہے۔ اس کو نواب نجیب الدولہ نے آباد کیا تھا۔ اس زمانے کی کئی تاریخی عمارتوں کے کھنڈر آج بھی بے ثباتیٔ عالم کا مرثیہ پڑھ رہے ہیں۔

نجیب الدولہ کے دورِ اقبال میں بنیر و سوات و باجوڑ وغیرہ کے بہت سے قسمت آزما روہیل کھنڈ میں آئے۔ ان ہی میں ایک صاحب سید شاہ خاں بھی تھے۔ وہ ہندوستان پہنچ کر نواب نجیب الدولہ کے دامنِ دولت سے وابستہ ہو گئے۔ حسبِ ضرورت فوجی و انتظامی خدمات انجام دیں۔ نہ معلوم کیا اسباب ہوئے کہ سید شاہ خاں، اپنے دو خورد سال بچوں احمد شاہ خاں اور ضامن شاہ خاں کو ہندوستان میں چھوڑ کر بنیر واپس چلے گئے اور وہیں فوت ہوئے۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنے ماموں احمد خاں کی سرپرستی میں پرورش و تربیت پائی۔ اپنے باپ کی طرح نواب نجیب الدولہ کے جانشینوں کی سرکار میں خدمات انجام دینے لگے اور اکثر مواقع پر بہادری و تہوری کا مظاہرہ کیا۔

ضامن شاہ خاں کے بیٹے مظفر شاہ خاں ہوئے جنھوں نے عہدِ انگریزی کی گفر سامانیاں دیکھیں۔ خاندانِ نجیب الدولہ کی بربادی اور زبوں حالی ان کی نظروں سے گزری۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہائلہ اُن کے سامنے رُونما ہوا جس میں انھوں نے مردانہ وار حصہ لیا۔ نواب محمود خاں نے مظفر شاہ خاں کو نجیب آباد کے حدود شمالی (ہلدو کھاتہ) کا نگران مقرر کیا تھا۔

انگریزوں نے کامیاب ہونے کے بعد سخت انتقام لیا۔ بعد از خرابیٔ بسیار مظفر شاہ خاں کی رہائی عمل میں آئی مگر جائداد ضبط ہوئی اور مکانات ڈھا دیے گئے۔ ان ہی مظفر شاہ خاں کے بیٹے مولوی نادر شاہ خاں ہوئے جو تقریباً ۱۸۶۶ء میں نجیب آباد میں پیدا ہوئے

نادر شاہ خاں نہایت جری و بہادر تھے۔ ان کی تعلیمی کیفیت اور تحصیل علم کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی مگر فارسی میں انھیں اعلیٰ دسترس حاصل تھی اور عربی سے بھی واقف تھے۔ وہ جنگلات کے ٹھیکے لیتے تھے۔

۱۹۲۷ء میں مولوی نادر خاں شاہ کا انتقال ہوا۔

اکبر شاہ خاں نجیب آبادی، مولوی نادر شاہ خاں کے بیٹے تھے۔ ۱۸۷۵ء میں قصبہ نجیب آباد محلہ پٹھان پورہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور فارسی ادب کی تحصیل اپنے والد سے کی۔ مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا۔ عربی کی تعلیم متوسطات تک ہوئی مگر مطالعہ نے اس نصابی کمی کو پورا کر دیا۔ قرآن پر بڑا عبور حاصل تھا حسب ضرورت علم طب بھی پڑھا۔ انگریزی میں خط و کتابت کر لیتے تھے، ان کی طبیعت کو شعر گوئی سے بھی مناسبت تھی۔ حکیم جمشید علی خاں اختر دہلوی سے مشورۂ سخن کیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

سچ ہے اکبر تیری اصلاح غزل کے واسطے اختر شیریں سخن جیسا سخنور چاہیئے

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دور شباب میں شعر و سخن کا اکثر مشغلہ رہا اور مجلس شعر و ادب میں ان کی مرکزی حیثیت ہوتی تھی۔ چنانچہ کہتے ہیں:

کہاں پھر شعر گوئی اور کہاں لطفِ سخن سنجی نجیب آباد میں چرچا ہے اکبر شاہ خاں تک ہے

اکبر شاہ خاں کی نظمیں اور غزلیں ان کے رسالہ عبرت میں شائع ہوئی ہیں جن سے ان کی پختگیٔ کلام کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، اسی شعری ذوق کی وجہ سے اکبر شاہ خاں سے کے تعلقات مولانا حسرت موہانی سے ہوئے

تعلیم سے فراغ حاصل کرنے کے بعد مولانا اکبر شاہ خاں تقریباً ۹۸-۱۸۹۷ء میں صیغہ تعلیم میں منسلک ہو گئے۔ پہلے وہ نجیب آباد کے مڈل اسکول میں ٹیچر رہے، پھر وہیں بلک ہائی سکول میں فارسی کے اُستاد مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے خلاف آریہ سماج تحریک زوروں پر تھی، شدھی اور سنگھٹن کا ہنگامہ برپا تھا مولانا اکبر شاہ خاں جوشیلے نوجوان تھے، ان کے دل میں مذہب و ملت کا درد تھا۔ ایک آریہ سماجی اپدیشک نجیب آباد میں آدھمکا اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہر فشانی شروع کر دی۔ مولانا

اکبر شاہ خاں کی حمیت ایمانی اور غیرت اسلامی جوش میں آئی۔ انھوں نے آریہ اپدیشک سے ٹکر لی۔ مباحثہ و مناظرہ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ آریہ ایک گرگ باراں دیدہ اور مولانا ایک ناتجربہ کار نوجوان، بات بنتی نظر نہ آئی۔ اتفاق سے اسی دوران میں ان کو اس زیر بحث موضوع پر مرزائے قادیان کی کوئی کتاب ہاتھ لگ گئی، انھوں نے اس کتاب کے مطالب ذہن نشین کر لیے، اس آریہ سماجی کو مباحثہ میں مات دے دی اور اسے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

اگرچہ اس معرکے میں مولانا اکبر شاہ خاں کو کامیابی نصیب ہوئی مگر وہ خود ایک جال میں پھنس گئے۔ اس زمانے میں قادیانی تحریک زوروں پر تھی، ممکن ہے کوئی مبلغ بھی محرک ہوا ہو۔ غرض مولانا اکبر شاہ خاں قادیان پہنچ گئے اور حکیم نورالدین سے متاثر ہو کر اس کے گرویدہ ہو گئے، وہیں ملازمت کر لی۔ اب اکبر شاہ خان نجیب آبادی سے قادیانی ہو گئے ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۴ء تک وہ قادیان میں رہے۔ تقریباً پانچ سال تک مدرسہ تعلیم الاسلام کے بورڈنگ سپرنٹنڈنٹ ہو گئے۔ مولانا اکبر شاہ خاں اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے بعد زیادہ وقت حکیم نورالدین کے درس یا مطب میں گزارتے تھے یا پھر طلبہ کو قرآن کریم کا درس دیتے تھے۔

چونکہ مولانا اکبر شاہ خاں کی وابستگی بڑی حد تک حکیم نورالدین سے تھی لہٰذا حکیم صاحب کے فوت ہو جانے کے بعد ان کا قادیان میں رہنا مشکل ہو گیا اور وہ وہاں کے نظام سے کشیدہ خاطر ہو کر "لاہوری جماعت" سے وابستہ ہو گئے۔ انھوں نے قادیان کے ناخوشگوار ماحول اور مرزا بشیر الدین محمود کے نامناسب رویہ کی شکایت اپنے اکثر خطوں میں مولوی محمد علی ایم۔ اے اور ڈاکٹر بشارت احمد سے کی ہے۔

قادیانی جماعت سے انقطاع کر کے مولانا اکبر شاہ خان نجیب آباد چلے آئے مگر لاہوری جماعت نے ان کو پھر بلا لیا اور وہ وسط ۱۹۱۵ء تک لاہور میں رہے۔ اس دوران میں وہ اشاعت اسلام کالج لاہور میں تاریخ کے استاد اور "پیغام صلح" لاہور کے اڈیٹر رہے۔ بعد ازاں مولانا نجیب آبادی کا تعلق لاہوری جماعت سے بھی ختم ہو گیا۔ اور انھوں

نے اپنے آبائی مذہب اہل سنت کی طرف رجوع کر لیا اور ان لوگوں سے کوئی رابطہ و واسطہ نہ رکھا۔ اور وہ بھی مولانا اکبر شاہ خاں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول گئے۔ اس سلسلے میں مولانا اکبر شاہ خاں کا ایک مختصر سا بیان یکم نومبر ۱۹۲۵ء کو "مدینہ" بجنور میں شائع ہوا ہے جسے یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

"میرے ایک دوست کو حال ہی میں کسی قادیانی صاحب کی صحبت کا موقع ملا۔ وہ قادیانی علم کلام اور قادیانی دلائل سے بہت کچھ متاثر اور قادیانی مخصوص عقائد کو غالباً قبول کر چکے ہیں۔ میرے پاس انھوں نے چند سوالات لکھ کر بھیجے ہیں، جن کی زبان اور لہجے میں تعریضات بھی نشتر زن ہیں۔ میں شاید ان کے نشتر کی نسبت اپنی تلوار کی نوک سے زیادہ سلیقہ سے کام لے سکتا ہوں۔ لیکن اس جراحی اور فصادی سے میرا جی متلاتا ہے صرف نفس مطلب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ان کے پہلے سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ "تو قادیان میں کئی سال تک قادیانی بن کر رہا۔ اب قادیانیت سے کیوں منحرف ہے۔ کیا یہ متلون مزاجی اور رائے کی کمزوری نہیں"۔ اس قسم کا سوال مجھ سے مولانا حکیم اللہ صاحب بجنوری مرحوم نے بھی کیا تھا۔ میں نے اُن کے پاس جواب میں یہ مشہور شعر لکھ کر بھیج دیا تھا۔

زنقص تشنہ لبی داں بہ عقل خویش مناز ‎ ‎ ‎ ‎ دلت فریب گر از جلوہ سراب نخورد

اتفاق سے ۱۹۱۵ء میں آگرہ اور اس کے نواح میں آریوں کی سرگرمیاں تیز ہوگئیں نو مسلم راجپوتوں میں آریوں نے ایک منصوبے کے تحت کام شروع کر دیا۔ ان سرگرمیوں کا حال سن کر مولانا اکبر شاہ خاں کا خون کھول گیا۔ اور انھوں نے چار ماہ کا ایک تبلیغی پروگرام بنایا۔ مولانا نے نجیب آباد، منڈاور، بجنور، نگینہ، مراد آباد، علی گڑھ، شکوہ آباد، مین پوری، فتح گڑھ، فرخ آباد، قنوج، کانپور اور مفصلات کا دورہ کیا۔ حالات کا جائزہ لیا۔ آریوں کا ردّ بلیغ کیا۔ اس وقت کے رسائل صحیفہ (بجنور)، المشیر (مراد آباد) المیزان (علی گڑھ) وغیرہ نے مولانا اکبر شاہ خاں کی ان تبلیغی خدمات کو سراہا اور ان کی تبلیغی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔

جب مولانا اکبر شاہ خاں تبلیغی دوروں سے واپس آئے تو انھوں نے نجیب آباد سے ایک تاریخی ماہ نامہ "عبرت" جنوری ۱۹۱۶ء میں جاری کیا اور مارچ ۱۹۱۷ء تک یہ رسالہ نکلتا رہا۔ اس میں علمی، تحقیقی اور تاریخی مضامین شائع ہوتے تھے۔

۱۹۱۷ء میں مولانا نجیب آبادی پھر لاہور آ گئے اور ۱۹۲۱ء کے وسط تک وہاں ان کا قیام رہا۔ اس مرتبہ وہ دیال سنگھ کالج مسلم ہائی اسکول اور سینیئر لوکل کیمبرج کالج میں اُردو اور فارسی کے اُستاد رہے۔ ہوسٹل کی نگرانی بھی ان کے سپرد تھی۔ ہوسٹل میں وہ نہایت باقاعدگی سے پانچوں وقت باجماعت نماز پڑھتے تھے اور امامت خود کرتے تھے۔ نماز فجر کے بعد نصف گھنٹے قرآن مجید کا اور نماز عشا کے بعد امام غزالی کی احیاءالعلوم کا درس دیتے تھے۔ طلبہ کو ہمیشہ ورزش کی تلقین کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں وہ ایک اخبار "منصور" لاہور کے مدیر بھی رہے۔

ان دنوں مولانا ظفر علی خاں گرفتار ہو گئے۔ انھوں نے اپنے صاحبزادے اختر علیخاں کی معرفت مولانا اکبر شاہ خاں کو پیغام بھیجا:

"میں پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکا ہوں اور اب بھی ایک قیدی کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ آپ دفتر "زمیندار" میں تشریف لے جائیں اور اس کام کو سنبھالیں"۔

یہ پیغام ملتے ہی مولانا اکبر شاہ خاں نے کالج کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور اخبار زمیندار کو سنبھال لیا۔ تقریباً ایک سال تک "زمیندار" سے وابستہ رہے۔ اس زمانہ کے اکثر واقعات پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم (متوفی ۲۲ مارچ ۱۹۷۴ء) نے راقم الحروف کو سنائے، جن سے مولانا نجیب آبادی کی فرض شناسی، احساس ذمہ داری، سادہ معیشت اور چھوٹوں سے شفقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ۱۹۲۱ء کے وسط میں وہ زمیندار کی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو کر نجیب آباد آ گئے اور اپنا رسالہ "عبرت" دوبارہ نومبر ۱۹۲۱ء میں جاری کر دیا جو دسمبر ۱۹۲۲ء تک چلتا رہا۔

مولانا اکبر شاہ خاں کا رسالہ "عبرت" علمی و تحقیقی اعتبار سے بلند پایہ تھا اگرچہ رسالے میں زیادہ تر مضامین خود مولانا اکبر شاہ خاں کے ہوتے تھے مگر اس دور کے نامور اہل قلم

اور دانشور مثلاً مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا اسلم جے راج پوری، آغا رفیق بلند شہری، پروفیسر جمیل الرحمٰن، خلیل الرحمٰن، مولوی ابوالحسن بدایونی، (مولانا یعقوب بخش) راغب بدایونی بھی "عبرت" میں لکھتے تھے۔ کبھی کبھی علامہ اقبال بھی توجہ فرماتے تھے اور اپنا کلام اشاعت کے لیے بھیجتے تھے۔ وہ "عبرت" کو بالالتزام پڑھتے تھے۔ اپنے ایک خط مورخہ ۱۷ مئی ۲۲ء میں لکھتے ہیں :

"عبرت بڑا مفید کام کر رہا ہے۔ مسلمان بیدار ہو رہے ہیں، انشاءاللہ آپ کا پرچہ ضرور چمکے گا۔"

علامہ اقبال ایک اور خط مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۲۲ء میں لکھتے ہیں :

"امیر خاں پر آپ نے خوب مضمون لکھا، خدا تعالیٰ اس کے جانشینوں کو بھی ہدایت دے کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے دست کش ہو جائیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ پر بھی خوب مضمون لکھا گیا ہے، میں نے ان کی زندگی کے تمام واقعات ایک شعر میں جمع کر دیئے ہیں۔

ہمت او کشت ملت را چو ابر ثانی اسلام و غار و بدر و قبر

مولانا نجیب آبادی کے ایک مضمون پر علامہ نے اپنے مکتوب مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۳۵ء میں اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے :

"میں دو سال سے بیمار ہوں۔ بہت کم لکھتا پڑھتا ہوں مگر آج آپ کا مضمون جو اخبار "احسان" میں شائع ہوا ہے، دیکھ کر بے اختیار دل چاہا کہ آپ کو اس مضمون پر مبارکباد لکھوں۔ نہایت عمدہ مضمون ہے۔ مجھ سے بے شمار لوگوں نے اس کی تعریف کی ہے۔ اب آپ کے لیے ایک مضمون لکھنا باقی ہے یعنی مسئلہ جہاد کی تاریخ ہندوستان میں، اس کو صرف آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔"

رسالہ "عبرت" میں کتابوں اور رسالوں پر تبصرے توجہ اور محنت سے لکھے جاتے تھے۔ مولانا نجیب آبادی "عبرت" کا آغاز بالعموم خطبۂ ماثورہ اور دعا کے ساتھ کرتے تھے۔ "عبرت" میں شائع شدہ کئی مضمون اپنی مقبولیت و افادیت کی وجہ سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

عبرت ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا۔ لوگ اس کے مشتاق رہتے تھے، اس زمانے کے رسائل و جرائد نے "عبرت" کا خیر مقدم کیا اور پسندیدہ تبصرے کیے، یہاں تک کہ شنسو دھک کے نام سے "عبرت" کے گجراتی میں ترجمہ کرنے کی تحریک ہوئی مگر افسوس کہ "عبرت" ایک شعلہ مستعجل ثابت ہوا۔

اس زمانے میں شدھی اور سنگھٹن کی سرگرمیاں بہت تیز ہوگئیں۔ مشہور آریہ لیڈر شردھانند کی قید سے رہائی وائسرائے سے ملاقات کے بعد عمل میں آئی اور ہر طرف شدھی کا نرسنگھا بجنے لگا۔ ہندوستان کی فضا مکدر ہوگئی۔ ان حالات کو دیکھ کر مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی بے چین ہو گئے اور آریوں کے توڑ کے لیے میدان عمل میں کود پڑے۔ چھ ماہ مسلسل (جنوری ۱۹۲۳ء تا جون ۱۹۲۳ء) تبلیغی دوروں میں رہے۔ اس مرتبہ ان کے ہمراہ نجیب آباد کے چند ہم خیال رفقا ڈاکٹر عبدالحمید خاں، مولوی محمد اسماعیل خاں اور حافظ عبدالخالق بھی تھے۔ ان لوگوں نے تبلیغ کا کام خوب کیا اور اس کے اچھے نتائج برآمد ہوئے۔ جب مولانا اکبر شاہ خاں تبلیغی دوروں سے واپس آئے تو انھوں نے نجیب آباد میں مستقل قیام رکھا اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے۔ انھوں نے طے کیا کہ مسلمانوں کو ان کے شاندار تاریخی کارناموں اور تاریخ سے روشناس کرایا جائے۔ اس طرح تاریخ سے روشناسی اور آگاہی ان کی بیداری اور تعمیر ملت میں بڑی مددگار ثابت ہوگی۔ اگرچہ اس موقع پر مولانا ظفر علی خاں نے لاہور، مولانا ابوالکلام آزاد نے کلکتہ اور جنرل نادر خاں (والیِ افغانستان) نے کابل بلانا چاہا مگر مولانا اکبر شاہ خاں نے نجیب آباد میں رہ کر تصنیف و تالیف کے کام کو ترجیح دی۔ ان کے بعض احباب نے جن میں سر راس مسعود، علامہ اقبال اور نواب اکبر خاں آف ہوتی شامل تھے، کئی مرتبہ کوشش کی کہ وہ نجیب آباد سے نکل کر لاہور، بھوپال، حیدرآباد یا علی گڑھ آجائیں مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ ایک مرتبہ ریاست حیدرآباد نے بھی اپنے یہاں بلایا لیکن وہ نہیں گئے۔

مولانا اکبر شاہ خاں نے تیرہ چودہ سال جم کر کام کیا اور اُردو زبان کے تاریخی د

علمی سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا جو کام علمی اداروں اور انجمنوں کے کرنے کا تھا وہ مولانا نے تن تنہا کر دکھایا۔ جون ۱۹۴۷ء میں ان کی علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دست اور سوء ہضمی کا عارضہ لاحق ہوا۔ علاج سے کوئی افاقہ نہ ہو۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں وہ تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے جوالا پور گئے مگر بے سُود، وقتِ موعود آچکا تھا۔
۱۰ مئی ۱۹۴۸ء کو عظیم مؤرخ و مصنف مولانا اکبر شاہ خاں نے عالمِ آخرت کی راہ لی۔ نعش جوالا پور سے نجیب آباد لائی گئی اور محلہ ضابطہ گنج کی سرور والی مسجد کے جانبِ غرب تدفین عمل میں آئی۔

مولانا اکبر شاہ خاں کی سپاہیانہ زندگی تھی۔ کھدر کا لباس ہوتا تھا۔ عام طور سے قمیص، شلوار اور شیروانی پہنتے تھے، کبھی کبھی پگڑی بھی باندھتے تھے۔ جہاد کی آرزو اور شوق رہتا تھا۔ مگدر، لاٹھی، تلوار، کمان، تیر، غلیل اور کتابیں ان کی محبوب اشیا تھیں، مولانا کے پاس ایک اچھا کتب خانہ تھا۔

قد لمبا، جسم بھرا ہوا، سر صاف، چوڑی پیشانی، آنکھیں بڑی بڑی، گھنی داڑھی، متین چہرہ، آواز بلند، چال تیز، صبح کو دو میل بھاگتے تھے، لاہور سے جہانگیر کے مقبرے تک پا پیادہ جانا اور واپس آنا ان کا معمول تھا۔ تیر اک بھی بہت اچھے تھے۔ نبوٹ اور گتکے میں اچھی خاصی مہارت تھی۔ کبھی کبھی شوق میں اسکول کے میدان میں خود اپنے ہاتھ سے اس فن کے کرتب دکھاتے تھے۔ مولانا کو موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ مکان کچا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے مکان کی دیوار اونچی کرنے کو کہا تو مولانا نے فرمایا کہ مسلمان کی حفاظت خدا کرتا ہے۔

مولانا اکبر شاہ خاں کی سادہ زندگی کا یہ انداز تھا کہ جب امام شاہ لعل شاہ ایڈیٹر شمشسو دھاک (گجراتی) نے مولانا سے سوانح عمری لکھنے کی درخواست کی تو انھوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں جواب دیا۔

"مکمل سوانح عمری یہ ہے کہ مشتِ خاک یا قطرۂ ناپاک سے پیدا ہوا ہوں۔ مرنے کے بعد گل سڑ کر کھاد، کیڑوں کی غذا، خاک کے ذرات، ہوا کا غبار بننے والا ہوں۔

اب تک زندگی کا اکثر حصہ غفلت میں گزرا۔ بقیہ ایام کی نسبت کچھ نہیں جانتا۔ خاتمہ کے بخیر ہونے کی آرزو رکھتا ہوں۔ اپنے گناہوں کو دیکھتا ہوں تو ڈرتا ہوں۔ خداتعالےٰ کے رحم و فضل و کرم و مغفرت و ستاری پر نظر کرتا ہوں، تو اُمید و حسرت سے لبریز ہوکر بہشت بریں کو اپنی جاگیر یقین کرتا ہوں، اگر خدانخواستہ مجھ کو میری غفلتوں اور گناہوں کی سزا دی گئی تو چوپائے اور حشرات الارض مجھ سے اچھے ہیں لیکن اگر مجھ سے عفو و عطا کا سلوک ہوا اور جنّت مل گئی تو میں دنیا کے ہزار ہا بادشاہوں سے زیادہ ذی عزت اور بلند مرتبہ ہوں۔ میرے مورث اعلیٰ کا نام آدم تھا، جس کو فرشتے سجدہ کرتے تھے اور میرے روحانی باپ کا نام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے جو خیر البشر، سید الرسل، خاتم النبیین رحمۃ اللعالمین ہیں، باقی اس سے زیادہ تفصیل کے لیے گزارش ہے کہ:

اے روزگار دیدہ گزر از جون و چند ما ہیچم و ہیچ را نخرد ہیچ کس بہ ہیچ

اب ہم مولانا اکبر شاہ خاں کے تصنیفی و تالیفی کام کا جائزہ لیتے ہیں:

۱۔ **تاریخ نجیب آباد**: ۱۹۰۱ء میں ایک مختصر سی کتاب نجیب آباد، نواب نجیب الدولہ اور ان کی اولاد کے حال میں لکھی۔ یہ مولانا نجیب آبادی کی پہلی تالیف ہے اور گوہر ہند پریس نجیب آباد سے شائع ہوئی۔ اس مضمون کو مولانا نے نظر ثانی کے بعد "عبرت" کی چار اشاعتوں فروری ۱۹۱۶ء تا مئی ۱۹۱۶ء میں دوبارہ شائع کیا۔

۲۔ **ورزش جسمانی**: ورزش جسمانی کے موضوع پر انھوں نے یہ کتاب دلچسپ انداز میں لکھی ہے۔ اس میں بعض ورزشوں کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ اور ہلالی اسٹیم پریس ساڈھورہ سے ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی۔

۳۔ **مرقاۃ الیقین فی حیاۃ نور الدین**: حکیم نور الدین نے اپنے حالات مولانا نجیب آبادی کو خود املا کرائے، ان کی ترتیب و تہذیب کے بعد یہ کتاب پہلی مرتبہ میگزین پریس قادیان سے ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی۔ بعد کو لاہوری پارٹی شائع کرتی رہی۔

۴۔ **اُردو زبان دانی**: اُردو زبان دانی کے نام سے ایک مختصر سا رسالہ لکھا۔ جس میں اُردو زبان کے قواعد بھی ہیں۔ یہ کتاب طلبہ کی نصابی ضرورت سے تالیف کی

حمیدیہ اسٹیم پریس لاہور سے اپریل ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔

۵۔ **اکابرِ قوم** : اس چھوٹے سے رسالے میں انھوں نے علماء امراء اور فقراء کے پوست کندہ حالات بیان کیے ہیں، پیرایۂ بیان دلچسپ ہے۔ یہ رسالہ صوفی اینڈ کمپنی پنڈی بہاءالدین سے کئی مرتبہ شائع ہوا۔

۶۔ **مذہب اور تلوار** : مولوی محمد علی ایم۔ اے کی تحریک پر یہ کتاب تالیف کی۔ انھوں نے تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا کہ اسلام کی اشاعت تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اسلام کی سیدھی سادی تعلیم کا یہ اعجاز تھا کہ اسلام دنیا میں پھیلا۔ محمد علی نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کرکے گاندھی جی کو پیش کیا۔ فروری ۱۹۱۹ء میں پنڈی بہاءالدین سے یہ کتاب شائع ہوئی۔

۷۔ **غنی کشمیری** : محمد طاہر غنی کشمیری کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر ایک مختصر سی کتاب لکھی جسے فوق کشمیری نے رجب ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۹ء میں جارج اسٹیم پریس لاہور میں طبع کراکے شائع کیا۔

۸۔ **سپاہیانہ زندگی** : مولانا نجیب آبادی ایک سپاہی قبیلے کے فرد تھے، بہادری و جانبازی ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ انھوں نے اپریل ۱۹۲۳ء میں ایک تبلیغی سفر کے دوران یہ کتاب لکھی۔

۹۔ **تاریخ اسلام** (تین حصّے) : تاریخ اسلام کی تالیف مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ انھوں نے نہایت محنت اور تحقیق سے تاریخ اسلام تین حصّوں میں لکھی۔ پہلے حصّے میں عہدِ جاہلیت سے لے کر خلافتِ راشدہ تک کا بیان ہے۔ دوسرا حصہ عہدِ بنو امیہ اور بنو عباس پر مشتمل ہے، اس میں مسلمانوں کے عہدِ کشور کشائی، تمدن آفرینی اور قیادتِ علمی کے عروج کی مکمل داستان بیان کی ہے۔ تیسرے حصّے میں اندلس، مراکش، افریقہ، مصر، ایران، شام وغیرہ کی اسلامی سلطنتوں کے حالات شرح و بسط سے بیان ہوئے ہیں، اس میں بنو امیہ (اندلس)، دولتِ صفاریہ، سلجوقیہ، عثمانیہ، مغولانِ چنگیز اور خوارزم شاہیہ کا تذکرہ بھی تفصیل سے ملتا ہے۔ یہ کتاب محرم ۱۳۴۳ھ میں مکمل ہوئی۔ "تاریخِ اسلام" تاریخی نام ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن پنڈی بہاءالدین سے

شائع ہوا۔ اب نفیس اکیڈیمی کراچی نے اہتمام سے شائع کیا ہے۔

۱۰۔ حجتہ الاسلام : اس کتاب میں اسلام کی بنیادی تعلیم بیان کی گئی ہے اور تبلیغ اسلام کے بہترین طریقے بتائے گئے ہیں۔ یہ کتاب خاصی مقبول ہوئی "حجتہ الاسلام" پڑھ کر علامہ اقبال نے سو روپیہ مولانا نجیب آبادی کو بھیجے کہ حجتہ الاسلام کے نسخے مستحق لوگوں کی خدمت میں بلاقیمت بھیجے جائیں۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔

۱۱۔ آئینہ حقیقت نما : یہ کتاب تاریخی حقیقت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مسلمان بادشاہوں پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ اس کتاب میں ان کے محققانہ و مجتہدانہ جواب دیے گئے ہیں۔ محمد تغلق کے دور پر نہایت وضاحت و صراحت سے لکھا گیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۲۸ - ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں نفیس اکیڈیمی کراچی نے دوبارہ شائع کیا۔ ڈاکٹر سید محمود (بہار) نے جیل میں اس کتاب کے کچھ حصے کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر نے یہ کتاب تحفتہً گاندھی جی کو پیش کی تھی۔ خواجہ حسن نظامی نے اسے پڑھنے کے بعد فرمایا کہ اگر میں صاحب استطاعت ہوتا تو مولانا اکبر شاہ خاں کو موتیوں میں تول دیتا۔

۱۲۔ پردہ پر ایک نظر : یہ رسالہ انھوں نے اس وقت لکھا تھا جب امیر امان اللہ خاں یورپ کی سیاحت کر کے افغانستان آئے تھے اور اخباروں میں پردہ کے متعلق بکثرت مضامین لکھے جا رہے تھے۔

۱۳۔ خان جہاں لودھی : اس کتاب میں فاضل مؤلف نے عہدِ جہانگیری کے بہادر سپہ سالار خان جہاں لودھی کی زندگی کے حالات دلچسپ اور بصیرت افروز انداز میں لکھے ہیں۔

۱۴۔ خواص خاں ولی : شیر شاہ سوری کے مشہور سپہ سالار خواص خاں ولی کے حالات محنت اور تحقیق سے لکھے ہیں۔ یہ رسالہ جنوری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا۔

۱۵۔ قولِ حق : اس کتاب میں ملتِ اسلامیہ کے زوال کی مجمل تاریخ بیان کی گئی ہے۔

کہ کن کن فرقوں نے ملتِ اسلامیہ کی بیخ کنی میں کیا کیا کردار ادا کیا ہے، اور مسلمانوں کی قائم شدہ سلطنتوں اور حکومتوں کو مٹانے میں مجوسیوں اور عجمیوں نے کیا کیا ہتھکنڈے استعمال کیے ہیں۔ قولِ حق کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۹ء میں نجیب آباد سے اور ۱۹۴۹ء میں دوسرا ایڈیشن نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن حافظ حمید محمد اکیڈمی کراچی کی طرف سے راقم الحروف کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

۱۶۔ جنگِ انگورہ : اس کتاب میں تیمور اور سلطان بایزید یلدرم کی مشہور جنگِ عظیم کا نقشہ کھینچا ہے۔ ایشیائے کوچک اور متصلہ ممالک کا جغرافیہ، تیمور اور اس کے خاندان کے حالات، بایزید یلدرم اور خاندانِ عثمانیہ کی ابتدائی تاریخ، سلاجقہ روم کے حالات اور سلطنتِ عثمانیہ کے سامنے یورپ کے حکمرانوں کے بے حیثیت ہونے کا حال بیان کیا گیا ہے۔ پہلے یہ مضمون عبرت میں لکھا گیا، بعد ازاں ۱۹۲۱ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

۱۷۔ نواب امیر خاں : ریاست ٹونک کے بانی نواب امیر خاں کے حالات اختصار سے قلم بند کیے ہیں۔ پہلے یہ مضمون ماہنامہ "عبرت" میں نکلا تھا۔ پھر اپریل ۱۹۲۱ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

۱۸۔ مسلمانانِ اندلس : اس مختصر سی کتاب میں اندلس میں مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی جھلک دکھائی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۔ باطل شکن : ایک پادری نے تاویل القرآن کے نام سے ایک کتاب لکھ کر مسلمانوں میں تقسیم کی اور اُن کو ورغلایا۔ مولانا نجیب آبادی نے اس کتاب کا مسکت جواب باطل شکن کے نام سے لکھا۔ یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔

۲۰۔ مقدمہ تاریخ ہند قدیم : یہ کتاب علمِ تاریخ پر پُر مغز مقدمہ ہے، اس میں ہندوستان کے عہدِ قدیم کی تاریخ کے علمی اصول اور آریہ قوم کی تحقیق پر عالمانہ اور محققانہ بحثیں ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی۔

۲۱۔ معیار العلماء : اس کتاب میں بتایا ہے کہ علمائے سُو اور پیشہ ور پیروں سے

سے اسلام اور ملت اسلامیہ کو کس قدر نقصان پہنچا ہے۔ یہ کتاب دسمبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔

۲۲۔ نظام سلطنت : یہ نہایت اہم تصنیف ہے، اس میں ناقابل انکار دلیلوں اور تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ دنیا کے تمام حکومتی نظام انسان کو حقیقی امن و راحت اور عدل و مساوات دینے میں ناکام ہو چکے ہیں۔ یہ برکات صرف اسلامی نظام ہی دے سکتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔

۲۳۔ اسلام اور اچھوت اقوام : ہندو معاشرے میں اچھوتوں کی حالت جانوروں سے بدتر رہی ہے۔ مولانا نجیب آبادی نے اس رسالے میں بتایا ہے کہ اسلام میں ان کا مستقبل کتنا درخشاں ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی۔

۲۴۔ فصل الخطاب : مولانا اکبر شاہ خاں کچھ دنوں خاکسار تحریک سے وابستہ رہے لیکن جب خاکسار لیڈر عنایت اللہ مشرقی کے افکار و احوال اور اندرونی نظام سے واقف ہوئے تو انھوں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور مشرقی کی کتاب "قول فیصل" کا جواب "فصل الخطاب" کے نام سے لکھا۔ یہ کتاب مئی ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔

۲۵۔ حج بیت اللہ : ترغیب حج کی غرض سے یہ رسالہ لکھا گیا ہے تاکہ وہ لوگ جو حج کی استطاعت کے باوجود اس فریضہ سے محروم رہتے ہیں، حج کی سعادت حاصل کر سکیں۔ مدینہ پریس بجنور میں یہ رسالہ طبع ہوا۔

۲۶۔ گائے اور اس کی تاریخی عظمت : گائے ہندوستان میں ایک مابہ النزاع مسئلہ رہی ہے، اس کے نام پر مذہبی و سیاسی ہنگامے ہوئے ہیں۔ مولانا نجیب آبادی نے "عبرت" میں ایک مضمون لکھا اور تاریخ کی روشنی میں اس مسئلے کا تجزیہ کیا۔ بعد ازاں یہ مضمون کتابی صورت میں شائع ہوا۔

۲۷۔ وید اور اس کی قدامت : مولانا نجیب آبادی نے اس موضوع پر ایک تاریخی مضمون "عبرت" میں کئی قسطوں میں لکھا تھا جو بعد کو کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے وید کی قدامت پر محققانہ تبصرہ کیا ہے اور ویدوں کی قدامت کا راز

علمی دلائل کی روشنی میں منکشف کر کے دکھایا ہے۔ یہ کتاب یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ میں چھپی ہے۔

۲۸۔ ہندو مسلمانوں کا اتفاق : اس عنوان سے مولانا نجیب آبادی نے ایک مفصل مضمون پیغام صلح (لاہور) میں کئی قسطوں میں لکھا تھا۔ اپریل ۱۹۱۶ء کے عبرت میں ایک اعلان چھپا کہ یہ مضمون نظر ثانی و اضافہ کے بعد کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ اعلان عملی صورت اختیار نہ کر سکا۔

۲۹۔ مسلمانانِ ہند کی تعلیم و ترقی : آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (علیگڑھ) کے آنریری سیکرٹری نے مسلمانانِ ہند کی تعلیم و ترقی کے بارے میں ایک سوال نامہ شائع کیا تھا۔ مولانا نجیب آبادی نے اس کے جواب ایک رسالے کی صورت میں لکھے۔

مولانا اکبر شاہ خاں نے چند رسالے بعض مصالح کے تحت اپنے اعزہ کے نام شائع کیے ہیں۔ اگرچہ وہ رسالے تمام تر مولانا کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔

۱۔ احقاقِ حق (گاندھی جی کی سوانح عمری "تلاشِ حق" پر تبصرہ)

۲۔ تاریخ مرہٹہ

۳۔ لا الٰہ الا اللہ۔ محمد ادریس خاں کے نام سے اور

۴۔ اورنگ زیب عالمگیر دوسروں کی نظر میں" محمد ایوب خاں کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی تصنیفات سے اُردو زبان میں قابلِ قدر اضافہ ہوا، علامہ اقبال نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۳ اپریل ۱۹۳۵ء میں "نظامِ سلطنت" کی رسید دیتے ہوئے مولانا نجیب آبادی کی تصانیف پر مندرجہ ذیل مختصر مگر جامع تبصرہ فرمایا ہے :

"بڑی مدت کے بعد آپ کی خیریت معلوم ہوئی اور کتاب بھی ملی۔ بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں ایک سال سے صاحبِ فراش ہوں۔ تمام مشاغل ترک ہیں تاہم آپ کی کتاب کی ورق گردانی کی اور اسے مفید پایا۔ آپ کی تصانیف اُردو لٹریچر میں قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اس سے تمام پڑھنے والوں کے نقطۂ نگاہ میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور یہی اس ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔"

احسن مارہروی

احسن مارہروی، نامور شاعر، انشا پرداز، ادیب اور داغ دہلوی کے تلامذہ میں نمایاں امتیازی خصوصیت کے مالک تھے یہاں تک کہ اُستاد نے خود ایک موقع پر ان کے متعلق فرمایا:

سید احسن جو میرے دوست بھی شاگرد بھی ہیں
جن کو اللہ نے دی فکرِ رسا طبعِ رسا،

احسن مارہروی کا تعلق سادات بلگرام سے تھا، اس بلگرامی خانوادہ عالیہ کے ایک بزرگ میر عبد الجلیل (۱۰۵۷ھ / ۱۶۴۷ء) جذب و کیف کے عالم میں بلگرام سے مارہرہ (ضلع ایٹہ یو پی) میں آکر قیام پذیر ہو گئے تھے، ان ہی میر صاحب کے پوتے شاہ برکت اللہ عشقی (۱۱۴۲ھ / ۱۷۲۹ء) تھے، جو صاحب حال صوفی، عارف کامل اور ظاہری و باطنی علوم سے آراستہ تھے۔ عربی و فارسی کے علاوہ سنسکرت اور بھاشا میں بھی درک رکھتے تھے، فارسی میں عشقی اور بھاشا میں پیمی تخلص فرماتے تھے، ان کے افکارِ عالیہ فارسی میں دیوانِ عشقی اور بھاشا میں پیم پرکاش کے نام سے طبع و شائع ہو چکے ہیں۔ شاہ برکت اللہ بلگرام کی سکونت ترک کر کے مستقل طور سے مارہرہ میں سکونت پذیر ہوئے اور ان کا خاندان یہاں خوب پھولا پھلا۔

شاہ برکت اللہ کے دو صاحبزادے آل محمد (۱۱۶۴ھ / ۱۷۵۲ء) اور نجات اللہ (۱۱۹۰ھ / ۱۷۷۶ء) تھے ان دونوں بھائیوں نے مارہرہ میں دو خانقاہیں قائم کیں بڑے بھائی آل محمد کی خانقاہ سرکار کلاں اور چھوٹے بھائی نجات اللہ کی خانقاہ "سرکار خورد" کہلائی۔ احسن مارہروی شاہ نجات اللہ کی اولاد میں تھے، اپنے والد شاہ مجتبیٰ حسن کے انتقال (۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۳ء) کے بعد

صاحب سجادہ مقرر ہوئے، مگر انہوں نے "دلق و سجادگی" کی بجائے مجلس شعر و ادب کو رونق بخشی۔

احسن مارہروی ۲۳ر شوال ۱۲۹۳ھ (۱۰ نومبر ۱۸۷۶ء) کو مارہرہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم و تربیت حسب رواج خانقاہ کے مکتب سے شروع ہوئی، اس کے بعد عربی و فارسی کا آغاز ہوا۔ احسن مارہروی کو زمانے کے جدید رجحانات اور مغربی تعلیم کا شروع ہی سے خیال تھا۔ لہذا انہوں نے خاندانی ماحول کے خلاف انگریزی تعلیم میں دلچسپی لینی شروع کردی اور مارہرہ کے انگریزی اسکول میں پڑھنے لگے مگر ان کے والد ماجد نے سخت برہمی کا اظہار فرمایا اور یہ سلسلہ منقطع ہوا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

میرے اس شوقِ تعلیم پر بہت برہم ہوئے — اور بالتصریح ارشادات یہ پیہم ہوئے
تجھکو انگریزی نہ پڑھنے دیں گے ہم اور دیا — مار ڈالیں گے جواب اُٹھی ادھر تیری نگاہ
ہے غضب جس گھر میں ورد مغنی و فشنم ہے — اس میں انگریزی کی یہ گٹ پٹ رہے ہم چپ رہو
سیکھنا ہے ان کا فن جو بولتے ہیں ڈیم فول — تجھکو نامعقول پڑھنا چاہیئے قال اقول
مجھکو ان احکام کی تعمیل کرتے ہی بنی — زندہ رہ کر عالم فانی میں مرتے ہی بنی

اگرچہ احسن مارہروی خود انگریزی تعلیم حاصل نہ کر سکے مگر انہوں نے اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ احسن مارہروی فکر و نظر کے اعتبار سے جدید رجحانات سے متاثر ہوئے اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی نظر میں وسعت و بالیدگی پیدا ہوئی، شعر و ادب کے معاملہ میں وہ قدیم اسکول کے نمائندے تھے، مگر جدید افکار و خیالات ایک حد تک انگیز کرتے تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنے رسالہ فصیح الملک میں تفصیل سے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔

احسن مارہروی کا خاندان علم و فضل کی روایات کا حامل تھا۔ خاندان میں شعر و شاعری کا عام رواج تھا۔ وفات و پیدائش کے موقعوں پر قطعات تاریخ اور عرسوں کے زمانے میں بزرگوں کی منقبت کا خوب پرچار تھا۔ احسن مارہروی کا اس ماحول سے متاثر ہونا ضروری تھا۔ اور پھر طبیعت میں شعر و سخن کا فطری شوق تھا۔ لہذا شعر و شاعری کا سلسلہ

شروع ہونا ضروری تھا۔ ۱۸۹۲ء میں احسن مارہروی خط و کتابت کے ذریعے داغ دہلوی کے سلسلہ تلامذہ میں باقاعدہ منسلک ہو گئے اور شعر و شاعری کا مشغلہ مستقل طور سے داخلِ زندگی ہو گیا جو آخر وقت تک برقرار رہا۔

احسن مارہروی کو اپنے اُستاد حضرت داغ سے اتنا تعلق خاطر ہوا کہ وہ ۱۸۹۸ء میں ان کے پاس حیدر آباد دکن پہنچے اور اُستاد کی صحبت میں کئی سال مسلسل رہ کر تربیت حاصل کی، اُستاد کی صحبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، شعر و شاعری کے فن اور نکات کو اُستاد کی خدمت میں رہ کر ۵ - ۶ سال تک باقاعدہ حاصل کیا، اس زمانے میں حضرت داغ کے دیگر تلامذہ کے کلام کی اصلاح کا کام بھی احسن مارہروی ہی انجام دیتے تھے اور اُستاد کو اپنے شاگردِ رشید پر بڑا اعتماد تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد احسن مارہروی بعض خانگی ضروریات اور وہاں کی اُمیدواریوں سے گھبرا کر اپنے وطن چلے آئے۔

احسن مارہروی ایک مشہور و معروف خانوادہ سادات کے رکن اور ایک گدّی کے سجادہ نشین تھے، جس میں پیری مریدی کا سلسلہ ... ایہا سال سے رائج تھا جس کی عظمت و شہرت دُور و نزدیک پھیلی ہوئی تھی، اگر وہ پیری مریدی کا نفع بخش کام شروع کر دیتے تو "ہم خرما و ہم ثواب" کے مصداق " دارین کی فلاح تھی، شہرت و ناموری اور دولت و حشمت قدم چومتی، مگر اس مردِ درویش نے اس زندگی کو اختیار نہیں کیا، اردو زبان و ادب کی خدمت کو اپنا مقصدِ حیات ٹھہرایا اور عمر بھر اس مقصد کے حصول میں کوشاں رہے۔

اتفاق کی بات ہے کہ اس زمانہ میں اردو زبان کو دو ایسے مخلص اور بے لوث خدمت گزار ملے کہ جنہوں نے اپنے شاندار مستقبل کو خیرباد کہہ کر اردو کی خدمت کو اپنا سرمایۂ حیات سمجھا اور عملی طور سے اس کو ثابت کر دکھایا، پہلے تو یہی احسن مارہروی ہیں اور دُوسرے مولانا حسرت موہانی ہیں کہ علی گڑھ کے گریجویٹ ہونے کے بعد ان کا مستقبل روشن تھا، مگر اس مردِ درویش نے بھی زبان و ادب کی خدمت اور طوق و سلاسل کو لبیک کہا اور ملک و قوم کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔

شاعر و انشا پرداز کی حیثیت سے احسن مارہروی اردو میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام قدیم رنگِ تغزل کا آئینہ دار ہوتا ہے، اور الفاظ کی بندش اور چستی اس کی جان ہوتی ہے، ان کے کلام میں پختگی کے ساتھ متانت اور سنجیدگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے، وہ اردو زبان کے صحیح معنوں میں ادیب و محقق تھے، انہوں نے ولی دکھنی کے کلام پر مقدمہ اور نمونہ منثورات اردو وغیرہ پیش کر کے اپنی تحقیق کا لوہا منوایا۔ تحقیق و تجسس ان کی فطرت تھی، ایک ایک لفظ و محاورہ کی تصحیح و تحقیق میں کئی کئی دن اور ہفتے گذار دیتے تھے۔ حوالہ جات اور لغات کی ورق گردانی ان کا دلچسپ اور محبوب مشغلہ ہوتا تھا علم عروض و بیان میں ان کو کامل دستگاہ حاصل تھی بعض تحقیقی اور فنی مسائل میں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب تک ان سے رجوع کرتے تھے اور ان کی رائے کا احترام کرتے تھے۔

۱۹۱۲ء میں احسن مارہروی کا تعلق مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے ہو گیا۔ پہلے انٹرمیڈیٹ کالج میں پھر یونیورسٹی میں اردو کے اُستاد رہے، انہوں نے اپنے علم و فضل اور سیرت و کردار کی وجہ سے یہاں ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا۔ اساتذہ ان کا احترام کرتے اور طلبہ ان کی راہ میں آنکھیں بچھاتے تھے وہ طلبہ میں علم و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرتے تھے۔ جب اِن سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو اس پر عالمانہ گفتگو فرماتے تھے گویا کہ اس مسئلہ کے تمام پہلو مستحضر ہیں اور اگر کسی مسئلہ میں تردد ہوتا تو اس کی تحقیق کرتے اور پھر نتیجہ تحقیق کو پیش کرتے۔

احسن مارہروی قدیم تہذیب و معاشرت کے نمائندہ تھے مرنجان مرنج زندگی گذارتے تھے، قدامت کی جھلک ان کے لباس، مزاج، طرزِ معاشرت اور فکر و خیال سے صاف جھلکتی تھی، بزرگوں کی تعظیم، چھوٹوں سے محبت، عفو و درگزر ان کا مزاج تھا، آزادیٔ رائے و فکر ان کا شعار تھا۔ کسی کی بیجا ضد اور تکبر کو انگیز نہیں کر سکتے تھے غرض احسن مارہروی پرانے بزرگوں کی یادگار تھے۔ مشاعروں سے ان کو بہت دلچسپی تھی۔ خود مشاعرے منعقد کرتے اور دُور دُور مشاعروں میں شریک ہوتے سفر و حضر کی،

پریشانیوں کو خوشی خوشی برداشت کرتے۔

احسن مارہروی کی طبیعت میں تحقیق و تلاش کا ذوق فطری تھا، لکھنا پڑھنا اور شعر و شاعری ان کا دن رات کا مشغلہ تھا، وہ ایک اچھے کتب خانہ کے مالک تھے، ان کے پاس ہدیۃً کتابیں آتیں اور خود بھی کتابیں خریدتے تھے۔ ان کا تمام کتب خانہ ان کے ورثاء نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری کو دے دیا ہے، اور طالبانِ علم اس ذخیرہ علم سے مستفیض ہوتے ہیں۔ احسن مارہروی کا حلقۂ احباب و تعلقات بہت وسیع تھا ملک کے نامورانِ علم و ادب سے ان کے خاصے تعلقات تھے۔ نیازمندی اور عجز و انکسار ان کا طریقہ تھا۔ مگر فراعنہ غرور و تکبّر و نخوت کے لیے ضربِ کلیم تھے۔ احسن مارہروی حافظِ قرآن اور حاجی حرمین شریف تھے۔

۱۹۳۸ء میں احسن مارہروی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمت سے سبکدوش ہوکر اپنے وطن مالوف مارہرہ چلے گئے، اس گوشہ نشینی میں بھی خدمتِ علم و ادب ان کا مشغلہ رہا۔ جولائی ۱۹۴۰ء میں کل ہند اردو کانفرس کے سلسلہ میں بریلی تشریف لے گئے وہاں ان کی پیٹھ پر چند پھنسیاں نکل آئیں۔ ایک پھنسی نے کاربنکل کی شکل اختیار کرلی، علاج کیا گیا، مگر کوئی افاقہ نہ ہوا، ان کے ایک صاحبزادے انعام احسن اس زمانہ میں پٹنہ میں تھے، چنانچہ احسن مارہروی علاج کے لئے پٹنہ گئے، وہاں بھی کچھ فائدہ نہ ہوا۔ ۳۰ر اگست ۱۹۴۰ء کو وقتِ موعود آپہنچا اور انہوں نے دار فانی سے عالم جاودانی کی راہ لی۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

میّت مارہرہ لائی گئی اور اپنے بزرگوں کے جوار میں خانقاہ برکاتیہ میں دفن ہوئے۔ اب ہم احسن مارہروی کے علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ لیتے ہیں۔

ریاض سخن و ریاض خلیل

احسن مارہروی نے ۱۸۹۵ء میں ایک ماہوار گلدستہ "ریاض سخن کے نام سے جاری

کیا۔ اسکی مقبولیت اور کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ میر محبوب علی خاں نظام دکن اور نواب ٹونک حافظ محمد ابراہیم خاں کی بارگاہ میں پذیرائی کا شرف حاصل ہوا۔ آخر الذکر نے اس کو اپنے تخلص کی رعایت سے "ریاض خلیل" کا نام دے دیا۔

جلوۂ داغ

مولانا احسن مارہروی کا قیام حیدر آباد دکن میں اپنے اُستاد داغ کے پاس کم و بیش پانچ چھ سال رہا، اس دوران انہوں نے کئی کام کئے، اپنے اُستاد داغ مرحوم کی سوانحعمری "جلوۂ داغ" کے نام سے مرتب کر کے شائع کی، اس سلسلے میں ان پر بعض تنقیدیں بھی ہوئیں۔

فصیح اللغات

حیدر آباد دکن کے دوران قیام ہی میں "فصیح اللغات" کا کام شروع ہوا، اس سلسلہ میں احسن صاحب نے اُستاد داغ سے سینکڑوں ایسے اشعار بطور ضرورت کہلوائے جن میں بعض مستعملہ محاورات کو خاص طور سے نظم کیا گیا تھا۔ "فصیح اللغات" رسالہ فصیح الملک میں ردیف الف تک بالاقساط شائع ہوتی رہی مگر افسوس کہ یہ اہم اور ضروری کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

تذکرہ خمخانہ جاوید کی تسوید

۱۹۰۱ء میں احسن مارہروی نے لاہور کا سفر اختیار کیا اور وہاں ان کا قیام برس ڈیڑھ برس رہا۔ لالہ سری رام کے شہرۂ آفاق تذکرہ خمخانہ جاوید (جلد اوّل) کی تسوید کے فرائض انجام دیئے۔

فصیح الملک

اسی زمانہ میں احسن مارہروی نے اپنے اُستاد حضرت داغ دہلوی کی یادگار میں ایک

ماہوار رسالہ فصیح الملک جاری کیا جو حالات کی ناموافقت اور گوناگوں مصروفیات کے باوجود ۱۹۱۰ء تک جاری رہا، اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا، اس رسالہ میں فصیح اللغات بالاقساط شائع ہوتی رہی، اس رسالہ کے ذریعہ احسن مارہروی نے ٹھوس ادبی خدمات انجام دیں۔

یادگارِ داغ

احسن مارہروی نے اپنے اُستاد داغ کا چوتھا دیوان یادگارِ داغ کے نام سے مرتب و شائع کیا۔

کلیاتِ ولی

انجمن ترقی اردو کی تحریک پر احسن مارہروی نے اردو کے قدیم شاعر "ولی دکنی" کا دیوان مرتب کیا، اس پر ایک مبسوط اور تحقیقی مقدمہ لکھا۔ اس مقدمہ سے احسن مارہروی کی دقت نظر اصابت رائے فطری ذوقِ شاعری اور تحقیق و محنت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

شاہکارِ عثمانی

نظام دکن میر عثمان علی خاں کی دو فارسی نثری تحریرات کو احسن مارہروی نے اردو میں منظوم کیا اور شاہکار عثمانی نام رکھا، نظام دکن نے اس پر تحریری طور سے اظہار خوشنودی فرمایا۔

قوم کا مطالبہ اور علی گڑھ کالج کی فریاد

۱۹۲۰ء میں جب ترک موالات کی تحریک زوروں پر تھی تو گاندھی جی اپنے متبعین کے ہمراہ علی گڑھ آئے، کالج کو نقصان پہنچنے کا سخت اندیشہ پیدا ہوگیا، احسن مارہروی کالج کے فرزند نہ ہونے کے باوجود اس قومی ادارے کی محبت میں بے قرار ہوگئے اور اس کی مدافعت میں چند نظمیں "قوم کا مطالبہ" اور "علی گڑھ کالج کی فریاد" لکھیں جو ہزاروں کی تعداد میں طبع ہوکر تقسیم ہوئیں۔

تاریخ نثر اُردو یا نمونہ منثورات اُردو

مولانا احسنؔ مارہروی کا یہ عظیم الشان تحقیقی کارنامہ ہے اور اس موضوع پر نہایت جامع اور مفصل کتاب ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اس کی تالیف میں بہت مشقت اٹھائی ہے، انہوں نے اس کتاب میں پچھلے چھ صدی کے اُردو نثری سرمایہ کے نمونے پیش کئے ہیں۔ فرامین، مراسلات اور دوسرے کاغذات کے اقتباسات فراہم کرکے اس کو مکمل کرنے کی کوشش کی ہے اور ادب کی تاریخ میں احسنؔ مارہروی کا یہ قابلِ یادگار کارنامہ ہے

تخمیس

محسنؔ کاکوروی کی ایک نظم "تخمیس" پر احسنؔ مارہروی نے مقدمہ لکھا ہے۔ یہ نظم احسنؔ مارہروی کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی۔

کارنامۂ غم

احسنؔ مارہروی کے کلام کا مجموعہ ہے، جس کے پہلے حصہ میں ۳۶ رباعیاں اور دوسرے میں سلام اور تیسرے میں متعدد خمسے اور تضمینیں ہیں اور آخر میں خدمتِ مخلوق کے عنوان سے ایک نظم شامل ہے۔

منتخب داغ

احسنؔ مارہروی نے ۱۹۳۸ء میں انتخاب کلام داغؔ مرتب کیا۔ اس کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ اس میں فارسی عطف اور اضافت نہیں ہے اور دوسرے حصے میں جو انتخاب دیا گیا ہے، اس میں فارسی عطف اور اضافت موجود ہے کتاب کے شروع میں ایک مقدمہ شامل کیا گیا ہے جس میں داغؔ کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب احسنؔ مارہروی کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے سعید احسن

مارہروی نے شائع کی ہے۔

انشائے داغ

داغ دہلوی کے مکاتیب کا مجموعہ انشائے داغ کے تاریخی نام سے ۱۳۵۸ھ/۱۹۴۰ء میں مرتب کیا۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن مولانا احسن مارہروی کے فرزند رفیق احمد مارہروی نے زبانِ داغ کے نام سے شائع کیا۔

بزمِ داغ

داغ دہلوی کے کچھ فرمودات جو احسن مارہروی اور مولوی افتخار عالم نے مرتب کئے تھے ۱۹۵۶ء میں مولانا کے صاحبزادے رفیق احمد نے لکھنؤ سے شائع کر دیئے ہیں۔

احسن الادب

احسن مارہروی نے کالج کے طلبہ کے لئے نظم و نثر کے کئی انتخابات مرتب کئے تھے۔ ان ہی میں سے احسن الادب ہے، یہ انتخاب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے انٹرمیڈیٹ کے لیے تیار کیا گیا تھا، اس میں احسن مارہروی نے عمدہ اور معیاری کلام کا انتخاب کیا حواشی میں جابجا مشکل الفاظ، محاورات اور تلمیحات کی تشریح و تفصیل بھی دے دی ہے، ہر غزل اور نظم کی بحر اور وزن بھی بتا دیا ہے اور شاعروں کے مختصر سوانح بھی شامل کر دیئے ہیں۔

مولانا احسن مارہروی سے اصلاح سخن، اردو لشکر اور کسوف الشمسین بھی یادگار ہیں۔ مولانا احسن مارہروی کا مجموعۂ کلام کراچی سے "احسن الکلام" کے نام سے ۱۹۶۵ء میں طبع ہوا۔ مولانا احسن مارہروی نے سر سید احمد خاں کے تاریخ انتقال پر مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کہا تھا، جو ان کے مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہے۔

قطعہ تاریخ انتقال سر سیّد احمد خاں رح

ہائے اپنے اختر برگشتہ کی برگشتگی
ہائے اپنی قسمت بدبخت کی بدبختگی

کل جو تھا اپنا مقدر آسماں پر سربلند
آج ہے اس کو حضیض ارض سے پیوستگی

لائق جور و جفا ہم تھے نہ اے چرخِ کہن
کیوں تجھے آزار دینے سے ہوئی دلبستگی

دل گرفتہ ایک تو تھے ہی ہم اپنے زخم سے
اور اس بے وقت کے صدمے سے پائی خستگی

ہائے سر سید کہ جو تھا رونقِ بزمِ نبیؐ
گلشن اسلام کی جس سے تھی اک وابستگی

تھی اسی کی ذات اب پشت پناہ مسلمین
تھی اسی کی ذات سے اسلام کی وابستگی

رات دن وہ منہمک تھا قوم کی اصلاح میں
کی پسند اس مشغلے میں اس نے ازخود رفتگی

لیجیے وہ بلبل باغ محمدؐ چل بسا
جس نے باغ علم میں کی مدتوں گل گشتگی

کون ہے اب اے مسلمانو! تمہارا خیر خواہ
کس کو ہے اس کام کرنے کی بگر شائستگی

اے مرے مرحوم سید اور جیتے چند سال
اور کرتے اپنے جانے میں ذرا آہستگی

خیر خواہِ قومِ اسلام آہ سر سید نماند
بشنوید ایں قصہ جانکاہ سر سید نماند

مولوی حبیب اللہ عظیم آبادی

ایک روز میں انجمن ترقی اردو کے دفتر میں بیٹھا ہوا ابوسلمان صاحب شاہجہاں پوری سے گفتگو کر رہا تھا کہ ایک نہایت نستعلیق نوجوان نعمت اللہ صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے اور میری مرتب کردہ کتاب "کالا پانی" (محمد جعفر تھانیسری) پر ہمت افزائی کے انداز میں اظہار خیال فرمانے لگے۔ گفتگو کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ خاصا علمی ذوق رکھتے ہیں، ان کے پاس کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ ہے اور ان کو یہ چیزیں خاندانی ورثے میں ملی ہیں۔ ان کے جد امجد مولوی حبیب اللہ مختار عظیم آبادی مرحوم نہ صرف ایک اچھے کتب خانہ کے مالک تھے بلکہ تصنیف و تالیف کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان کی کئی کتابیں ہیں جن میں سے ایک کتاب "تذکرۃ الصالحین" طبع شدہ ہے۔ اب مجھے نعمت اللہ صاحب کے کتب خانے اور خاص طور سے تذکرہ الصالحین دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ اتفاق کی بات کہ ایک آدھ مہینے کے بعد وہ خود میرے غریب خانے پر اپنے والد ماجد ولی اللہ صاحب کی ہمراہی میں تشریف فرما ہوئے اور بعض نادر خطی اور مطبوعہ کتابیں بھی لائے۔ اس کے بعد ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مولوی حبیب اللہ صاحب کی تمام تالیفات دیکھنے کو ملیں۔

مولوی حبیب اللہ ابن شیخ امین اللہ تقریباً ۱۸۶۵ء میں محلہ باغ مالو خاں پٹنہ (بستی) میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ ایک ہی سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور دادا نے ان کی پرورش کی۔ دادا کی شفقتیں بھی ان کی قسمت میں نہ تھیں ان کی عمر سات سال کی تھی کہ دادا کا انتقال ہو گیا اور وہ پٹنہ کی مشہور خانقاہ عمادیہ میں شاہ علی امیر الحق (ف ۱۳۰۲ھ) کے زیر سرپرستی تعلیم و تربیت کے مراحل طے کرتے لگے اور اٹھارہ سال کی عمر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور وہ خانقاہ میں مستفیض و مستفید ہوتے رہے۔ اندازہ یہ ہے کہ فارسی کے مروجہ نصاب

کی تکمیل کے ساتھ ساتھ عربی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھیں۔ مولوی حبیب اللہ صاحب اپنی ایک قلمی یادداشت میں لکھتے ہیں۔

"شیخ دھومن دھول پورہ سے آکر لودی کٹرہ میں بسے اور تاحیات خود کرایہ کے مکان میں رہے۔ ان کے بیٹے شیخ سعد اللہ نے تجارت شروع کی اور اس کے سرمایہ سے ایک قطعہ مکان بنایا۔ اس مکان میں شیخ امین اللہ پسر کلاں شیخ سعد اللہ، پدر اس فقیر نے جوان ہی اپنے والد کی حیات میں انتقال کیا اور جب اس فقیر کے دادا شیخ سعد اللہ نے انتقال کیا تو ہماری عمر اس وقت سات برس کی تھی۔ اس وقت سے ہماری دادی کی بہن مسماۃ حاجی وزیرن نے مجھ کو پرورش کیا اور پڑھایا لکھایا اور خانقاہ میں حضرت امیر الاولیاء مولانا الحاج شاہ علی امیر الحق قدس سرہ کے حوالے مجھ کو کیا۔ چنانچہ میں اٹھارہ برس کی عمر تک خانقاہ شریف میں رہا۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"ہمارے نانا کے تین بیٹیاں تھیں۔ چھوٹی بیٹی کا بیٹا میں ہوں۔ ہمارے دادا کی تجارت ٹکلی کی تھی۔ کاریگروں سے ٹکلی بنواتے تھے اور خریدار لوگ ان سے خرید کرکے جاتے تھے۔ ہمارے والد کے سر پر چونکہ باپ کا سایہ موجود تھا لہٰذا روزگار نہیں کیا اور جوان ہی مجھ کو ایک برس کا چھوڑ کر اپنے والد کے سامنے انتقال کیا۔ بعد ازاں ہمارے دادا دادی نے بھی انتقال کیا۔ اب ہمارے گھر میں صرف ہماری دادی کی بہن حاجی وزیرن باقی رہیں۔ انہوں نے مجھ کو پرورش کیا اور پڑھایا لکھایا۔"

اس کے بعد ان کی رسائی خان بہادر مولوی خدابخش رئیس اعظم پٹنہ (ف ۳ اگست ۱۹۰۸ء) کے یہاں ہو گئی اور وہ مولوی خدابخش کے بھائی مولوی محمد اسماعیل رجسٹرار کے ساتھ بلسہ رجسٹری میں ۱۸۸۴ء میں وثیقہ نویس مقرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں ۲۱ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۲ھ کو حبیب اللہ صاحب کی شادی شیخ احمد حسین (ف ۲۱ رمضان ۱۳۱۹ھ)

کی صاحبزادی سے ہو گئی، شیخ صاحب زمیندار اور ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ چھ ماہ کے بعد مولوی خدا بخش نے حبیب اللہ صاحب کو گورنمنٹ کی طرف سے لا ایجنٹ (LAW AGENT) مقرر کرا دیا اور تمام سرکاری مقدمات ان کے سپرد ہونے لگے۔ چھ ماہ وہ کلکٹری میں محرر بھی رہے۔ جب خان بہادر مولوی خدا بخش ۱۸۹۵ء میں چیف جسٹس ہو کر حیدر آباد دکن چلے گئے تو حبیب اللہ صاحب نے "مختاری" کا امتحان دیا۔ ۱۴ مئی ۱۸۹۸ء کو انہوں نے یہ امتحان پاس کر لیا اور مختاری کا کام شروع کر دیا۔ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے صوبۂ بنگال میں بھی پریکٹس کے لیے اپنا نام رجسٹر کرایا۔ اس پیشے میں وہ خاصے کامیاب رہے اور ان کی شہرت "مختار صاحب" کے عرف سے ہو گئی۔

مختار صاحب کی تعلیم و تربیت خانقاہ عمادیہ (پٹنہ) میں ہوئی تھی۔ وہ شاہ رشید الحق صاحب (ف ۱۳۳۹ھ) سے بیعت تھے۔ اپنے مرشد اور پیران سلسلہ سے بہت عقیدت رکھتے تھے اور سلسلہ کے معمولات کے سختی سے پابند تھے۔ تصوف ان کے مزاج و طبیعت میں رچا بسا تھا۔ مشائخ خانقاہ عمادیہ سے عقیدت اور مناسبت کے باعث انہوں نے مشائخ سلسلہ عمادیہ پر کئی اچھی کتابیں لکھیں۔ حضرت تمنا عمادی (سراجیات الحق محی الدین تمنا عمادی) سے مختار صاحب کے بہت گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے بلکہ تمنا صاحب کے الفاظ میں دونوں "لنگوٹیا یار" تھے۔ ہم یہاں تمنا صاحب کے ایک طویل مکتوب کا اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے مختار صاحب کی سیرت و کردار کے بعض پہلو نمایاں ہوتے ہیں:

"(مولانا علی امیر الحق) کے بعد خانقاہ عمادیہ کے سجادہ نشین ان کے اکلوتے صاحبزادے مولانا شاہ رشید الحق ہوئے جو میرے چچا اور میرے مرشد تھے۔ ان کے ہاتھ پر میں نے بیعت بھی کی تھی اور مجھ کو اجازت و خلافت بھی ان سے حاصل تھی۔ انہیں سے میرے آغاز شباب کے لنگوٹیا یار بھائی حبیب اللہ مرحوم کو بھی بیعت اور تعلیم و تربیت تھی۔ بھائی حبیب اللہ مرحوم مجھ سے دس بارہ برس بلکہ کچھ زیادہ ہی بڑے تھے۔ بھائی حبیب اللہ مرحوم ایک ذاکر و شاغل تہجد گزار صوفی تھے۔ اذکار قلندریہ کے بڑے مشتاق تھے۔ ریاکاری مطلق نہ

نہ تھی، اس لیے لوگ ان کے حالات سے بہت کم واقف ہو سکے۔ وہ اپنے
کو ضرورت سے زیادہ چھپاتے تھے۔ میں ان باتوں میں ان کا مشیر تھا اس لیے
برائے مشورہ مجھ پر ظاہر کرتے تھے۔ بیس اکیس برس کی عمر ہوگی کہ میں اپنے چچا
کے زیر تربیت اپنے جد کی خانقاہ عمادیہ میں تصوف کی تعلیم اپنے خاندانی طریقے
پر حاصل کرنے لگا اور خانقاہ میں مستقل طور سے مقیم ہو گیا۔ اپنے چچیرے بھائی
حافظ شاہ محمد حبیب الحق اور بھائی حبیب اللہ مرحوم کا جو خانقاہ کے متصل ہی
اسی محلے میں رہتے تھے اور زیادہ تر ان کا وقت اپنے معاشی مشاغل کے بعد
اسی خانقاہ میں گزرتا تھا برابر ساتھ رہا۔ یوں تو اور لوگ بھی آتے تھے جن سے
دن رات کا ساتھ رہتا تھا مگر علمی و خاندانی تاریخ کے مذاکرے اور تحقیق و تفتیش
کا ذوق صرف بھائی حبیب اللہ مرحوم ہی کو تھا۔ ان کی وجہ سے مجھ کو بھی اس کا
ذوق پیدا ہو گیا ورنہ اس وقت میرا مشغلہ اردو فارسی شاعری تھی یا منطق و فلسفہ
کی بعض ان مشکل و معروف کتابوں پر جو درسیات میں داخل ہیں۔ حواشی لکھنا
مثلاً میر زاہد، ملا جلال، حمد اللہ، قاضی مبارک وغیرہ، ان دو مشغلوں کے
سوا نیا مشغلہ خانقاہ میں آنے کے بعد اذکار قلندریہ کی مشق کا پیدا ہو گیا تھا۔
بھائی حبیب مرحوم نے خاندانی بزرگوں کے حالات کی طرف توجہ دلائی۔ ان
کے تعلقات میری اقامت خانقاہ سے قبل خدا بخش خاں، سی۔ آئی۔ ای مرحوم
کے مشہور کتب خانے سے بھی رہے تھے، اس لیے وہاں سے وہ بہت حالات
بزرگان سلف نوٹ کر کے لاتے تھے۔ وہ عبارتیں فارسی میں ہوتیں اور جا بجا عربی
جملے یا آیات یا حدیث کے فقرے یا پوری عبارت بھی ہوتی تھی جس کو وہ مجھ سے
سمجھ لیتے تھے۔ اس لیے کہ عربی سے پوری طرح واقف نہ تھے اور تلمیحات
کے سمجھنے میں ان کو دشواری ہوتی تھی۔ میں پھر پٹنہ ہی کے مدرسہ محمدیہ حنفیہ
میں مدرس دوم ہو گیا مگر اقامت خانقاہ ہی میں رہی۔ درس کے وقت مدرسہ
چلا جاتا تھا وہ بھی کچہری کے وقت اپنی مختار کاری کی وجہ سے کچہری چلے جاتے

تھے۔ خانقاہ میں میری اقامت بیس برس تک رہی اور بھائی حبیب اللہ صاحب کے ساتھ بیس برس تک میرے گہرے مخلصانہ تعلقات رہے۔ بھائی شاہ حبیب الحق بھی ہم لوگوں کے مشاغل میں بطور مشورہ کبھی کبھی حصہ لیتے تھے مگر عملی طور پر بہت کم حصہ لیا ۔۔۔ بھائی حبیب اللہ مرحوم سے پیر بھائی ہونے کے علاوہ ہم مذاقی بھی تھی اور انہوں نے مجھ کو زبردستی اپنا ہم مذاق بنالیا تھا ورنہ تذکرۃ الاولیاء و تذکرہ بزرگان خاندان و تذکرہ بزرگان وطن سے مجھ کو مطلق دلچسپی نہ تھی، ان کے شوق دلانے اور ذوق پیدا کرنے سے میں بھی ان کا شریک کار بن گیا مگر میں نے جو کچھ لکھا وہی لکھا جو انہوں نے مجھ سے لکھوایا، رہنمائی وہی کرتے تھے اس لیے جب تک اُن کا ساتھ رہا ان کا پیدا کردہ ذوق قائم رہا، ان سے چھوٹا تو پھر ذوق بھی باقی نہ رہا۔ خانقاہ کی آمد و رفت بھی بہت کم ہوگئی۔ کبھی آیا بھی چند گھنٹے کے لیے اور عصر سے پہلے واپس چلا آیا۔ بھائی حبیب صاحب سے کبھی ملاقات مختصر سی ہوئی، کبھی نہیں ہوئی مگر مختصر ہی سہی۔ جب بھی ملاقات ہوئی، گلے سے لپٹ گئے بلکہ گلے سے لپٹا لیا اور بڑی محبت سے ملے جس طرح ایک بڑا بھائی چھوٹے بھائی سے ملتا ہے، جتنی دیر بھی باہم بیٹھ کر ملے محبت سے لبریز ہی باتیں آپس میں ہوتی رہیں۔“

مختار صاحب نے ایک اچھا خاصا کتب خانہ جمع کرلیا تھا جو کئی ہزار کتابوں پر مشتمل تھا۔ اس میں نادر و نایاب کتابیں بھی تھیں اور خطی کتابوں کا بھی خاصا ذخیرہ تھا۔ خانقاہ عمادیہ کے بزرگوں کی تصنیفات خصوصاً شاہ ظہور الحق (ف ۱۲۳۴ھ) کی تمام تصنیفات ان کے کتب خانے میں تھیں۔ ان کے کتب خانے کی ایک نامکمل فہرست ہماری نظر سے گزرتی ہے۔ اس کتب خانے کی کچھ نادر اور منتخب کتابیں ان کے پوتے نعمت اللہ صاحب کے پاس موجود ہیں۔ غرض مختار حبیب اللہ صاحب کے کتب خانے میں مذہب، تاریخ، طب، صرف، نحو، تصوف، سیرت، سوانح وغیرہ پر کافی اور قابل قدر کتابیں تھیں۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب پھلواروی لکھتے ہیں۔[1]

[1] بہار کے بعض قدیم کتب خانے از مولوی حفیظ اللہ پھلواروی، مہر نیمروز، کراچی، جلد ۹ شمارہ ۵، صفحہ ۲۱

"پٹنہ سٹی عظیم آباد میں مولوی حبیب اللہ صاحب مختار کا ذاتی کتب کا نادر ذخیرہ تھا، آپ خان بہادر مولوی خدا بخش بانی کتب خانہ بانکی پور کے دوستوں میں تھے اور کتب خانے کے کاموں میں خان بہادر کے مددگار رہے۔ آپ کو کتب اندوزی کا اعلیٰ ذوق تھا..... آپ کے انتقال کے بعد بہت سی کتابیں کتبخانہ عمادیہ اور کتب خانہ بانکی پور میں منتقل کر دی گئیں۔ کچھ کتابیں آپ کے پوتے نعمت اللہ صاحب کے پاس موجود ہیں جو کراچی میں مقیم ہیں۔"

مختار حبیب اللہ صاحب کا انتقال ۱۵ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ (۱۲ اپریل ۱۹۴۱ء) کو بوقت نماز فجر ہوا اور وہ احاطہ درگاہ شاہ ابو بختیار کے جنوب کی طرف تقریباً دو گز کے فاصلے پر دفن ہوئے۔ حضرت تمنا عمادی نے مندرجہ ذیل قطعۂ تاریخ کہا ہے:

ہو "آگاہ" تو خود نام و پیشہ	بتا دے گا تجھے اے مرد ہشیار
کہ کس سن میں ہوئے رخصت جہاں سے	مرے بھائی "حبیب اللہ مختار"

۱۳۸۷ — ۲۷ = ۱۳۶۰ھ

مولوی حبیب اللہ مرحوم نے ایک صاحبزادے ولی اللہ یادگار چھوڑے، ان کو شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا حضرت تمنا عمادی سے تلمذ تھا، ۷ جولائی ۱۹۷۱ء کو کراچی میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

مختار حبیب اللہ مرحوم تصنیف و تالیف کا خاصا ذوق رکھتے تھے اور اس سلسلے میں وہ محنت کرتے تھے۔ ان کا اپنا کتب خانہ تھا۔ اس کے علاوہ کتب خانہ خانقاہ عمادیہ اور خدا بخش لائبریری سے بھی اپنی کتابوں کے لیے مواد فراہم کرتے تھے۔ انہوں نے مشائخ سے متعلق دو تین تذکرے لکھے ہیں۔ ایک کتاب کلامیات اور ایک طب پر لکھی، اب ان کی کتابوں کی تفصیل ملاحظہ ہو:-

انوار الاولیاء

خانقاہ عمادیہ کے بزرگوں کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ ضخامت کی وجہ سے یہ تذکرہ طبع نہ ہو سکا ورنہ مشائخ بہار کے سوانحی ادب میں اہم اضافہ ہوتا اس کا خطی نسخہ ادارہ رشیدیہ

منگل تھانہ (پٹنہ) میں موجود ہے۔ حکیم احمد اللہ ندوی لکھتے ہیں:[1]

"انوار الاولیاء میں خانقاہ عمادیہ کے خاندان کے بزرگوں کے حالات لکھے ہیں پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور ۲۲ جمادی الاول سنہ ۱۳۱۰ھ کو مکمل ہوئی تھی۔ یہ کتاب ہنوز قلمی ہے اور ادارہ رشیدیہ منگل تھانہ میں موجود ہے۔"

انوار الاولیاء کے سبب تالیف کا ذکر مختار حبیب اللہ صاحب نے تذکرۃ الصالحین کے دیباچہ میں بھی کیا ہے اس کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"جب سے ہندوستان میں مطابع جاری ہوئے باوجود تلف حالات کے دوسرے صوبہ والوں نے علماء وصلحاء ومشاہیر سلف کے حالات کی نشر واشاعت کی طرف کافی توجہ کی مگر ہمارا صوبہ بہار کماحقہ اس طرف اب تک متوجہ نہ ہوا باوجودیکہ یہ ایک ضروری کام تھا۔ آج دنیا کی ترقی یافتہ قومیں اپنے اسلاف کے حال کتنے اہتمام اور مستعدی سے شائع کر رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سلف کے احوال خلف کے لیے دلیل راہ اور مشعل ہدایت ہیں چنانچہ جب حقیر کو حضرت شیخی وسندی ومرشدی مولانا حاجی شاہ محمد رشید الحق سے شرف ارادت حاصل ہوا اس وقت سے یہ خیال پیدا ہوا کہ شیوخ سلسلہ کا احوال شائع کروں بالآخر بہ تفحص وتلاش بسیار ایک کتاب مرتب ہوئی جس کا نام انوار الاولیاء رکھا گیا مگر ہنوز زمانہ نے اس کی اشاعت کا موقع نہیں دیا۔"

تذکرۃ الصالحین

مختار حبیب اللہ صاحب نے یہ تذکرہ پھلواری اور پٹنہ کے مشائخ وصوفیہ کے حالات میں لکھا ہے۔ یہ تذکرہ سنہ ۱۳۴۲ھ میں مرتب ہوا اس کا سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ اور ۲۰۶ صفحات پر مشتمل ہے اس میں ۱۷۵ بزرگوں کے حالات ہیں۔ منشی شمس الدین صاحب کی کوشش سے یہ کتاب شمسی پریس پٹنہ میں سنہ ۱۳۴۸ھ میں طبع ہوئی۔ اس کتاب کے بارے میں مؤلف

---

[1] مسلم شعرائے بہار (حصہ ششم) از حکیم احمد اللہ ندوی (کراچی سنہ ۱۹۷۰ء) ص ۱۳۵

لکھتے ہیں :-

" اس کتاب (انوار الاولیاء) کی تالیف کے سلسلے میں اکثر سیرتیں دیکھنے کا اتفاق ہوا اور اکثر اکابرین صوبہ و مضافات عظیم آباد کے حالات معلوم ہوئے۔ جب انوار الاولیا کی ترتیب سے فراغت ہوئی تو یہ خیال ہوا کہ بزرگان وطن کے حالات لکھوں اس طرح پر کہ اس میں اُن کے تمام حالات زندگی درج ہوں۔ واقعات کشف و کرامات سے کوئی بحث نہ ہو کیونکہ معیار کمال ریاضت و مجاہدہ علم ظاہری و باطنی اور اتباع سنّت نبوی ہے نہ کہ کشف و کرامات، چنانچہ چند سال کی کاوش کے بعد یہ کتاب "تذکرۃ الصالحین" ۱۳۴۲ھ میں مرتب ہوئی مگر طباعت کا سامان نہ تھا کہ عزیز پر تمیز منشی شمس الدین کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ وہ اس کی طباعت کے لیے مستعد ہو گئے اور یہ تذکرہ آج اس قابل ہوا کہ آپ کے سامنے پیش کیا جا سکے۔"

شاہ محمد قائم قتیلؔ سجادہ نشین آستانہ چشتیہ نظامیہ داناپور نے تذکرۃ الصالحین کی طباعت پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے :-

آں حبیب اللہ فخر روزگار — صاحب علم و عمل والا خطاب
منشی آفاق و نثار بلیغ — ہمتش در ملک معنی کامیاب
جمع یک جا کرد حال اولیاء — نفع باطن یافت از حق ہم ثواب
وصف تالیفش چہ گوید ایں فقیر — فیض پاش و فیض بخش و فیض یاب
سال تاریخش رقم کردم قتیلؔ — پیکر ادراک گشتہ بے نقاب

۱۳۴۸ھ

تحقیق الکلام فی المولد والقیام

مختار حبیب اللہ مرحوم نے یہ رسالہ میلاد و قیام کے جواز میں لکھا ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں میلاد کی مروجہ مجالس عام حلقوں میں انیسویں صدی عیسوی کے بالکل آغاز میں شروع ہوئیں اگرچہ بعض تاریخی کتابوں میں امراء و رؤسا کے حالات میں ربیع الاوّل کے مہینے میں اس نوع کی مجالس کے انعقاد کا ذکر عہد مغلیہ

میں بھی ملتا ہے مگر بہت کم ۔ بہرحال جب میلاد کی مجالس شروع ہوئیں تو بعض علماء نے
ان کے انعقاد کا رد کیا اور بعض نے تائید کی لہٰذا اس مسئلے میں علماء دو گروہوں میں تقسیم ہو
ہو گئے۔ مختار حبیب اللہ صاحب نے متوازن و معتدل انداز میں یہ رسالہ لکھا ہے چنانچہ
وہ آغاز کتاب میں لکھتے ہیں :-

" بندہ محمد حبیب اللہ ولد محمد امین اللہ مرحوم حنفی مذہباً نجیبی العمادی طریقتاً
گزارش کرتا ہے کہ میں مجلس مولود شریف کو موجب ثواب و خیر و برکت سمجھتا
ہوں اور قیام کو صرف مباح سمجھ کر، جس جگہ لوگ قیام کرتے ہیں وہاں میں
قیام کرتا تھا اور جہاں قیام نہیں ہوتا تھا وہاں قیام نہیں کرتا تھا لیکن کسی کو برا
نہیں سمجھتا تھا اور نہ اس مسئلے سے مجھے کوئی واقفیت تھی مگر اس زمانے میں
لوگوں کو میں نے دیکھا کہ اس کے متعلق بہت کچھ شور و شر کرنا شروع کیا۔ کوئی
کہتا ہے کہ مولود ہی بدعت سیئہ ہے، کوئی منکر قیام کو دائرہ حنفیت سے
خارج کر رہا ہے ان سب وجوہات سے مجھ کو اس مسئلہ کی تحقیق کرنے
کی ضرورت ہوئی ۔"

یہ رسالہ طبع نہیں ہوا ہے اس کا خطی نسخہ ہماری نظر سے گزرا ہے جس کا سائز
$\frac{22 \times 18}{8}$ ہے اور وہ ۷۶ صفحات پر مشتمل ہے ۔

وسیلۂ نجات

مختار حبیب اللہ صاحب کی ایک کتاب " وسیلہ نجات " کا مسودہ بھی ہماری نظر سے گزرا ہے
یہ کتاب بھی دراصل پیران سلاسل کے حالات و سوانح پر مشتمل ہے مگر اس میں بعض صوفیانہ
اور دوسرے اختلافی مسائل بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب دو ابواب اور چند حصوں پر مشتمل ہے۔
سائز $\frac{22 \times 18}{8}$ اور ۴۴۳ صفحات ہیں، تتمہ میں اس کے اختتام کی تاریخ بھی ۲۲ جمادی
الاول ۱۳۱۰ھ مرقوم ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے پہلے اس کتاب کا نام وسیلۂ نجات
رکھا تھا اور اس میں سوانح و مسائل دونوں حصے شامل تھے مگر بعد میں انہوں نے سوانحی
حصے کو علیحدہ کر کے اس کا نام " انوار الاولیاء " رکھ دیا، دونوں کتابوں وسیلۂ نجات

اور انوار الاولیاء کے اختتام کی تاریخیں بھی ایک ہی ہیں اور کم و بیش ضخامت بھی ایک ہی ہے
اس کتاب کے سبب تالیف کے متعلق مؤلف لکھتے ہیں:۔

"بندہ محمد حبیب اللہ ابن شیخ محمد امین اللہ لودی کرڈوی عظیم آبادی متوطناً حنفی مذہباً قادری العمادی طریقتاً نے دیکھا کہ ہمارے اکثر پیر بھائی یہ نہیں جانتے ہیں کہ ہمارے پیران طریقت کا کیا نام تھا اور جنہوں نے بذریعہ شجرہ کے جانا بھی تو یہ نہیں جانتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے تھے اور کہاں تھے اور کوئی کتاب بھی نظر سے نہیں گزری کہ جس میں کل بزرگان شجرہ قادریہ عمادیہ کا احوال ہو اور جب تک کہ کوئی شخص احوال حمیدہ سے کسی کے واقف نہیں ہوتا ہے اس کی محبت پیدا نہیں ہوتی ہے ..... پس ہم لوگوں پر واجب ہے کہ اپنے پیران سلاسل سے محبت رکھیں اور ان کے قدم بقدم چلیں۔ بغیر محبت کوئی بات حاصل نہیں ہوتی .... اس کی وجہ یہ کار اہم میں نے اپنے ذمہ لیا اگرچہ ہماری لیاقت سے دور تھا لیکن بفضل خداوند کریم و بہ توجہ بزرگان دین چند کتب معتبرہ جیسے اخبار الاخیار، مراۃ الاسرار، منبع الانساب، سفینۃ الاولیاء، خزینۃ الاصفیاء، تاریخ ابوالفداء، اصول المقصود، تذکرۃ الکرام، ملفوظات مولانا نور الحق، انتصاح عن ذکر اہل الصلاح، تاریخ قادریہ، سلطان الاذکار فی مناقب غوث الابرار سے احوال بزرگان قادریہ کا اور چند مسائل متفرقہ از قول الجمیل، مشکوٰۃ شریف، بخاری شریف، حصن حصین، جوہر الایقان فی حفظ الایمان، مقالہ کاملہ، اصباح الحق، حرز الابرار فی زیارۃ الآثار، مجموعہ تصوف، فقر نامہ، معارج النبوۃ و ملفوظات مخدوم جہانیاں سے استنباط کر کے اس کتاب کا نام وسیلۂ نجات رکھ کر دو باب..... فصول پر اختتام کیا، خدا اس رسالہ کو مقبول ہر خاص و عام بنا دے۔"

اس کتاب پر نظر ثانی مولانا تمنا عمادی صاحب نے کی ہے اور بعض مشائخ کے انتقال کے قطعات تاریخ بھی تمنا عمادی صاحب نے کہہ کر شامل کر دیئے ہیں۔

علاج الامراض

مختار حبیب اللہ صاحب کے صاحبزادے ولی اللہ صاحب جب طب کی تعلیم حاصل کر رہے تھے تو انہوں نے یہ کتاب ولی اللہ صاحب کے لیے لکھی۔ مختار صاحب نے طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی صرف مطالعہ کی اساس پر انہوں نے یہ کتاب مرتب کر دی اس میں سر سے پیر تک جملہ امراض کا تفصیلی بیان تھا یہ کتاب تقریباً تین سو (۳۰۰) صفحات پر مشتمل تھی۔ افسوس کہ یہ کتاب تلف ہو گئی۔

مختار حبیب اللہ صاحب شعر و شاعری سے بھی مناسبت رکھتے تھے اور کبھی کبھی خانقاہ عمادیہ کے مشاعرے میں بھی شرکت کر لیتے تھے اس بارے میں تمنا عمادی کے ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"حبیب بھائی مرحوم و مغفور مستقل طور سے شاعری نہیں کرتے تھے کبھی کبھی کچھ لکھ لیتے تھے۔ تذکرہ لکھنے کا ذوق تھا، تاریخی قطعات لکھتے تھے۔ تاریخ کا مصرع یا فقرہ نکالا اور مجھ کو دے دیا کہ میں اس کو قطعہ میں نظم کر دوں مگر وہ خود بھی قطعہ لکھتے تھے۔ میں چونکہ مستقل طور سے خانقاہ میں رہتا تھا اور مجھ سے بے حد محبت تھی اور ایک دوسرے پر پورا اعتماد تھا اس لیے جہاں تک میں جانتا ہوں میرے سوا کسی سے انہوں نے اپنے کلام پر مشورہ نہیں کیا۔ شروع شروع میں وہ صرف سناتے تھے سنتے وقت جو مشورہ میں نے دیا اس کو بڑی مسرت کے ساتھ قبول کیا اس کے بعد پھر خود جو لکھا وہ مجھ کو دے دیا کہ اس کو دیکھ لیجئے میرے مشوروں کو بڑی مسرت کے ساتھ پسند کرتے تھے بجز ایک مشاعرے کے جو خانقاہ عمادیہ میں ہوا تھا مصرعہ طرح شاید یہ تھا:

مرا سودائے تاج العارفین است

اور اس طرح پر یہ پوری غزل لکھی تھی۔ اس مشاعرے کا گلدستہ میں نے مرتب کیا تھا حضرت شاہ حبیب الحق بھائی صاحب شعر نہیں کہتے تھے

تھا اس مشاعرے میں شرکت کی تھی اور غزل بھی کہی تھی اور پڑھی تھی۔ ان کی غزل بھی میں نے دیکھی تھی۔ یہ گلدستہ نور چشم شاہ غلام حسنین سلمہ اللہ تعالیٰ خانقاہ سلیمانیہ پھلواری شریف کے پاس ہوگا۔ میں نے ان کو دے دیا تھا۔ مشاعرے کی غزل کے سوا کوئی پوری غزل غالباً نہیں کہی۔ چار پانچ، شعر دو شعر کبھی کبھی کہتے تھے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ اس کو محفوظ نہیں رکھتے تھے۔ یہ اس لیے ہے کہ ایک بار ان سے پوچھا کہ فلاں طرح میں آپ کے چند شعر تھے۔ اس طرح پر میرے بھی چند شعر ہو گئے ہیں اس میں ملا لیجیے تو ہنس کر کہنے لگے کہ وہ ہیں کہاں؟ میں نے کہا کہ بیاض پر لکھ نہیں لیتے، کہنے لگے کہ کیا کروں گا لکھ کے، میں نے تاکید تو کی تھی کہ ایسا نہ کیجیے جو کہئے اس کو ایک بیاض پر ضرور لکھ رکھیے۔ معلوم نہیں کسی بیاض میں ان کے کچھ اشعار ہیں یا نہیں، ہائے کیا کہوں بڑی خوبی کے آدمی تھے۔"

حبیب صاحب کے چند اشعار بطور نمونہ نقل ہیں[1]:

منزل عشق میں کیوں لوگ قدم رکھتے ہیں
مبتلا کس لیے ہوتے ہیں بلا کے عاشق

طعنوں نے ان کے کر دیا چھلنی مرا جگر
مجروح اب تو ہو گئے ہیں تیغ زباں سے ہم
احباب ہم نشیں گئے ملک عدم حبیب
بد قسمتی سے پیچھے رہے کارواں سے ہم

عقبیٰ کی خبر تو تم دنیا کی ہوس چھوڑ دو
کام آئے گا تم کو یہ لعل و گہر کب تک

---

[1] ملاحظہ ہو مسلم شعرائے بہار (حصہ ششم) از حکیم احمد اللہ ندوی (کراچی ۱۹۷۰ء) صفحہ ۱۳۵۔

فانؔی بدایونی

اٹھارہویں صدی عیسوی میں مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ اسی زمانہ میں شمالی ہند (روہیل کھنڈ) بریلی، نجیب آباد اور فرخ آباد میں روہیلہ اور بنگش پٹھانوں نے اپنی نیم مختار ریاستوں کی داغ بیل ڈالی۔ ان میں داؤد خاں، نواب علی محمد خاں، حافظ رحمت خاں، نجیب الدولہ اور محمد خاں بنگش کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس زمانہ میں روہ، باجوڑ، سوات اور بنیر وغیرہ علاقوں سے بہت سے پٹھان، روہیل کھنڈ میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ اور انہوں نے اس علاقہ کی معاشرتی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی زندگی پر اثر ڈالا۔ اسی زمانہ میں شوکت علی خان فانیؔ کے بزرگ بھی وارد روہیل کھنڈ ہوئے۔ حسب مقدرت امارت و ریاست سے بہرہ ور ہوئے، لیکن سیاسی انقلابات و انتشار میں اس خاندان کی حالت بھی روبزوال ہو گئی جب فانیؔ ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو پیدا ہوئے تو ان کے والد شجاعت علی خان ایک پولیس افسر (تھانیدار) تھے اور ان کی تعیناتی ضلع بدایوں کے قصبہ اسلام نگر میں تھی۔ یہیں فانیؔ کا آنول نال گڑا ہے۔

فانی کی پرورش اور تعلیم و تربیت تمام تر شہر بدایوں (محلہ براہم پورہ) میں ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم منشی فیض اللہ اور وحید اللہ خاں سے حاصل کی۔ آخر الذکر شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد فانی گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں میں داخل ہوئے ۱۸۹۷ء میں انہوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں بریلی کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۰۱ء میں بی اے پاس کیا۔ بریلی کالج میں فانیؔ نے انگریزی ادب اور فلسفہ کا خاص طور سے مطالعہ کیا۔

اس کے بعد فانیؔ نے درس و تدریس کی زندگی کو اپنایا اور وزیر آباد (پنجاب) کے

ہائی اسکول میں بحیثیت سیکنڈ ماسٹر ان کا تقرر ہوا مگر چند مہینے گزار کر وہ بدایوں آ گئے۔
الطاف حسین صاحب (ہیڈ ماسٹر) کی تحریک پر ۱۹۰۴ء میں فانی اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ اور یہیں سے وہ سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس ہو کر گونڈہ گئے وہاں گوہر جان سے ان کو تعلق خاطر ہوا مگر جلد ہی وہ اس ملازمت سے مستعفی ہو کر بدایوں آ گئے کہا جاتا ہے کہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدہ پر ان کے تقرر کا امکان تھا کہ ان کے والد نے پولیس کی ملازمت سے منع کر دیا۔

۱۹۰۶ء میں فانی نے علی گڑھ کالج میں ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۰۸ء میں اس امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔ اب ہائی کورٹ کے وکیل کی حیثیت سے انہوں نے لکھنؤ میں پریکٹس کا آغاز کیا۔ وہاں انہیں اس پیشہ میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور شعری و ادبی و علمی و ثقافتی حلقوں میں بھی تعارف ہوا۔ ۱۹۱۳ء میں بدایوں میں سیشن جج کی عدالت قائم ہوئی لہذا فانی بدایوں آ گئے لیکن یہاں ان کو سکون نہ ملا۔ ۱۹۱۵ء میں والدہ اور جولائی ۱۹۱۷ء میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ خاندانی مناقشوں نے سر اٹھایا۔ مالی اور معاشی پریشانیاں اس پر مستزاد، ساہوکاروں نے آنکھیں دکھانی شروع کر دیں۔
اسی زمانہ میں فانی نے شاعری کی تجدید کی۔ انہیں اپنا دیوان طبع کرانے کا خیال بھی آیا اور اس کی تاریخ بھی "نغمۂ جگر دوز" (۱۳۳۵ھ) کہہ ڈالی مگر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔
بدایوں کے ناموافق حالات اور یہاں کی محدود فضا سے گھبرا کر انہوں نے ۱۹۱۷ء میں دوبارہ لکھنؤ کا رُخ کیا۔ اب وکالت سے زیادہ ان کی شاعری کی دھوم مچی۔ دن رات شعرائ کا جمگھٹا رہتا۔ مشاعروں میں شرکت ہوتی۔ انہوں نے اپنی مشہور غزل

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ

جب لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں پڑھی تو دھوم مچ گئی۔ ان شعری و ادبی دلچسپیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاروبارِ وکالت متاثر ہونے لگا۔ شاہ خرچیاں جوں کی توں، قرض کا بار بڑھنے لگا۔
فانی بدایوں آ گئے۔ حالات سدھر نہ سکے بلکہ بگڑتے ہی رہے۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں فانی میونسپل

بورڈ بدایوں کے بلا مقابلہ ممبر منتخب ہوگئے۔ اہلِ شہر نے اس کامیابی پر مبارکباد پیش کی مگر وہ اس گوں کے آدمی نہ تھے کچھ دنوں کے بعد کسی سے بلا کہے سُنے مستعفی ہوگئے۔ بعض احباب کے مشورے پر انہوں نے بریلی میں وکالت شروع کردی مگر وہاں بھی قدم نہ جم سکے اور بدایوں آگئے۔ یہاں کیا دل لگتا پھر لکھنؤ پہنچ گئے۔ اب وکالت تو برائے نام تھی۔ احباب و شعرأ کا مجمع شعر و سخن کے چرچے۔ اس پر یہ کہ وہ تقن جان کے اسیرِ زلف ہوگئے۔ مالی پریشانیاں اور حالات کی ناسازگاری ایسی آڑے آئی کہ لکھنؤ چھوڑ کر بدایوں آنا پڑا اور آبائی جائیداد فروخت کرکے قرض کے بار سے سبکدوش ہوگئے۔

اَب فانیؔ کے ہاتھ میں رقم تھی لہٰذا کلکتہ اور بمبئی کی سیاحت کی ٹھانی۔ لکھنؤ ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ چند روز رہے۔ شعر و سخن کے ہنگامے برپا ہونے شروع ہوئے تو چُپ چپاتے بدایوں آگئے۔ دو چار روز ٹھہر کر اپنے بیٹے اور بھائی کے ہمراہ بمبئی روانہ ہوگئے۔ تین ہفتے سیر و تفریح میں گزارے، پھر دہلی ہوتے ہوئے بدایوں آگئے۔

سیر سپاٹے سے فارغ ہونے کے بعد زندگی کی گرانباریوں نے پریشان کیا، لکھنؤ پہنچے الطاف حسین صاحب کو علم ہوا تو انہوں نے اٹاوہ بلا لیا۔ فانیؔ نے عدالت دیوانی میں پریکٹس شروع کردی مگر وکالت کی بجائے شعر و سخن کا شہرہ ہوا۔ بابو لچھمن پرشاد منصف نے ان کی قدردانی کی۔ نور جہاں سے مراسم ہوئے۔ اسی دوران میں لچھمن پرشاد کا تبادلہ ہوگیا اور نور جہاں نے بھی اٹاوہ چھوڑ دیا۔ فانیؔ نے ارضِ تاج کی راہ لی اور آگرہ میں کچھ دن قیام کرنے کے بعد وہ حیدرآباد پہنچے (۱۹۲۶ء) مہاراجہ سرکشن پرشاد، شادؔ کی ملاقات سے شاد کام ہوئے مگر جلد ہی واپس آگئے۔

دوسرے سال (۱۹۲۷ء) میں فانیؔ، مہاراجہ کی دعوت پر دوبارہ حیدرآباد دکن پہنچے۔ انہوں نے پہلے سے زیادہ فانیؔ کی قدرافزائی فرمائی۔ مہاراجہ کی نوازشیں اور عنایات خوب ہوئیں مگر وہ جلد ہی بدایوں چلے آئے۔ ان کے دوست لچھمن پرشاد سول جج ہوکر آگرہ آگئے تھے لہٰذا ۱۹۲۸ء میں فانیؔ آگرہ پہنچے۔ شعر و سخن کی خوب محفلیں جمتی رہیں۔ بابو لچھمن پرشاد کے تبادلے کے بعد فانیؔ کا قیام آگرہ میں مشکل نظر آنے لگا۔ بعض احباب کے

مشورہ سے انہوں نے ایک علمی و ادبی ماہنامہ "تسنیم" نکالا۔ جس کے مدیر اعلیٰ وہ خود تھے اور مجلسِ ادارت میں مانی جائسی اور مخمور اکبر آبادی کے نام شامل تھے۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں تسنیم کا پہلا پرچہ نکلا۔ ستمبر ۱۹۳۱ء تک فانی کا اس پرچہ سے تعلق رہا۔ پھر ذمہ داری مانی جائسی نے سنبھال لی۔ جون ۱۹۳۲ء کے بعد یہ رسالہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ ہاں اس مرتبہ آگرہ میں "ستارہ" سے بھی ملاقات رہی فانی کہتے ہیں :

گرچہ تھی صبحِ آگرہ "بے نور" اوج پر تھا مگر "ستارۂ شام"

پہلے مصرع میں "نور جہاں" کی طرف اشارہ ہے۔

ماہنامہ "تسنیم" سے قطع تعلق کے بعد فانی چند ماہ آگرہ میں رہے، پھر انہوں نے حیدر آباد جانے کا ڈول ڈالا۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی معارف پروری کی اُمید میں وہاں پہنچے۔ مہاراجہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مصاحبت کا شرف بخشا اور اپنی ذات سے وظیفہ مقرر کر دیا۔

مہاراجہ نے فانی کے لیے کسی اعلٰے ملازمت کی کوشش کی لیکن بعد از خرابیٔ بسیار وہ ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ مہاراجہ کی امداد بھی جاری رہی۔ قدرے سکون نصیب ہوا۔ اور شعر و سخن کی محفلیں جمنے لگیں۔ احباب و شعرا کا مجمع رہنے لگا۔ اور اب فانی حیدر آباد کی بزمِ شعر و سخن کے اہم رکن اور مہاراجہ کی محفل کے خاص شاعر تھے۔ اپریل ۱۹۳۵ء میں جے پور کے کل ہند مشاعرے میں وہ حیدر آباد کے نمائندہ ہو کر پہنچے۔

جب شہزادہ معظم جاہ کے حضور میں فانی کی شہرت پہنچی تو شہزادہ نے طلب فرمایا وہ "دربارِ دُربار" میں باریاب ہوئے۔ رات کے جلسوں میں شرکت ہونے لگی اور شہزادہ کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔ شہزادہ اور مہاراجہ سے تعلقات لوگوں کو کھٹکنے لگے۔ ریاستی سازشیں مشہور ہیں۔ پہلے مہاراجہ کا وظیفہ بند ہوا۔ پھر فانی کا تبادلہ ناندیڑ کر دیا گیا۔ تبادلہ کی منسوخی کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر ساری کوششیں لاحاصل رہیں۔

اب فانی کی معاشی پریشانیوں اور مصیبتوں میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فانی ملازمت سے مسلسل رخصت لینے لگے۔ یہ بڑی آزمائش و ابتلا کا دور تھا۔ علالت، مصارف، قرض خواہوں کے تقاضے، احباب کی بے رخی، اولاد

کی بے حیثیتی۔ یہ حالات تھے کہ اگست ۱۹۴۰ء میں فانی کی رفیقۂ حیات داغِ مفارقت دے گئیں اور ۸ ستمبر ۱۹۴۰ء کو فانی کے شفیق محسن مہاراجہ کشن پرشاد نے بھی عالم آخرت کی راہ لی۔ پریشانیوں اور بے روزگاری نے فانی کی زندگی اجیرن کردی، زندگی کا سورج لبِ بام آگیا۔ اب ملازمت اور روزگار کہاں۔ ہر دَر سے ناکام و نامراد رہے۔ ریڈیو سے ماہانہ دو پروگرام ملنے لگے اور یہی گزر اوقات کا ذریعہ ٹھہرا۔ جنوری ۱۹۴۱ء میں نواب حمیداللہ خان کے جشن سالگرہ کے موقع پر بھوپال میں مشاعرہ ہوا۔ فانی کو خاص طور سے مدعو کیا گیا۔ اپنی علالت کے باوجود بھوپال پہنچے اور شریک مشاعرہ ہوئے۔

مشاعرہ کے بعد فانی بھوپال سے جوش کے ہمراہ لکھنؤ گئے۔ وہاں سے یو۔پی کے مختلف شہروں میں ہوتے ہوئے بدایوں پہنچے۔ اعزہ و احباب سے ملاقات کے بعد حیدرآباد گئے۔ بیمار تو تھے ہی۔ اب علالت کا سلسلہ اور بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ تمام پریشانیوں اور مصیبتوں کے خاتمے کا وقت آ پہنچا اور ۲۷ اگست ۱۹۴۱ء کو ٹھیک پونے چھ بجے شام فانی نے عالمِ جاودانی کی راہ لی۔ اور درگاہِ یوسفین (حیدرآباد) کے مشرقی دروازہ کے چبوترہ پر ۲۸ اگست کو صبح ۱۰ بجے تدفین عمل میں آئی۔ اور "مدفن جناب شوکت علی خان فانی بدایونی"[1] صورت پذیر ہوا۔ استاد جلیل مانکپوری نے مندرجہ ذیل تاریخ کہی۔

لوحِ تربت پہ لکھو مصرعہ تاریخ جلیل
دہرِ فانی سے سدھارے سوئے جنت فانی

۱۳۶۰ھ

فانی کے مندرجہ ذیل پانچ مجموعۂ کلام مختلف اوقات میں اشاعت پذیر ہوئے۔

۱۔ دیوانِ فانی — نقیب پریس، بدایوں ۱۹۲۱ء
۲۔ باقیاتِ فانی — مطبع عزیزی آگرہ ۲۶ء
۳۔ عرفانیاتِ فانی — لطیفی پریس دہلی ۱۹۳۹ء
۴۔ وجدانیاتِ فانی — مطبع دارالکتاب حیدرآباد دکن ۱۹۴۰ء
۵۔ کلیاتِ فانی — حیدرآباد دکن ۱۹۴۶ء

---

[1] اس سے تاریخ انتقال ۱۹۴۱ء نکلتی ہے۔ (قادری)

نواب بہادر یار جنگؒ

نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے جدِ اعلیٰ محمد دولت خاںؒ احمد شاہ درّانی کی یورشوں کے زمانے میں ہندوستان آئے اور ریاست جے پور کے ایک قصبے بوراباٹ میں مقیم ہوئے اور اپنی کارگزاری کے صلے میں راجا سے کچھ جاگیر پائی۔ محمد دولت خان کا تعلق پٹھانوں کے مشہور قبیلے سدوزئی سے تھا۔

۱۸۲۰ء میں اس خاندان نے ریاست جے پور کو خیرباد کہہ کر جنوب کی طرف رُخ کیا اور نواب سکندر جاہ بہادر کے عہد میں یہ خاندان حیدرآباد دکن پہنچا۔ محمد دولت خاں نے اپنے سپاہیانہ اوصاف اور شجاعت و تہوری کی بدولت دربار میں رسائی حاصل کرلی۔ دولت خاں اور ان کے صاحبزادے محمد نصیب کی کوششوں اور جانفشانیوں سے ریاست میں بدامنی کا قلع قمع ہوگیا۔ ان کی ان خدمات کو نظام کے یہاں درجۂ قبولیت حاصل ہوا۔ اور صوبہ برار میں چار لاکھ کی جاگیر عنایت ہوئی! دولت خاں کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے محمد نصیب خاں نے اپنی خاندانی روایات کو حسبِ معمول برقرار رکھا۔ جس کے نتیجے میں وہ مزید جاگیر اور عنایات سے سرفراز ہوئے۔ محمد نصیب خاں کے جانشین ان کے اکلوتے بھتیجے محمد دولت خان (ثانی) قرار پائے اور محمد دولت خاں کے جانشین ان کے لائق فرزند محمد نصیب خاں (دوم) ہوئے۔ یہی محمد نصیب خاں، نواب محمد بہادر خاں، (نواب بہادر یار جنگ مرحوم) کے والد ماجد ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ ۳ فروری ۱۹۰۵ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسۂ عالیہ اور مدرسہ مفید الانام (حیدرآباد دکن) میں ہوئی۔ کچھ دنوں مدرسہ دارالعلوم بلدہ میں بھی تعلیم حاصل کی۔ نواب بہادر یار جنگ طالب علمی کے زمانے میں ایک اوسط درجے کے طالب علم تھے مگر کسے معلوم تھا کہ یہی اوسط درجے کا طالب علم کل برصغیر ہند و پاکستان کا ایک مدبر، اعلیٰ ترین خطیب اور بے مثل

قائم ہوگا۔ ابھی میٹرک کے امتحان کی تکمیل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے مدرسہ کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ مگر ذاتی اور خانگی طور پر تعلیم جاری رہی، علوم اسلامیہ تفسیر، حدیث، فقہ وغیرہ کی باقاعدہ تحصیل کی۔ مولوی سعادت اللہ خاں اور مولوی سعید اشرف شمسی ان کے اساتذہ میں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ کی والدہ کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ نانی نے بڑی توجہ سے پرورش و تربیت فرمائی۔ نواب مرحوم کو اپنے آبائی فنون حرب و سپاہ گری سے بہت تعلق تھا چنانچہ لٹھ چلانے، شمشیر زنی، نشانہ اور تیراکی کی خاص طور سے مشق کی۔

نواب بہادر یار جنگ کی عمر ۱۸ سال کی ہوگی کہ ان کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ انھوں نے تقریباً پانچ لاکھ کا قرضہ چھوڑا۔ نواب بہادر یار جنگ نے بڑی ہمت، استقلال اور پامردی سے حالات کا مقابلہ کیا۔ اور اپنے حسن تدبر و تدبیر اور کار پردازی سے آٹھ سال میں تمام قرض ادا کر دیا اور جاگیر کے حالات بہتر بنا لئے۔

نواب بہادر یار جنگ اسلام کے سچے فدائی اور متبع کتاب و سنت تھے۔ انھوں نے داڑھی کبھی نہیں منڈوائی۔ شادی کے موقع پر انھوں نے ایسی جرأت اور استقلال دکھایا کہ سب لوگ حیران و ششدر رہ گئے۔ غرض احترام سنت کا ان کو بہت خیال تھا۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم مذہبی جذبے سے سرشار تھے۔ ۱۹۳۱ء میں ایک چھوٹے سے قافلے کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ حیدرآباد کے حجاج کے قافلہ سالار تھے۔ اس موقع پر والئ حجاز اور والئ افغانستان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ نواب بہادر یار جنگ حج بیت اللہ اور زیارتِ مدینہ منورہ سے فارغ ہو کر ممالکِ اسلامیہ کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ قافلے کے دوسرے لوگ واپس آگئے۔

نواب بہادر یار جنگ نے ممالکِ اسلامیہ کا مسلسل سفر کیا اور چھ ماہ میں عراق، شام، فلسطین، مصر، ترکی، وسط ایشیا، ایران، افغانستان، وغیرہ ممالک کو بڑے غور سے دیکھا۔ ہر ملک کے علماء، اہلِ سیاست اور دوسرے سربرآوردہ اور اہل الرائے حضرات سے ملاقاتیں کیں۔ مسلمانوں کے حالات کا بڑے غور سے جائزہ لیا۔ نواب مرحوم

نے ہر جگہ اپنے اچھے اثرات چھوڑے۔

ممالکِ اسلامیہ کی سیاحت سے مسلمانوں کی پستی، بے راہ روی، اندھی قیادت و تقلید ان کی خود ناشناسی اور خدا ناآشنائی کے گہرے نقوش نواب بہادر یار جنگ کے قلب پر مرتسم ہوئے۔ نواب مرحوم نے ۱۹۲۷ء میں ایک مجلس "انجمن تبلیغ اسلام" کے نام سے قائم کی۔ مسلسل تین سال تک مملکتِ حیدرآباد کے دیہات و قریات و قصبات کے دورے کئے۔ ان کو اس کام میں بہت سی مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا مگر انھوں نے اپنا کام جاری رکھا۔ خدا نے کامیابی عطا فرمائی۔ کہتے ہیں کہ تقریباً پانچ ہزار غیر مسلم نواب بہادر یار جنگ کے دست حق پرست پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور اس انجمن کے ذریعہ بحیثیت مجموعی تقریباً بیس ہزار غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ نواب مرحوم نے اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ تبلیغ اسلام کے مصارف کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ کاش ہندوستان کے دوسرے امراء اور اہل ثروت بھی اس ذوق سے آشنا ہوتے تو نتائج کتنے شاندار نکلتے۔

نواب بہادر یار جنگ سراپا پیکر عمل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان عیش و عشرت اور بے عملی میں پڑ گئے ہیں۔ ان کی عسکری قوت برباد ہو چکی ہے۔ نواب مرحوم عسکریت کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ انہوں نے آریہ سماجیوں اور ہندوؤں کی عسکری تنظیم آر۔ ایس۔ ایس (راشٹریہ سویم سیوک سنگھ) کے مقابلہ میں خاکسار تحریک کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اور اس میں عملی طور سے بھی شرکت کی۔ اس کے ضبط و نظم کی اسی طرح پابندی کی جس طرح ایک عام رُکن کرتا ہے۔ لیکن بعد میں نواب بہادر یار جنگ اس تحریک سے علیحدہ ہو گئے۔ نواب مرحوم نے اس کی تلافی جماعت رضا کاران سے کی اور اس کی تنظیم کے تحت ہر تعلقے، قصبے اور ضلع میں جسمانی ورزش اور عسکری تعلیم کے مراکز قائم کئے۔

۱۹۲۷ء میں آریہ سماج کی شدھی سنگھٹن تحریک نے ریاست حیدرآباد کو اپنی تخریبی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ایک انتشاری کیفیت پیدا کر دی بعض عاقبت اندیش اور دُور بین حضرات نے اتحاد المسلمین کے نام سے ایک جماعت اس سیلاب کی روک تھام کے لئے قائم کی۔ نواب بہادر یار جنگ نے اس انجمن کی تائید کی اور اس کے استحکام میں پوری سرگرمی

سے حصّہ لیا۔ جب کانگریس کی طرف سے اصلاحات کے نفاذ کے پردے میں مسلمانوں کے اقتدار کو ختم کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ تو نواب بہادر یار جنگ نے بڑی پامردی سے حالات کا مقابلہ کیا اور جب حیدر آباد کی حیثیت ختم کرنے کے لئے وفاق کا مسئلہ سامنے آیا تو اس وقت بھی اس مردِ مجاہد نے تحریر و تقریر کے ذریعے اس کی مضرت کو ظاہر کر کے دم لیا

نواب بہادر یار جنگ نے جب دیکھا کہ کانگریس نے ریاستوں میں دخل اندازی کرنے کے لئے اسٹیٹ کانگریس کا ڈھونگ رچایا ہے تو انہوں نے آل انڈیا اسٹیٹ مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی کیونکہ مسلم لیگ کا دائرہ عمل صرف برطانوی ہند تک محدود تھا۔ اسٹیٹ مسلم لیگ دیکھتے ہی دیکھتے ایک تناور درخت بن گئی۔ ریاستی مسلمانوں کے علاوہ برطانوی ہند کے مسلمانوں نے بھی اس کی خدمات کو پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا غرض کہ بہادر یار جنگ مرحوم کی بصیرت و سیاست کے بہت اچھے نتائج برآمد ہوئے۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم قربانی اور ایثار کا مجسمہ تھے۔ نواب مرحوم نے جاگیر اور خطاب اپنی مرضی سے واپس کیا۔ صورت یہ ہوئی کہ نظام دکن کا فرمان جاری ہوا کہ منصب دار اور جاگیر دار ملازم سرکار متصور ہوگا اور ملازم سرکار کو سیاست میں حصّہ لینے کی اجازت نہیں ہے نواب بہادر یار جنگ مرحوم کے سامنے اب ایک ہی راستہ تھا کہ یا تو وہ جاگیر و خطاب کو سنبھالتے یا مسلمانوں کی سیاسی خدمات انجام دیتے۔ اس پیکرِ ایثار و عمل اور مردِ مجاہد نے جاگیر و خطاب کو ٹھکرا دیا اور خدمتِ خلق کو مقصدِ حیات قرار دیا۔

نواب بہادر یار جنگ اقلیم خطابت کے بادشاہ تھے۔ ان کی تقریر جادو اور سحر کا کام کرتی تھی۔ ہزاروں لاکھوں کے مجمع کو جس سمت چاہتے موڑ دیتے ان کی خطابت کے دوست اور دشمن سبھی معترف تھے۔

نواب بہادر یار جنگ مرحوم ملتِ اسلامیہ کے مخلص رہنما اور اسلام کے سچے فرزند تھے مسلمانوں کی تکلیف و مصیبت سے دل پھٹ جاتا اور کلیجہ شق ہو جاتا سچے عاشق رسولؐ تھے عشقِ رسولؐ ان کا سرمایۂ حیات تھا ان کا قول اور فعل متبع سنت ہوتا تھا۔ قرآن کے عاشق اور شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کے کلام کے شیدائی تھے۔ ۲۵ جون ۱۹۴۴ء کا وہ دن ہے کہ نواب بہادر یار جنگ اپنے رفیق اعلےٰ سے جا ملے اور ان کی بے تاب روح ہمیشہ کے لئے مطمئن ہوگئی

مولانا حسرت موہانی

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی ۱۸۷۶ء میں موہان ضلع اناؤ (یوپی) میں پیدا ہوئے علی گڑھ سے بی اے کی ڈگری لی۔ اس کے بعد سیاست اور ادب کے میدان میں کود پڑے علی گڑھ سے ایک ادبی ماہنامہ "اردوئے معلیٰ" نکالا۔ سیاست میں وہ ایک نڈر اور مخلص سپاہی تھے۔ فرنگی حکومت ان سے لرزتی تھی۔ کانگریس میں سب سے آگے اور مسلم لیگ میں سب سے زیادہ پُرجوش، برِصغیر پاک و ہند کی تاریخ تحریک آزادی میں ان کا ایک خاص اور بلند مقام ہے۔ ۱۳ مئی ۱۹۵۱ء کو مولانا حسرت موہانی کا انتقال ہوا۔

مولانا حسرت موہانی کے معتقد و مرید مولوی سعید اشرف صاحب کچھوچھوی ہیں انہوں نے مختلف اوقات میں مولانا حسرت موہانی کے متعلق جو کچھ بیان کیا۔ ہم نے اسے قلم بند کر لیا، ان کا وہی بیان یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ (محمد ایوب قادری)

رودولی میں شیخ احمد عبدالحق کی مشہور درگاہ ہے۔ حسرت موہانی وہاں بالالتزام عرس میں شرکت کرتے تھے۔ یہ مقام اسٹیشن سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ وہ ہمیشہ پیدل جاتے تھے۔ انگریز کے مخالف ہونے کی وجہ سے کوئی شخص انہیں اپنی سواری میں نہیں بٹھاتا تھا۔ حالانکہ بڑے بڑے امرا اور صاحبِ ثروت سواریوں والے راستے میں ملتے تھے اور وہ لوگ ان کی حیثیت اور مرتبے سے بھی واقف تھے۔ یہی حال لکھنؤ کے لوگوں کا تھا۔

رودولی کے سجادہ نشین محمد حیات صاحب کی طرف سے عرس کے زمانے میں پلاؤ اور قورمے کی ایک عام دعوت ہوتی تھی جس میں ہر شخص شریک ہوتا تھا، مگر

وہ اس سے بھی محروم رہتے تھے، کیونکہ انگریزی حکومت کی نظر میں معتوب و مغضوب تھے،
حد یہ ہے کہ اودھ کے سرکار پرست خاں صاحب اور خاں بہادر خطاب یافتہ حضرات
نے لنگر کا عام کھانا بھی مولانا حسرت موہانی کے لیے بند کروا دیا تھا کہ انگریزی حکومت
ان لوگوں سے ناراض نہ ہو جائے۔ سجادہ نشین صاحب کو بھی حکومت کی طرف سے
"خاں صاحب" کا خطاب ملا تھا۔ وہ ہمیشہ انگریزی حکام کو ڈالیاں اور تحفے بھیجتے
تھے اور ان کے ساتھ شکار کھیلنے جاتے تھے۔ سجادہ نشین صاحب ہمیشہ انگریزی
حکام کی خوشنودی کے خواہاں رہتے تھے۔

ایک مرتبہ مولانا حسرت موہانی کو ردولی میں عرس کے زمانے میں قیام کی دشواری
ہوئی تو وہاں کے ایک غریب آدمی نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس کے یہاں ٹھہر کریں،
چنانچہ مولانا اپنی بیوی کے ہمراہ اس کے گھر چلے گئے، اس کا چھپر کا کچا گھر تھا۔ سعید اشرف
صاحب جب مولانا حسرت موہانی سے ملنے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی بیوی
چھپر کے اندر اکڑوں بیٹھی ہیں، وہاں کوئی فرش یا چارپائی نہ تھی۔ میزبان نے بیسنی روٹی
پیش کی جسے سعید اشرف صاحب اور مولانا نے کھایا اور انہوں نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے
مولوی سعید اشرف صاحب سے مختلف مسائل پر گفتگو کی۔

مولانا حسرت موہانی ردولی سے لکھنؤ گئے، سعید اشرف صاحب ان کے ہمراہ تھے،
اسٹیشن پر مولوی شاہ جعفر صاحب پھلواروی مل گئے، انہوں نے مولانا حسرت موہانی کو
یکے میں بٹھانا چاہا۔ مولانا نے بیٹھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ بھئی ہم تو پیدل جاتے
ہیں، پیدل ہی جائیں گے، چنانچہ شاہ جعفر صاحب پھلواروی بھی ساتھ ساتھ پیدل
گئے۔ یہ قافلہ وصل بلگرامی کے یہاں پہنچا، انہوں نے دو مرغیاں پکوائیں، مولانا
حسرت موہانی نے مرغی نہیں کھائی، دوسرے لوگوں نے کھائی۔

وصل بلگرامی کے یہاں ارباب علم و فضل کا خوب جمگھٹا رہتا تھا اور علمی و ادبی
صحبتیں جمتی تھیں جن میں امتیاز احمد اشرفی، ریاض احمد خیر آبادی، نیاز فتح پوری

اور مولانا حسرت موہانی جیسے ارباب فضل و کمال شریک ہوتے تھے۔ اوّل الذکر امتیاز احمد اشرفی صاحب علم و فضل تھے اور جذبۂ حریت سے سرشار۔ انگریزی استعمار سے ان کو سخت نفرت تھی، انہوں نے نمک بنانے کی تحریک میں حصہ لیا، معافی نہیں چاہی اور قید کاٹی جیل سے رہا ہو کر آئے تو منہ سے خون آنے لگا اسی بیماری میں فوت ہوگئے۔ (نگار کے مومن نمبر میں ایک مضمون پر ان کو انعام ملا۔)

مولانا حسرت موہانی، راجا محمود آباد، راجا سلیم پور اور فرنگی محل سب جگہ جاتے تھے۔ مگر ہمیشہ پیدل، وہی ان کی قلندرانہ شان رہتی، میلی ٹوپی پھٹی جوتیاں، موٹا کرتا۔ مگر کیا مجال جو تیوروں میں کوئی کمی آئے۔

۱۹۳۷ء میں جب پہلی مرتبہ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں بنیں تو یوپی کی کانگریس حکومت نے گاؤکشی کے امتناع کا خیال ظاہر کیا، مولانا حسرت موہانی نے اس سے اختلاف کیا اور مختلف مقامات پر اس کے خلاف تقریریں کیں اور کہا کہ اقتصادی طور سے مسلمان کو گوشت کھانے اور گاؤکشی میں فائدہ ہے، اس سلسلے میں مولانا فیض آباد بھی پہنچے اور اسی موضوع پر دھواں دھار تقریر کی۔ تقریر کے بعد کان پور واپس ہونے کے لیے اسٹیشن آئے، ان کے پیچھے پیچھے فیض آباد کے مشہور تاجر محمد یٰسین صاحب پہنچے، مولانا حسرت موہانی سے ایک دن قیام کی درخواست کی اور ہر طرح خوشامد کی، مگر مولانا کسی طرح ٹھہرنے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اسی دوران ایک شخص نے آگے بڑھ کر ان سے عرض کیا کہ حضرت اصل بات یہ ہے کہ آج قوالی کا پروگرام ہے وہ جو کیا آ رہی ہیں، ان میں ایک قوال مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے قوال محرم علی کی طرح گاتا ہے، اس وجہ سے آپ کو ٹھہرایا جا رہا ہے۔ یہ سنتے ہی مولانا نے کہا کہ بھئی، پہلے سے کیوں نہیں بتایا۔ اب تو ٹھہرنا ہی پڑے گا۔ مولانا قوالی کے بہت شوقین تھے۔ یہ واقعہ مولوی سعید اشرف صاحب کے سامنے کا ہے۔

ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد جب یوپی گورنمنٹ نے اسمبلی میں زمینداری کے خاتمے کا بل پیش کیا تو سب سے پہلے مولانا حسرت موہانی نے اس بل کی

مخالفت کی۔ اور کہا کہ حکومت کا مقصد مسلمانوں کی خوش حالی کو ختم کرنا ہے۔ کیوں کہ اس صوبے میں بیشتر زمینداریاں مسلمانوں کی ہیں۔ ہاں ساتھ ہی ساتھ اگر ہندو کی سرمایہ داری بھی ختم کی جائے تو زمینداری کے خاتمہ کا جواز ہے ورنہ نہیں۔ میں اس بل کی پُر زور مخالفت کرتا ہوں۔ اگرچہ میں پکا کمیونسٹ ہوں۔

مولانا حسرت موہانی دو مرتبہ روس بھی گئے، پہلی مرتبہ جب گئے تو وہاں مولانا عبیداللہ سندھی موجود تھے اور انہیں نے لینن سے مولانا حسرت موہانی کا تعارف کرایا تھا۔ جواہر لال نہرو کے مقابلے میں لینن، مولانا حسرت موہانی سے زیادہ متاثر ہوا۔

مولوی سعید اشرف کہتے ہیں کہ مولانا حسرت موہانی کا ارادت مند اور شاگرد ہوں یعنی سیاست میں ان کا مقلد ہوں۔ مولانا حسرت موہانی مائل بہ اشتراکیت تھے۔ مگر اسلام کے سچے پیرو، ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

درویشی و انقلاب مسلک ہے میرا صوفی مومن ہوں، اشتراکی مسلم

لازم ہے کہ ہو ہند میں آئینِ سودیت
دو چار برس میں ہو کہ دس بیس برس میں

اچھا ہے اہل جور کئے جائیں سختیاں
پھیلے گی یوں ہی شورشِ حبِ وطن تمام

قاضی لطافت حسین بدایونی

بدایوں، روہیل کھنڈ (یوپی) کا مشہور قدیم تاریخی شہر ہے۔ ہند و پاکستان میں مسلمانوں کے اقتدار کے شروع زمانے ہی سے یہ شہر اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز بن گیا تھا۔ اس شہر سے بڑے بڑے علماء، صلحاء اور شعراء و حکماء اُٹھے۔ ان کے کارناموں سے تاریخ کے ابواب روشن ہیں۔ قاضی لطافت حسین بدایونی، بدایوں کے مشہور عباسی خاندان کے رُکن تھے۔ ۲۴ رمضان ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء کو بدایوں میں پیدا ہوئے۔ عام رواج کے مطابق اگرچہ اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ مگر تجربہ اور عمل کی دُنیا میں کہیں زیادہ کامیاب رہے۔ عمل، کوشش اور جدوجہد ان کی زندگی کے اُصول رہے۔ مشکلات سے گھبرائے نہیں۔ دشمنوں سے نبرد آزما رہے اور مختلف ملازمتیں کیں۔ مگر ۱۹۲۵ء سے صحافتی زندگی اختیار کی۔ اور بدایوں جیسے چھوٹے سے شہر سے "العدل" نامی ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا، اور یہ اخبار کم و بیش پچیس سال نہایت کامیابی کے ساتھ چلتا رہا۔

قاضی لطافت حسین بدایونی ۱۹۵۲ء کے اواخر میں پاکستان آ گئے، یہاں بھی اُنہوں نے باوجود ناسازگاریٔ حالات کے پُوری جدوجہد شروع کر دی، اور بڑی حد تک اِن کو کامیابی بھی ہوئی۔ "العدل" کے جاری کرنے کا منصوبہ بنایا حتیٰ کہ "ڈیکلریشن" بھی حاصل کر لیا۔ مگر ۵ نومبر ۱۹۵۵ء کو پیغامِ اجل آگیا۔ اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون)

قاضی لطافت حسین بدایونی نے اپنے خود نوشت حالات بعنوان "آپ بیتی" لکھے ہیں۔[۱]

---

[۱] قاضی مرحوم کی "آپ بیتی"، قلمی صورت میں ان کے صاحبزادے منیر الاسلام بدایونی صاحب کے پاس محفوظ ہے۔

واقعات سنہ وار لکھے گئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ایک عام آدمی محنت و کوشش اور جدّ وجہد سے اپنی زندگی کو کس قدر کامیاب بنا سکتا ہے۔ قاضی صاحب مرحوم "بادوستاں تلطف" پر عمل اور "بادشمناں مدارا" سے گریزاں تھے۔ انہوں نے اپنے اعزہ، احباب اور رشتہ داروں کی حتی الوسع مدد اور سفارشیں کیں۔ مگر اُن کے یہاں اجتماعی یا قومی نقطۂ نظر یا مقصد کا فقدان نظر آتا ہے۔ صحافتی زندگی کے پُورے دَور میں حکومت سے موافقت اور اس کے مقصد سے ہم آہنگی ان کا طریقہ عمل رہا۔ خان صاحب کا خطاب حاصل کیا۔ اس "آپ بیتی" پر سید الطاف علی بریلوی مدیر "العلم" کراچی نے ایک جامع اور مختصر مقدمہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ اس کا ایک حصّہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"سوانح عمری خود نوشت ہو یا کسی دوسرے کی عموماً بڑے آدمیوں کی لکھی جاتی ہے۔ بڑے آدمی بادشاہ، وزراء، فاتح، مدبّر، سرمایہ دار، مذہبی رہنما محققین اور موجدین ہوتے ہیں۔ جن کی تعداد عددرجہ محدود ہوتی ہے۔ ہمارے سماج میں غالب اکثریت ان لوگوں کی ہے۔ جن کے کوائف حیات میں بظاہر کوئی ندرت نہیں ہوتی۔ اس لیے ہمارے صاحبانِ قلم ان کو عام طور پر کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ایک غریب و متوسط الحال شخص کن حالات میں اپنی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ ترقی کی راہ میں کیا کیا موانع ہوتے ہیں اور اِن موانع کو دُور کرنے میں اُسے کیسی کیسی ریاضتیں کرنی پڑتی ہیں۔ ابنائے زمانہ چھوٹے اور بڑے اس کے ساتھ کس طرح پیش آتے ہیں۔ اچھے سلوک کا اس کے کردار کی تعمیر پر کیا اثر پڑتا ہے اور بُرا سلوک اس کو راہِ نیک سے کیونکر بھٹکا دیتا ہے۔ اہلِ ثروت اور صاحبانِ اقتدار کے لیے جو چیزیں معمولی اور غیر اہم ہوتی ہیں۔ ان کے حصول کے لیے ایک عامی کو کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ مثلاً اپنے اور اہلِ خاندان کی قوت لایموت کے حصول کے واسطے سو یا دو سو یا چار پانچ سو ماہوار کی آمدنی مہیا کرنا یا جسم و جان کی واجبی راحت کے لیے اوسط درجہ

کا مکان بنوا لینا، بچوں کی تعلیم اور ان کو برسرِ کار کرا دینے کی جہد میں فائزالمرام ہونا، اہلِ محلہ اور اہلِ شہر کی نگاہوں میں کاروباری کامیابی اور اپنے حُسن اخلاق سے عزت و وقعت حاصل کر لینا، ایک عام آدمی کے معمولی کارنامے نہیں ہوتے۔

اگر ایسے شخص کو کامیابی اس حد تک حاصل ہو جائے۔ کہ وہ مقامی میونسپل بورڈ یا ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبری حاصل کرے۔ یا حکومت کسی خطاب یا اعزازی عہدہ سے بھی سرفراز کر دے، تو سمجھنا چاہیئے کہ بڑا کام ہُوا۔ اور دوسروں کے واسطے اپنی زندگی قابلِ تقلید ہو گئی۔

جناب قاضی لطافت حسین دلؔ ہاشمی صاحب بدایوں کے ایک پشتینی ذی علم خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ لیکن ان کو کوئی معقول جائیداد یا ایسا سرمایہ ورثہ میں نہ ملا تھا۔ جس سے زندگی کی منزلیں آسانی سے طے ہو جائیں۔ لہٰذا پوری عمر شدید محنت میں گزری، بالآخر انہوں نے اپنے آپ کو ایک شہرت یافتہ اخبار نویس، خطاب یافتہ معزز شہری اور ایک فارغ البال بزرگ خاندان بنا کر دم لیا

کئی بار سخت جسمانی حادثے پیش آنے سے ایک ٹانگ بیکار ہو گئی ان کی اولوالعزمی اور دوا دوش میں کمی نہ آئی۔ بدایوں اور اضلاع ریل کھنڈ کے علاوہ لکھنؤ، الہ آباد، دہلی اور اب کراچی ان کی زبردست تگ و تاز کی جولانگاہ ہے۔

۷۳ سال کی عمر ہے۔ مگر دل جوان ہے۔ ہمت بلند ہے اور عزائم بے پناہ ہیں۔ بس نہیں چلتا، کہ آسمان میں تھگلی لگالیں۔ مشاغل تمام تر لکھنے پڑھنے اور صحافی نوک جھونک کے جن کی بدولت رام پور کا دربار ہو یا گورنر یو پی کا، ہمیشہ ممتاز و مفتخر رہے۔ اور اب بھی مولوی خصلت حسین صابری ہوں یا

مولوی محمد سلیمان صاحب بدایونی کسی کی مجال نہیں جو انہیں ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ سکے۔ ان کے ہاتھ میں ایک تیز و طرار قلم جادو رقم جو ہے، ظاہر میں سخت و کرخت، لیکن دل بچوں کی کی طرح معصوم، حق کی حمایت میں فیاض، اور ناحق کی بیخ کنی میں بے جگر، ہر مصیبت زدہ کی خدمت کے لیے آمادہ اور ایثار مجسّم، لیکن ناشکروں اور نیکی کا بدلہ بدی سے دینے والوں کے لیے ظالم و بے درد، لوگ نیک کاموں کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اور تشدّد کو خواہ وہ کیسا ہی حق بجانب ہو یاد رکھتے ہیں۔ اس لیے ممکن ہے۔ ان کے باطن کی شرافت ظاہر بیں نظروں سے پوشیدہ ہو، لیکن ہاشمی صاحب کی یہ سوانح عمری ان کے متعلق نہ صرف ہر قسم کی غلط فہمی کو دُور کر دے گی۔ بلکہ اس کے ناظرین بعد مطالعہ مجبور رہوں گے، کہ ان کی دل سے عزت کریں اور ان سے محبت کریں۔

ہاشمی صاحب نے ہر واقعہ کو نہایت سچائی اور صاف بیانی سے تحریر کیا ہے۔ اگر ایک طرف اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو کھول کھول کر بیان کیا ہے تو دوسری جانب اپنے مخالف ہمعصروں کے افکار و اعمال پر بھی بے لاگ تبصرہ کیا ہے، اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

کتاب کی زبان سلیس اور پُر اثر ہے۔ اور ایک قسم کے ڈرامائی انتظار و اشتیاق کی کیفیت قدم قدم پر پیش آتی ہے۔

اب قاضی لطافت حسین ہاشمی بدایونی کی ,, آپ بیتی،، کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

,, مختار کا بچہ ہے یہ،، اس تاریخی مادہ کے لحاظ سے ۱۳۰۲ھ سال پیدائش رہا۔ اور وہ اس طرح پر منطبق ہوتا ہے۔ کہ ۸ جولائی ۱۸۸۵ء یوم چہار شنبہ ۲۴ رمضان ۱۳۰۲ھ میں حسبًا ہاشمی عباسی ہوں تو نسبًا صدیقی حمیدی . . . والد صاحب قبلہؒ نے قانون

کا امتحان ۱۸۸۵ء میں پاس کیا اور ضلع بدایوں میں فوجداری میں کام شروع کر دیا اور بحمد اللہ اپنے زمانے میں کافی شہرت نام اور ہر دلعزیزی حاصل کی۔ . . . میری رسم بسم اللہ خوانی قاضی عبد السلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حقیقی بھائی مولوی عبد الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی۔ اس کے بعد مکان پر معمولی اردو فارسی مولوی محمد شاہ مرحوم نے پڑھائی۔ فارسی اور اردو کی اعلیٰ تعلیم کے واسطے مولوی احمد حسین صاحب ساکن بڑا دروازہ شہباز پور (بدایوں) جو اس زمانے کے فارسی اور اردو کے قابل ترین اُستادوں میں شمار کیے جاتے تھے، کی خدمات والد صاحب مرحوم نے حاصل فرمائیں۔ پھر وقت آنے پر فارسی کورس کی کتابیں مولوی غلام رسول صاحب نے وقتاً فوقتاً پڑھائیں۔ جو اپنے زمانے میں اس کام کے لیے قابل ترین مولوی تھے۔ کلام مجید مجھے اوائل ہی میں حافظ چھوٹے ساکن محلہ سوتہ نے باقاعدہ پڑھایا۔ میرے والد کے حقیقی چچازاد بھائی مولوی قوی الاسلام مرحوم نے جو فارسی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، میری فارسی کی اعلیٰ تعلیم کلیتاً اپنے ہاتھ میں لی، اور سب کچھ پڑھایا حصولِ ملازمت کے لئے انگریزی تعلیم لازمی و لابدی تھی۔ اس لیے انگریزی کی طرف توجہ کی گئی۔ اور اس کی ابتدا جناب سید محفوظ علی صاحب نے فرمائی۔

انگریزی کی تعلیم مختلف اساتذہ سے حاصل کی۔ ان میں دو حضرات محفوظ علی اور شوکت علی خاں فانی بدایونی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انگریزی کا امتحان پاس نہ کر سکے، ۱۷ - ۱۸ سال کی عمر میں شادی ہوگئی۔ اور ملازمت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ پہلے قصبہ آنولہ میں نوٹیفائیڈ ایریا کے سکرٹری مقرر ہوئے، اس کے علاوہ کئی اور ملازمتیں کی۔ ہر جگہ کامیاب ہوئے۔ قاضی صاحب کے مخالفین کو منہ کی کھانی پڑی۔ اکتوبر ۱۹۲۵ء سے قاضی لطافت حسین صاحب نے میدانِ صحافت میں قدم رکھا۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا۔

"۱۹۲۵ء تو رواں دواں تھا ہی، کہ اکتوبر کا مہینہ بھی آگیا۔ ڈسٹرکٹ بورڈ میونسپل بورڈ کی ممبریوں اور چیئرمینیوں کا خیال، نیز کونسل کی ممبری کا اشتیاق

عروس ممبری کے شیدائیوں کے دل دجگر میں چٹکیاں لینے لگا، اور پارٹیاں بننے لگیں۔ جب یہ شے بھی پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے تو پارٹی کے پاس اخبار اور پریس لازم و لابُد ہو جاتا ہے۔ بدایوں سے ایک عرصہ دراز سے "ذوالقرنین" نکلتا تھا۔ خان بہادر مولانا مولوی فصیح الدین صاحب جو اس وقت کونسل کے ممبر تھے اور مولوی اکرام عالم صاحب اور ان کی پارٹی کے واسطے یہ اخبار کافی تھا۔ دوسری پارٹی جس میں مولوی محمد سلیمان صاحب، مسٹر برج لال بدھوار، خان بہادر شیخ سید محمد عرف میکو میاں، خان بہادر مولوی وحید بخش، مولوی ابو الحسن قادری، شیخ وحید احمد محمد یحییٰ صاحب وغیرہ شامل ہوئے۔ اب اس پارٹی کو ایک اخبار کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس احساس کے بعد ایک ایسے ایڈیٹر کی ضرورت پیش آئی۔ جو دوسری پارٹی کا مدِمقابل ہو کر میدان میں آسکے۔ مولوی محمد سلیمان صاحب سے میرے تعلقات دوستی سے گزر کر حقیقی بھائیوں کے سے تھے، اور ان کی وجہ سے میں ہر بات پر آمادہ تھا۔ پس "قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند" ہو گیا۔ اب اخبار کے نام کی تجویز ہوئی۔ تقریباً ہفتہ عشرہ غور و فکر میں گزرا۔ کیونکہ استاذی میر محفوظ علی کسی اعلیٰ و بالا نام کی فکر و جستجو میں تھے۔ جب یہ مہم کسی طرح سر ہوتی نظر نہ آئی۔ تو میں نے عرض کیا۔ کہ آج ڈیکلریشن داخل ہو جائے گا۔ فرمایا کیا نام ہوگا۔ عرض کیا گیا۔ اللہ جانے کچہری پہنچ کر جس نام کا بھی ڈیکلریشن داخل ہو جائے بس وہی نام سمجھے، اب ناموں کے پرچہ پہ غور کرتا ہوا میں کچہری پہنچا اور "العدل" کا ڈیکلریشن داخل ہو گیا۔ ۱۹ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو پہلا پرچہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو ہی گیا۔ "العدل" کا عالم وجود میں آنا تھا۔ کہ دوسری پارٹی پر کچھ عجیب کیفیت طاری و ساری ہوئی . . . . فریق ثانی میرے سب و شتم پر اُتر آیا۔ اور ایک غیر معروف شخص کو مدا

میں سے آیا۔ اور "العدل" کے ہر پرچہ کے بعد ایک پمفلٹ "اڑی تڑی"
کے نام سے کارٹون اور غیر شریفانہ نام کے ساتھ منظر عام پر ہوتا تھا۔
گویا کہ سب اڑی تڑی قاضی کے سر پڑی۔ میں نے اس اڑی تڑی کو
بے معنی بنا کر اس کا جواب خاموشی ہی مناسب سمجھا . . . اب "العدل"
کا کلیتاً بار مجھ پر تھا۔ اور اس کی مستقل میونسپلٹی کی روئیداد کی اشاعت
اور ہمنوں کی آمدنی اور کچھ بیرونی احباب و اصحاب کا کرم تھا اور "العدل"
اب ہر طرح بے نیاز تھا . . . . . . مسٹر بنیدر سول مجسٹریٹ ضلع
میرے حال پر انتہائی کرم فرماتے تھے۔ یہانتک کہ انہوں نے ۱۹۲۷ء کے
آخر میں مجھے پستول کا لائیسنس عطا فرمایا۔ نواب صاحب رام پور کو "العدل"
نوازی کے سلسلہ میں چٹھی لکھی۔ اس چٹھی کے ذریعہ میں رام پور پہنچا۔ اور
مستقلاً سالگرہ کے موقع پر ریاست کا مہمان ہونے لگا۔

۱۹۲۵ء کے بعد قاضی لطافت حسین نے ہر سال کے واقعات سنہ وار لکھے
ہیں۔ ۱۹۲۹ء کے ضمن میں اپنے دوست مولوی محمد سلیمان صاحب بدایونی
کے متعلق لکھتے ہیں۔

۔ میرے رفیق و شفیق دوستوں میں ایک صاحب ایسے ہیں۔ جنہیں
میں اپنی ذات بلکہ اس سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ مگر یہ ذات شریف حکام
سے ہمیشہ گریزاں اور پراں رہتے تھے۔ اس سال کے آخر میں ایک
دن بنالال (کلکٹر) سے ان کا ذکر آگیا۔ اور ساتھ ساتھ کلکٹروں اور حکام
سے کھنچے اور تنے رہنے کا بھی ذکر آیا۔ میں نے کہا۔ ان کو قبضے میں لانے
کی ایک ترکیب ہے بتادوں؟ فرمایا کیا؟ عرض کیا نتھی (جیم) کر دیجئے
تعجب سے فرمایا کیسے؟ میں نے کہا آپ کے پاس چار کڑی کی ایک
زنجیر ہے۔ اس میں جکڑ دیجئے۔ فرمایا۔ توڑ کر تو نہیں بھاگیں گے؟ عرض کیا
کس کی ہمت ہے یہ ذمہ داری مجھ پر سہی۔ بھلا یہ اس زنجیر کی کڑیاں بتادوں تو اچھا

(ا) خطابات (۲) آنریری مجسٹریٹی (۳) آنریری اسسٹنٹ کلکٹری (۴) آنریری منصفی۔ یہ مثاس زنجیر کی کڑی زبے میں جکڑے ہوئے تھے۔

"۱۹۳۲ء کے واقعات میں لکھتے ہیں۔

عبدالحلیم صاحب بدایوں میں ڈسٹرکٹ جج تھے، اور انتہائی نیک طینت حاکم تھے۔ ان کی انتہائی نیکی سے ایک ذات شریف ایسا فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے، کہ ایک نواب صاحب کا آٹھ ہزار کا نقصان ہو رہا تھا میں نے جج صاحب کو خط لکھ کر باخبر کیا، اور پھر خان بہادر مولوی وحید بخش کو درمیان میں لایا۔ غرضیکہ بہت کدو کاوش کی۔ اور تقریباً آٹھ سو کے خسارہ کے بعد وہ نواب صاحب آٹھ ہزار کے نقصان سے نجات پا گئے۔ اور یہ دلچسپ واقعہ زبان زد خاص و عام ہو گیا۔۔۔۔ ایک دن میں اپنے مکان سے مولوی اکرام عالم صاحب کے مکان کی سمت کو جا رہا تھا۔ ابھی مولوی صاحب کے مکان کا دروازہ نہیں آیا تھا۔ البتہ وکالت خانہ کا کمرہ سامنے تھا۔ میرے ایک بزرگ اپنا کان پکڑ کر کہہ رہے تھے۔ چودھری صاحب میں کچھ دخل نہیں دوں گا۔ ہاں (میری طرف اشارہ کر کے) اگر مقدمہ ان کے اجلاس میں پہنچ جائے، تو تمہارے چار سو روپے ضرور وصول ہو جائیں۔۔۔۔ اب میں مولوی اکرام عالم صاحب کے وکالت کے کمرہ میں پہنچا، تو معلوم ہوا کہ ایک صاحب نے ان چودھری صاحب سے کچھ اراضی خریدی تھی، اور چار سو روپے اپنے پاس روک لئے تھے کہ قبضہ ملنے پر دیدئے جائیں گے، اور رجسٹری کرائی جائے گی۔ کھیت میں سے فصل کٹ گئی۔ یہ اراضی بھی اپنی اراضی میں شامل کر لی۔ اب گویا چودھری صاحب نے قبضہ بھی دے دیا۔ اس قبضہ کو بھی سال گزر گیا اب رو ۔ دینے کی ضرورت ہی کیا رہی، میں نے مکان پر پہنچ کر قریب کی اشاعت میں "العدل" میں ایک شذرہ دھر گھسیٹا۔ کہ اگر جلد تر حق بحقدار

رسید نہ ہوا ۔ تو ہمیں ڈر ہے ۔ کہ اشہب قلم صفحۂ قرطاس پر نہ دوڑنے لگے
کچھ ہی دن گزرے ہوں گے ۔ کہ خاکسار کی ذراسی جنبش قلم سے چودھری
صاحب کی تقریباً ہضم شدہ رقم وصول ہوگئی ۔

۱۹۳۳ء کا ایک واقعہ لکھتے ہیں ۔

" اس سال جامع مسجد بدایوں میں مولوی عبدالقدیر صاحب کی قیادت
میں جلسہ ہوا ۔ جس کی غرض وغایت جامع مسجد کی مرمت کے لیے تدابیر
سوچنا تھا ۔ اس جلسہ میں شہر کے حمال مشتعل ہو گئے اور دوسرے دن
شہر کے ایک لڑکے کو جو میرے ساتھ کچہری سے آرہا تھا میونسپلٹی کے
پھاٹک کے باہر زدوکوب کیا ۔ جس کے سلسلہ میں مدرسہ قادریہ میں
چاقو چلنے کا مقدمہ عدالت تک پہنچا ۔ دو پارٹیاں قرار پاکر مچلکہ ضمانت
کا مقدمہ اجلاس آغا مرزا صاحب ڈپٹی کلکٹر میں ایک عرصہ تک چلتا رہا "

۱۹۳۷ء میں قاضی لطافت حسین صاحب کو خان صاحب کا خطاب ملا ۔

۱۹۴۱ء اور ۱۹۴۲ء میں " العدل " کے دو " وار نمبر " نکالے ۔ ۱۹۴۷ء کے سلسلہ
میں قاضی لطافت حسین صاحب لکھتے ہیں ۔

" یہ سال دُنیا والوں کے واسطے سعد بھی تھا ، اور نحس بھی ۔ سعد تو اس
لئے کہ ہندوستان کو من مانتی ملی تھی ۔ اس سال کے مبارک ہونے میں
کس کو کلام ہو سکتا ہے ۔ اور ہندوستان کے تقسیم ہونے سے جو کُشت و
خُون ہوا ، اس لحاظ سے نحس ۔ ۔ ۔ ۔ بہر حال ۱۵ / اگست ۱۹۴۷ء کو آزادی
مل گئی ۔ اور آزادی کی خوشیاں منائی گئیں ۔ میں نے بھی " العدل " کا آزادی
نمبر شائع کیا ۔ آزادی کے بعد خوب ہنگامے ہوئے ۔ ۔ ۔ یہ آزادی ہندوستان
میں اقلیت کے واسطے بدنصیبی ثابت ہوئی ۔ ہر جگہ کرفیو آڈر ______ کا
دَور دَورہ تھا "

جنوری ۱۹۴۸ء میں گاندھی جی کا قتل ہوا ۔ " العدل " کا گاندھی نمبر بہ سرپرستی شمیم

رضا علی خاں صاحب نواب رام پور نکالا گیا۔ جس کی خریداری گورنمنٹ میں بہت ہوئی۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں "العدل" کا جوبلی نمبر شائع ہوا، اور اپریل ۱۹۵۱ء میں قاضی لطافت حسین صاحب عارضی طور پر کراچی (پاکستان) وارد ہوئے۔

جنوری ۱۹۵۲ء میں قاضی لطافت حسین ہاشمی صاحب مستقل طور سے کراچی تشریف لے آئے، تقریباً چار سال زندہ رہے۔

قاضی لطافت حسین صاحب نے آپ بیتی کے اختتام پر بعض عنوان کے تحت کچھ حالات لکھے ہیں۔ ان میں سے "میرے کچھ اصول" نقل کئے جاتے ہیں جن سے قاضی لطافت حسین کے سیرت و کردار کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

(۱) سچ کے سوا دروغ گوئی سے کبھی کام نہ رکھا۔ اگر کوئی بات قانونی خانہ پُری کے لئے زبانِ قلم پر آئی ہے تو انتہائی مجبوری سے محض کاغذ کا پیٹ بھرنے کو، یہ معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔ وہ رحیم و کریم معاف کرنے والا ہے اور ایک یہ کیا۔ میرا رونگٹا رونگٹا گناہگار ہے۔ اور ہر لمحہ گناہ میں گزرا ہے اور گزرتا ہے جس کے لئے بصد الحاح و زاری معذرت خواہ ہوں اور امیدِ رحمت و بخشش رکھتا ہوں میں علیٰ رؤس الاشہاد یہ کہنے کو تیار ہوں کہ کسی دشمن کو نقصان پہنچانے کو بھی میری زبان یا زبانِ قلم پر غلط لفظ نہیں آیا۔ میری سب سے بڑی کمزوری یہ رہی ہے۔ کہ مجھ میں انتقامی مادہ زیادہ ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ جو بات کی، وہ ڈنکے کی چوٹ کی، اگر میں نے دشمن کے لئے بھی کوئی بات کہی، تو بھی صحیح کہی۔ ساتھ ساتھ کلکٹر وغیرہ سے یعنی حکام سے یہ کہا۔ کہ میرے اور زید کے تعلقات خراب ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ کہ میں عداوت میں غلط کہتا ہوں، آپ باور نہ کیجئے۔ اور تحقیقات کیجئے۔ خدا کے فضل سے ہمیشہ میری ہی بات بالا رہی۔

(۲) جتنے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ آئے۔ سب مہربان اور کرم فرما ہوئے۔ میرے مخالفین نے ہمیشہ یہ شہرت دی۔ کہ میں حاکم پرگنہ صاحبان کی ڈسٹرکٹ

مجسٹریٹ سے بُرائی کرتا ہوں، مگر جب تجربہ نے انہیں بتایا کہ میں اِن صاحبان کے لئے مفید ہوں نہ کہ مُضر، تو یہ صاحبان میرے انتہائی کرمفرما تھے۔

(۳) جب کسی انتہائی دُشمن نے بھی مجُھ سے رجوُع کیا، تو نہایت خلوص اور سچائی سے اس کی مدد کی۔ کبھی کسی دوسرے کے گھر کو رزم گاہ نہ بنایا جب دُشمن اپنے گھر پر آیا تو اپنے مقدور بھر خاطر و تواضع کی۔

(۴) میں نے جب اخبار نکالا۔ تو سب سے پہلے واسطہ نبید رسول (کلکٹر) سے پڑا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ کہ آپ گورنمنٹ کے خلاف خوُب لکھئے کچھ پرواہ نہ کیجئے۔ مگر میرے ہی نہیں، بلکہ کسی کلکٹر کے خلاف آپ نہ لکھیں اب میں نے گورنمنٹ اور کلکٹر کے خلاف لکھنے کے نتیجہ پر غور کیا۔ تو پہلے کچھ واہ واہ ہوتی ہے۔ پھر اخبار اور ایڈیٹر دونوں کو نقصان پہنچنا یقینی ہے اور ایڈیٹر گورنمنٹ کے موافق رہ کر پبلک کے خوُب کام آسکتا ہے اور اپنے لئے بھی خاطر خواہ مفید ہو سکتا ہے۔

(۵) میں نے ایک اصوُل یہ بھی رکھا کہ لیڈر کبھی نہ بنا۔ اور کبھی چندہ کے لئے حتیٰ کہ اخبار کے چندہ کے لئے بھی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا۔

(۶) مجھے سوائے خُداوند عالم کے دُنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی ڈر نہیں لگتا۔ ہمیشہ جُرأت اور دلیری سے بات کہی، بہ اقتضائے بشریت دو مرتبہ اس کے خلاف ہوُا، تو کچھ عزت نہ ہوئی بلکہ خفت ہوئی۔

(۷) میں حکام سے بھی کسی اصوُل کے تحت ملا۔ گورنر صاحب سے علاوہ بدایوں کی آمد اور بریلی و بدایوں کی پارٹیوں کے، سال میں ایک مرتبہ، کمشنر سے مہینے میں ایکبار، میں کبھی کسی ڈپٹی کلکٹر کے مکان پر اس وقت تک نہ گیا جب تک پہلے کہیں تعارف نہ ہو گیا ہو، اور اس کُلیہ سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مستثنےٰ تھے۔

عبدالعلی خاں

سنبھل، مُراد آباد کے ضلع میں ایک قدیم تاریخی قصبہ ہے۔ سکندر لودی بسلسلہ سیر و شکار تقریباً پانچ سال مقیم رہا۔ اس موجودگی کی وجہ سے سنبھل علماء و فضلاء کا مرکز بن گیا۔ ۹۰۷ھ (۱۵۰۱ء) میں بادشاہ نے ایک شرعی مسئلہ کے تصفیہ کے لیئے سنبھل میں جلس مذاکرہ منعقد کی تھی۔ جس میں دُور دُور سے علماء آکر شریک ہوئے۔ دَورِ اکبری میں میاں حاتم سنبھلی بڑے یگانۂ روزگار شیخ ہوئے ہیں۔ مُلّا عبدُالقادر بدایونی، میاں حاتم کے شاگرد تھے۔ آخر دَور میں سنبھل میں مُلّا حمید مفتی، مفتی عبدالسلام، مولوی محمد حسین شمس العلماء خلیل احمد اور مولوی سعادت اللہ بنی اسرائیلی نامور علماء گزرے ہیں

عبدالعلی خاں سنبھل میں پیدا ہوئے۔ سنبھل اور مراد آباد میں تعلیم پائی۔ فارسی کی تحصیل کے بعد انگریزی تعلیم حاصل کی۔ تکمیل تو نہ کر سکے۔ مگر ایسی قابلیت بہم پہنچائی۔ کہ زندگی میں ہمیشہ کامیاب رہے۔ مُلک کے نامور ترین زعماء سے تعلق رہا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے ایک مدّت تک پرائیوٹ سیکرٹری رہے۔ مُلک کے بڑے بڑے مشہور و معروف لیڈروں سے واسطہ رہا۔ ان کے خلوص و للہیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع مِلا۔ "اصحابِ جُبّہ و دستار" سے بھی تعلق رہا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ ان کی قبا کا ہر بند اور دستار کا ہر پیچ دُنیا سازی اور مکر و فریب سے عبارت ہے۔

عبدالعلی خاں نے اپنے حالاتِ زندگی مختصر طور پر قلمبند کئے ہیں[1]۔ اس ضمن میں

---

[1] عبدالعلی خاں کے یہ حالات "روزنامہ جنگ کراچی" کی کئی اشاعتوں میں مئی ۱۹۶۲ء میں بہ ترتیب راقم شائع ہو چکے ہیں۔

بہت سے سیاسی زعماء مثلاً ڈاکٹر مختار احمد انصاری، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، گاندھی جی، سی۔ آر داس، مولانا محمد علی جوہر، مارمے ڈیوک، پکتھال کے حالات و واقعات بھی بیان کئے ہیں اس سلسلہ میں بہت سے ایسے واقعات قلمبند کئے ہیں۔ جو کہیں اور نہیں ملتے۔ عبدالعلی خاں صاحب نے اس کا نام "وقائع عبدالعلی خاں" رکھا ہے۔ عبدالعلی خاں صاحب کا انتقال ۱۷ نومبر ۱۹۶۲ء بروز دوشنبہ ہوا۔ ع "خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

عبدالعلی خاں نے جامعہ ملیہ میں بھی خدمات انجام دی تھیں۔ پاکستان آنے کے بعد وہ انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہو گئے، اور مختلف ذمہ داریاں سنبھالیں۔ رسالہ "قومی زبان" میں اکثر ان سیاسی زعماء پر ان کے مضامین شائع ہوئے، جن سے ان کا رابطہ و تعلق رہا تھا۔ انہوں نے سیرتِ نبویؐ پر بھی ایک کتاب لکھی ہے جو چھپ چکی ہے۔ خانصاحب روزے نماز کے پابند، نہایت محنتی اور دیانتدار کارگزار تھے۔ توڑ جوڑ اور سازش سے دور و نفور، مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد جب انجمن ترقی اردو میں نئی انتظامیہ آئی تو یہ بیچارے تخفیف میں آ گئے۔ اپنی سوانح عمری میں سب سے پہلے سنبھل کے تاریخی حالات لکھے ہیں۔ پھر اپنا حال اس طرح شروع کیا ہے

"سنبھل کے محلہ کوٹ میں پٹھانوں کا ایک قبیلہ یوسف زئی رہتا تھا۔ جس کے سردار، امداد اللہ خاں تھے۔ جو سنبھل کی چونگی کے گرداور تھے۔ فارسی کے فاضل اور بڑے متقی و پرہیز گار تھے۔ ان کے بڑے لڑکے کا نام عبداللہ خاں تھا۔ شب برات کے مبارک دن نیک ساعت میں اُن کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ محلّہ کے بُزرگ مولوی عبدالحیٔ صاحب کو اس بچّے کے دیکھنے کے لیے بُلایا گیا۔ مولوی صاحب نے قرآن شریف کی کئی سُورتیں پڑھ کر اس پر دم کیں، اور دعائیں دیں۔ اس لڑکے کا نام عبدالعلی خاں رکھا گیا۔ ان برکتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس لڑکے پر بڑا فضل و کرم کیا۔ اوّل تو اس لڑکے کو بہترین اُستاد ملے، اور بعد اچھے اچھے لوگوں سے

اس کا واسطہ پڑا۔ جس کے باعث اس کو بڑا فیض حاصل ہوا"
اس آغاز کے بعد عبدالعلی خاں رقم طراز ہیں۔

"پانچ چھ برس کی عمر میں جب میں اپنے والدین کے پاس مُراد آباد آیا تو میرے والد صاحب نے مجھ کو ایک برگزیدہ اُستاد مولوی کشور علی صاحب کے پاس بھٹی محلہ میں چوڑی والوں کی گلی میں پڑھنے کے لئے بٹھا دیا۔ اِس وقت مولوی صاحب کے سر اور داڑھی کے بال بالکل سفید اور ان کی عمر نوے سال کے قریب تھی۔ مگر وہ بہت تندرست تھے۔ مولوی صاحب ہندو اور مسلمان بچوں کو ساتھ ساتھ پڑھاتے تھے اور سب پر بڑی محبت اور شفقت کیا کرتے تھے۔ میں نے پہلے تشریح الحروف پڑھی اس کے بعد، دستور الصبیان، کریما، مامقیماں اور قرآن شریف پڑھا۔ بعد ازاں گلستاں، بوستاں، بہار دانش اور انوارِ سہیلی پڑھی ان کتابوں کے پڑھنے کی وجہ سے مجھے فارسی کی اچھی استعداد حاصل ہو گئی۔

اس کے بعد عبدالعلی خاں صاحب نے ان کے اخلاق کریمانہ اور اچھی عادات کا ذکر کیا ہے اور اُن کے طریقۂ تعلیم پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ وہ نہایت بے لوث خادمِ قوم تھے۔ اُنہوں نے بہت سے پختہ کنویں بنوائے۔ وہ جنگل کی جڑی بوٹیوں سے علاج بھی کیا کرتے تھے۔

اس کے بعد عبدالعلی خاں صاحب اپنی اسکول کی تعلیم کے متعلق لکھتے ہیں۔

"میں نے مُراد آباد کے تحصیلی اسکول سے اردو مڈل کا امتحان ۱۹۰۶ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اور گورنمنٹ سے پانچ روپے ماہوار وظیفہ ملا۔ تحصیلی اسکول میں ہمارے ہیڈ ماسٹر پنڈت ہر پرشاد تھے جو بڑے صوفی منش اور خوش خلق انسان تھے۔ وہ رات کے وقت آٹھ دس لڑکوں کو اپنے گھر پڑھاتے تھے۔ اور سب سے فیس لیتے تھے۔ پنڈت جی نے از راہ لطف و کرم مجھ سے فرمایا۔ کہ آپ بھی

رات کے وقت پڑھنے کے لیئے میرے گھر آیا کیجئے، میں آپ سے کوئی فیس نہیں لوں گا۔ میں نے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا، اور کئی مہینے تک اُن کے گھر پر پڑھنے کے لیئے جاتا رہا۔ اس زمانے میں ہندی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ میری ہندی اور ہندی کا خط بہت اچھا تھا۔ ایک مرتبہ پنڈت رام سروپ انسپکٹر مدارس اسکول آئے اور سب لڑکوں کی کاپیاں دیکھیں۔ میری کاپی ان کو بہت پسند آئی۔ پنڈت جی نے کہا۔ کہ یہ ایک مسلمان لڑکے کی کاپی ہے۔ جس پر اُنہوں نے مجھ کو بُلایا اور شاباش دی۔ مڈل پاس کرنے کے بعد میں گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہُوا۔ یہ اسکول رُستم خاں کے قلعہ کی زمین پر بنا ہُوا ہے۔۔۔۔ میں نے ۱۹۱۳ء میں اسکول لیونگ سرٹیفکیٹ کا امتحان درجہ دوئم میں پاس کیا۔ اور اردُو میں اعزاز حاصل کیا۔ افسوس ہے کہ اس زمانے میں مُرادآباد میں کوئی ڈگری کالج نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے میں بی۔ اے پاس نہ کر سکا۔ مجھ سے بہت ملنے والوں نے کہا کہ علی گڑھ کالج سے وظیفہ لیجئے، اور بی۔ اے کیجئے۔ میں نے ان سے کہا، کہ مجھے وظیفہ لے کر پڑھنا پسند نہیں ہے"

"ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری سے جو میرے محلہ میں رہتے تھے۔ برابر مُلاقات ہوتی رہتی تھی۔ ان کے مکان میں ایک مرتبہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے مُلاقات ہوئی، ڈاکٹر انصاری نے مجھ سے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی، معلوم ہوتا ہے، کہ وہ میرے جوابات سے مطمئن ہو گئے تھے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ریاست بھوپال میں ایجوکیشنل ایڈوائیزر ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بجنوری نے مجھ کو بھوپال بلایا وہاں ڈاکٹر انصاری سے دوبارہ مُلاقات ہوئی۔ اور اُنہوں نے مجھ سے علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں کو کچھ خطوط بھجوائے۔ جس کے باعث وہ مجھ سے خوش اور مطمئن ہوئے

ڈاکٹر انصاری نے ڈاکٹر بجنوری سے کہا کہ عبد العلی خاں کو میرا پرائیویٹ
سیکرٹری بنوا دیجئے۔ چنانچہ ڈاکٹر بجنوری اور عبد الرحمٰن صدیقی مجھ کو دہلی لے
گئے، اور ڈاکٹر انصاری کے سپرد کر دیا۔ میں جنوری ۱۹۲۵ء سے دسمبر
۱۹۲۶ء تک ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا پرائیویٹ سیکرٹری رہا۔ خدا کا شکر ہے
کہ اس عرصہ میں ڈاکٹر انصاری مجھ سے بہت خوش رہے "۔

عبد العلی خاں صاحب نے ڈاکٹر انصاری کے ذاتی حالات، میڈیکل مشن کا بھیجا جانا
مسجد کانپور کا واقعہ حکیم اجمل خاں کے حالات، مسلم لیگ کے واقعات، ڈاکٹر عبد الرحمٰن
بجنوری کے حالات، مسلم یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن بنایا جانا، اخبار "جمہور" اور "نیو ایرا" کا اجرا۔
یو۔پی کے گورنر سر جیمس میسٹن کا دار العلوم دیوبند جانا وغیرہ تفصیل سے لکھا ہے ...
شیخ الہند مولانا محمود حسن کی رہائی کے سلسلہ میں عبد العلی خاں صاحب اپنے دیوبند
جانے کے تاثرات لکھتے ہیں۔

"جب گورنمنٹ نے باوجود کوششوں کے شیخ الہند کو مالٹا کی قید سے نہ
چھوڑا، تو ڈاکٹر انصاری کی بیگم صاحبہ نے حافظ احمد (شمس العلماء) مہتمم دار العلوم
دیوبند کو جو اُن کے پیر تھے۔ ایک خط لکھا۔ جس میں ان سے منت و سماجت
کی گئی تھی، کہ اپنے اثرات کو کام میں لائیں، اور شیخ الہند صاحب کو مالٹا
کی قید سے رہا کروائیں۔ یہ خط میری معرفت حافظ احمد صاحب کو
دیوبند بھیجا گیا۔ جس کو میں نے حافظ صاحب کے ہاتھ میں دیا۔ حافظ صاحب
نے مجھ سے فرمایا کہ "آپ ٹھہریئے۔ ہم صلاح و مشورہ کر کے جواب دیں گے"۔
میں شیخ الہند صاحب کی بیگم صاحبہ کے پاس ٹھہرا رہا۔ حافظ صاحب دن
میں تین چار مرتبہ مجھ سے فرماتے تھے۔ کہ "ٹھہرے رہیئے۔ ہم صلاح و مشورہ
کر رہے ہیں"۔ چوتھے دن صبح کے آٹھ بجے حافظ صاحب نے مجھ کو دار العلوم
کے مشورہ گاہ میں طلب کیا۔ جہاں پر نو دس علماء جمع تھے۔ حافظ صاحب
نے مجھ سے فرمایا۔ کہ "مولوی شبیر احمد عثمانی" اس خط کا جواب آپ کو بتائیں

گے۔ ہم خط کا...... تحریری جواب نہیں دیں گے۔ آپ بیگم انصاری صاحب کو ہماری طرف سے تمام باتیں بتا دیجئے"

مولوی شبیر احمدؒ عثمانی نے جو اُن کے نمائندہ تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ ہم پبلک جلسہ کر کے گورنر صاحب کو شیخ الہند کی رہائی کے لئے تار نہیں بھیج سکتے۔ لیکن گورنر صاحب سے التجا کریں گے کہ شیخ الہند صاحب کو رہا کر دیا جائے۔ اور ہمیں اُمید ہے کہ ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ . . حافظ احمد صاحب نے مجھ کو خط کا تحریری جواب نہیں دیا۔ اور فرمایا کہ ہماری طرف سے بیگم انصاری صاحب سے یہ سب باتیں کہہ دیجئے۔ . . . چنانچہ میں اس کے بعد دہلی چلا گیا اور بیگم انصاری اور ڈاکٹر انصاری سے یہ سب باتیں کہہ دیں جن کو سُن کر اُنہوں نے اظہار افسوس کیا۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سیاسی جدوجہد کے سلسلہ میں عبد العلی خاں مرحوم رقمطراز ہیں۔

۱۹۱۸ء میں دہلی میں کانگرس اور مُسلم لیگ کے اجلاس ایک ساتھ ہوئے اور تقریباً ایک ہی سے ریزولیوشن پاس کئے گئے۔ اس سال مُسلم لیگ کے صدر فضل الحق صاحب (کلکتہ) منتخب ہوئے اور دہلی میں صدر استقبالیہ کمیٹی ڈاکٹر مختار احمد انصاری ہوئے۔ اس مرتبہ عبد الرحمٰن صدیقی نے بہت کام کیا۔ دہلی کے ہر محلہ میں انہوں نے جلسے کئے اور وہاں کے مسلمانوں کو آزادی کے نقشے دکھائے۔ ڈاکٹر انصاری نے اس مرتبہ نئی بات یہ کی کہ مُسلم لیگ میں شرکت کے لئے ہندوستان کے ہر حصّہ سے علماء کرام کو بُلایا۔ لیکن مولوی اشرف علی صاحب تھانوی باوجود سخت کوشش کے مُسلم لیگ کے اجلاس میں شریک نہ ہوئے۔ . . . ڈاکٹر مختار احمدؒ انصاری نے اپنے خطبہ صدارت میں وہ حدیثیں کثرت سے لکھی تھیں جن کی بناء پر مقاماتِ مُقدّسہ پر کفّار قبضہ نہیں کر سکتے۔ مگر گورنمنٹ نے مُسلم لیگ کا اجلاس ختم ہوتے ہی اس خُطبہ کو ضبط کر لیا۔ لیکن مُسلمان قوم

کی خوش قسمتی ہے، کہ اجلاس نے خوابیدہ اور سوئے ہوئے مسلمانوں کو جگا دیا۔ یہ ڈاکٹر انصاری کا بڑا کارنامہ ہے۔"

اس کے بعد عبدالعلی خاں صاحب نے جامعہ ملیہ کے قیام، مولانا محمد علی جوہر اور مارمے ڈیوک پکتھال کے حالات اور خود جامعہ ملیہ سے اپنا منسلک ہونا تفصیل سے لکھا، اور "وقائع عبدالعلی خاں" کا اختتام بھی اچانک جامعہ ملیہ کے بیان پر ہو جاتا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہیں تک خان صاحب مرحوم قلمبند کرنے پائے تھے کہ کتاب زندگی کا آخری ورق الٹ گیا۔ عبدالعلی خاں نے اپنے ذاتی حالات آخر میں اس طرح لکھ کر ختم کر دیئے ہیں۔

"ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے مارچ ۱۹۲۵ء میں مجھ کو اپنی بیگم کے ساتھ اورنگ آباد اپنے منجھلے بھائی کے پاس بھیجا، تاکہ میری صحت جو مولانا محمد علی کے پاس زیادہ کام کرنے کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی ٹھیک ہو جائے۔ اورنگ آباد کی اچھی آب و ہوا کی وجہ سے میری صحت بہتر ہو گئی میں وہاں پانچ مہینے مستقل رہا۔ مولوی عبدالحق سے جو اورنگ آباد میں رہتے تھے۔ اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ ڈاکٹر انصاری غالباً ستمبر ۱۹۲۵ء میں انگلستان سے واپس آ گئے۔ ہم سب ڈاکٹر انصاری کے ساتھ دہلی چلے گئے۔ میری صحت کی وجہ سے عبدالرحمٰن صدیقی نے مجھ کو گورنمنٹ آف انڈیا (ریلوے ڈیپارٹمنٹ ریلوے روڈ) میں ملازم کروا دیا، شملہ میں گرمیوں کے زمانے میں پانچ چھ مہینے رہنے کی وجہ سے میری صحت بہت اچھی ہو گئی۔"

عبدالعلی خاں مرحوم نے پاکستان کی زندگی کے متعلق، کچھ نہیں لکھا ہے۔ کہ وہ یہاں کب پہنچے۔ انجمن ترقی اردو سے کب منسلک ہوئے۔ اور انجمن میں ان کی مدتِ ملازمت کتنے دنوں رہی وغیرہ وغیرہ۔

مولوی محمد سلیمان بدایونی

مولوی محمد سلیمان ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۰۲ھ مطابق ۲۷ جنوری ۱۸۸۵ء بروز سہ شنبہ (۱۲ بجے شب) محلہ مردہے ٹولہ میں پیدا ہوئے۔ اس محلہ کی نصف سے زیادہ آبادی ان ہی کے خاندان کے افراد پر مشتمل تھی۔ مولوی صاحب کا تعلق بدایوں کے ایک متوسط الحال گھرانے سے تھا وہ اپنے مورث کی بدایوں میں آمد کے متعلق اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ ملک داؤد اور ان کے بیٹے شیخ لطف اللہ کی آمد روہیلوں کے زمانہ کی ہے۔

مولوی صاحب کے والد کا نام حاجی وزیر الدین بن شیخ علیم الدین تھا[۱]۔ ان کے والد تحصیلداری سے ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے اپنے دوران ملازمت میں اچھی خاصی زمینداری پیدا کرلی تھی۔ بڑے سمجھ بوجھ کے آدمی تھے۔ ۱۹۰۷ء میں حاجی وزیر الدین کا انتقال ہوا۔

مولوی محمد سلیمان کا نام محمد صالح تھا لیکن اس کی ادائی میں ذم کا پہلو تھا اس لئے محمد صالح سے بدل کر محمد سلیمان رکھ دیا گیا۔ ایک مرتبہ کراچی میں کسی صاحب نے مولوی صاحب کو "محمد صالح" کہہ کر مخاطب کیا وہ غالباً سہسوان کے کوئی معمر بزرگ تھے۔ مولوی صاحب اپنا یہ نام سن کر حیرت زدہ رہ گئے۔

چار سال کی عمر میں شاہ دلدار علی مذاق میاں نے بسم اللہ پڑھائی۔ محمد سلیمان صاحب نے ابتدائی تعلیم اس زمانے کے بدایوں کے مشہور مدرسین مولوی عرفان علی، مولوی عاشق حسین، مولوی محمد حسن سے حاصل کی۔ اس کے بعد کریما سے لے کر فارسی کی تمام درسی کتابیں مولوی غلام رسول بدایونی سے پڑھیں۔ عربی کی تعلیم صرف و نحو اور ایساغوجی تک ہوئی۔ مولوی صاحب نے اپنی ڈائری میں ایک جگہ لکھا ہے کہ مولوی غلام رسول سے کریما کا سبق

---

[۱] شیخ علیم الدین سے ملک داؤد تک یہ سلسلہ ہے۔ شیخ علیم اللہ بن قادر بخش بن رمضانی بن خدا بخش بن محمد واصل بن لطف اللہ بن ملک داؤد

چودائی تکبیر چرامی کئی | خطامی کئی دخطامی کئی

سے شروع کیا تھا۔ اپنے اُستاد مولوی غلام رسول کا ذکر بڑی عقیدت و محبت سے کیا کرتے تھے۔ کراچی سے جب بدایوں جاتے تو ان کے صاحبزادے حکیم نثار احمد صاحب سے ضرور ملتے ۱۹۶۰ء میں مولوی غلام رسول مرحوم کا کتب خانہ دیکھا تو اس کی خستہ حالی پر بہت اظہار افسوس کیا اور چند کتابیں حکیم نثار احمد صاحب سے لے آئے تھے۔ مولوی سلیم اللہ بدایونی سے بھی ہشت بہشت کے چند سبق پڑھے تھے۔

اُردو اور انگریزی مختلف اساتذہ سے پڑھی ۱۸۹۵ء میں گورنمنٹ اسکول بدایوں میں داخل ہوئے مگر جلد ہی اسکول چھوڑ دیا۔ ایک مرتبہ پنجاب سے مڈل اور پھر میٹرک کا امتحان دیا مگر ناکام رہے۔ ۱۹۰۵ء میں کچھ دنوں بریلی (محلہ خواجہ قطب) میں کرایہ کا مکان لے کر پرائیویٹ طور پر انگریزی پڑھی مولوی قوی بخش بدایونی ان کے ہم سبق تھے۔

مولوی صاحب کو فارسی پر بڑا عبور تھا۔ فردوسی و سعدی و حافظ کا کلام اکثر ازبر تھا۔ ان اساتذہ کے اشعار اکثر حسب موقع پڑھ کر محفل میں جان ڈال دیا کرتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کو مولوی صاحب بہت پسند کرتے تھے۔ اقبالؔ کے فارسی اور اُردو کلام کا اکثر حصہ یاد تھا۔ غالبؔ کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے تھے فرماتے تھے کہ غالبؔ نے حضرت سیدنا صدیق اکبرؓ اور امام ابو حنیفہؒ کی شان میں بے ادبی کی ہے اور فریزر کی مدح کی ہے۔ فریزر و نواب شمس الدین کے معاملہ میں غالبؔ ملوث ہیں اور مفتی صدر الدین آزردہ کی بیوی کے وظیفہ کے سلسلے میں نواب رام پور سے غالبؔ نے جو خط و کتابت کی ہے وہ بھی تیسرے درجہ کی بات ہے۔

مولوی محمد سلیمان کا مطالعہ وسیع تھا۔ تاریخ و مذہب ان کے خاص موضوع تھے۔ بعض اوقات ایسے نکات بیان کرتے تھے جن پر علماء کی نظر بھی نہیں پہنچتی تھی۔ بدایوں کی تاریخ و آثار پر تو گویا وہ استناد کا درجہ رکھتے تھے۔ خود کہا کرتے تھے کہ میں تو "بدایوں کی دائی" ہوں۔ بدایوں کے بعض خاندانوں کے تاریخی حالات، ان کے عروج و زوال کے واقعات، اہم شخصیتوں کے سوانح گویا ان کو حفظ تھے۔ اکثر لوگ ان سے گفتگو کرتے ہوئے

کتراتے تھے۔ کیونکہ مولوی صاحب نہایت صاف گوئی سے کام لیتے تھے ان لوگوں کو جو اپنی نام نہاد شرافت اور جھوٹی عظمت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ وہ "کلغی دار مرغے" کہا کرتے تھے۔ مولوی صاحب میں "نقد و بصر" کا خاص مادہ تھا اور اس کے اظہار میں نہایت بے باک تھے۔ ان کی تنقید بڑی بھرپور ہوتی تھی۔ اسی لئے بعض لوگ کہا کرتے تھے کہ "سلیمان صاحب" کو تو صرف "برائیاں" ہی نظر آتی ہیں۔

مولوی محمد سلیمان بدایوں کی سیاست میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۶ء سے ہوا۔ جب وہ پہلی مرتبہ میونسپل بورڈ بدایوں کے ممبر منتخب ہوئے خاص بات یہ ہوئی کہ اب تک میونسپل و ضلع بورڈ کے چیئرمین شیوخ زادگان شیخوپور (بدایوں) سے ہوتے تھے۔ مولوی صاحب نے اہل بدایوں کو اس طرف توجہ دلائی کہ بدایوں کا چیئرمین "بدایونی" ہو اس طرح اپنی پارٹی کی ایک حیثیت متعین کر لی۔ سیاسی افکار میں جلا اور پختگی رائے مولانا عبدالماجد بدایونی اور میر محفوظ علی سے تعلقات و روابط کی بدولت آئی۔ مولوی محمد سلیمان مسلم مفاد کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ مسلم مدرسین کی تو گویا خاص پشت پناہ تھے۔ ۱۹۲۶ء سے ڈسٹرکٹ محمڈن ایجوکیشن کمیٹی بدایوں کے ممبر رہے۔ ضلع و شہری تعلیمی مسائل سے مولوی صاحب کو خاص دلچسپی تھی۔ اگست ۱۹۳۰ء سے آنریری مجسٹریٹ درجہ سوم داتا گنج مقرر ہوئے۔ فروری ۱۹۳۶ء سے مجسٹریٹ بنچ "اے" کے اختیارات ملے۔ اگست ۱۹۳۹ء سے بدایوں بنچ کے آنریری مجسٹریٹ درجہ دوم مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۰ء سے تحصیل بسولی کا اضافہ ہو گیا۔ ۵ جولائی ۱۹۴۵ء کو استعفا دے دیا۔ ۱۹۴۱ء میں اعزازی جیل وزیٹر اور نابالغ قیدیوں کی کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے۔

مولوی صاحب کانگریس کی ضلع کمیٹی کے ممبر اور خلافت کمیٹی کے رکن رہے۔ ملک کی آزادی کے خواہاں تھے۔ ۱۹۳۸ء میں ضمنی صوبائی الیکشن ہوئے جس میں بدایوں سے کوئی مسلمان مسلم لیگ کے مقابلہ میں انتخاب لڑنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ رفیع احمد قدوائی نے مولوی محمد سلیمان کو ٹکٹ دے کر کانگریس کی طرف سے کھڑا کیا نتیجہ ناکامی تھی۔ اسی سلسلے میں ایک لطیفہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

جب انتخابی مہم کے سلسلہ میں مولوی صاحب بدایوں کے کسی گاؤں میں گئے تو دیکھا کہ لوگوں کا رُخ بپھرا ہوا ہے۔ ایک شخص نے بتایا کہ مسلم لیگ کے کارکن دورہ کر چکے ہیں۔ مولوی صاحب نے وہاں نماز ادا کی اس کے بعد کسی دوسرے آدمی نے پھر مسلم لیگ کے کارکنوں کے دورے اور مولانا شوکت علی وغیرہ کی تشریف آوری کا ذکر کیا تو مولوی صاحب نے کہا کہ "کیا کام پڑے گا تو مولانا شوکت علی آئیں گے"۔ اس شخص نے جواب دیا کہ "ضرور آویں گے"۔ اس کے بعد ایک اور شخص آیا اور اس نے کہا کہ "مولوی صاحب آپ بہت اچھے آدمی تھے"۔ مولوی صاحب نے کہا کہ "کیا میں مر گیا؟" اس نے کہا "نہیں آپ ہندو ہو گئے"۔ یہ سن کر مولوی صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور انہوں نے کہا کم بخت میں نے تیرے سامنے ظہر کی نماز ادا کی ہے" اس نے کہا "ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر ہندوؤں کے ساتھ ہو گئے"۔ اس کے بعد مولوی صاحب اس گاؤں سے واپس آئے اور انہیں معلوم ہو گیا کہ ہوا کا رُخ کیا ہے رفتہ رفتہ ان کے ساتھیوں میں سے میکو میاں، شیخ محب احمد، مولوی وحید بخش اور میر محفوظ علی وغیرہ بھی آہستہ آہستہ ٹوٹ گئے اور مسلم لیگی امیدوار افتدارالدین حسن بیرسٹر کامیاب ہوئے۔

مولوی محمد سلیمان کے اعلیٰ کردار کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔ چودھری بدن سنگھ ایم ایل اے کانگریس کے رہنما، ہندو مفاد کے محافظ اور مسلم دل آزاری میں مشہور تھے۔ مولوی صاحب چودھری بدن سنگھ کو پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ ۱۹۴۲ء کی "ہند چھوڑ تحریک" کے زمانے میں چودھری صاحب ناخواندہ مہمان کی طرح مولوی صاحب کے یہاں آکر مقیم اور پناہ گزیں ہو گئے تاکہ گرفتاری سے محفوظ رہیں۔ مولوی صاحب نے پوری پوری حفاظت اور مہمان نوازی کی۔

مولوی تسلیم احمد خاں مختار کا بیان ہے کہ ان کا ایک غیر مسلم پڑوسی جو چودھری صاحب کا زخم خوردہ تھا مختار صاحب کو رات کے دس بجے کوتوالی کے راستہ میں ملا۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ چودھری صاحب کو گرفتار کرانے کو توالی جا رہا ہے۔ مختار صاحب نے کہا کہ تھوڑی دیر توقف کرو تاکہ صحیح سراغ لگ جائے ورنہ غلط مخبری کے الزام میں تمہاری گرفتاری کا اندیشہ ہے، وہ اس کو لوٹا لائے اور واپسی پر مولوی صاحب سے

صورت حال بیان کی۔ انہوں نے رات ہی میں چودھری صاحب کو دوسری محفوظ جگہ منتقل کر دیا اور دن نکلنے سے پہلے اپنی زمینداری میں چودھری صاحب کے ہم قوم لوگوں میں پہنچا دیا۔ جہاں وہ عرصہ تک مولوی صاحب کے مہمان رہے۔ دوسرے روز مولوی صاحب نے سجدۂ شکر ادا کیا اور کہا کہ "اول تو خود میری آبرو ریزی کا سوال تھا۔ دوسرے، ایک پناہ گزیں مہمان کو بدسلوکی اور بدعہدی کا شبہ ہوتا"۔

تقسیم ملک کے بعد فروری سنہ ۱۹۵۱ء تک، مولوی محمد سلیمان بدایوں میں مقیم رہے۔ بالکل خانہ نشین ہو گئے تھے جلسہ و تقریر کے تو وہ آدمی کبھی تھے ہی نہیں۔ حالات کو دیکھتے تھے اور کڑھتے تھے۔ بعض خوشامد پسند مسلمان، اپنے کردار سے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا رہے تھے۔ اس پر اُن کو سخت افسوس ہوتا تھا۔ کلکٹر بدایوں جے۔ ڈی شکلا نے مولوی صاحب کو سیفٹی ایکٹ میں بند کرنے کے لئے طے کر لیا تھا مگر شیخ وحید احمد پارلی مینٹری سکریٹری کی وجہ سے یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ تقسیم کے بعد پبلک جلسوں میں بالکل نہیں جاتے تھے مگر جب سرکاری طور پر طلبی ہوتی تھی تو بدرجہ مجبوری شریک ہوتے تھے۔ دو مرتبہ کلکٹر نے حکم دیا کہ آپ تقریر کریں۔ پہلی مرتبہ جب بھارتی فوج نے حیدرآباد پر قبضہ کیا تھا۔ مولوی صاحب دو جملے کہہ کر بیٹھ گئے۔ دوسری مرتبہ جب بدایوں میں شکلا نے چاہا کہ تعزیہ داری ہو کیونکہ سنہ ۱۹۴۷ء سے تعزیہ داری کلیتاً بند ہو گئی تھی۔ اس موقع پر کلکٹر نے مولوی صاحب کو حکم دیا کہ تقریر کریں۔ مولوی صاحب نے تعزیہ داروں سے کہا کہ تعزیہ داری کرنا بدعت اور گناہ ہے اسے اگر خدا کے ڈر سے چھوڑتے ہو تو چھوڑ دو انسان سے ڈر کر نہیں۔

کراچی میں اگر مولوی صاحب تمام وقت مطالعہ یا تصنیف و تالیف میں گزارتے تھے۔ خاص توجہ بدایوں کی تاریخ کی ترتیب و تدوین پر تھی اور افسوس کیا کرتے تھے کہ بدایوں کی کوئی جامع تاریخ مرتب نہ ہو سکی۔ انہوں نے اپنے مکان کا نام "بیت البدایوں" رکھا۔ ذوالقرنین بدایوں کا ایک "بدایوں نمبر" شائع کرایا جس کی ترتیب و اشاعت میں بڑی دلچسپی لی۔ جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء پر ایک جامع کتاب

"بدایوں ۱۸۵۷ء میں" لکھی اس طرح "بدایوں ۱۹۴۷ء میں" مرتب کی۔ یہ اہم تاریخی دستاویز ہے۔ مولوی محمد سلیمان صاحب نے مختلف تحقیقی علمی مقالے لکھے جو ہند و پاکستان کے علمی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔

پاکستان میں ان کا سب سے پہلا مضمون "فتح خاں خانساماں" العلم کراچی میں شائع ہوا۔ اس کے بعد متعدد علمی مقالے لکھے۔ جن میں مولوی عبدالقادر لکھنوی، معینؔ بدایونی، بدایوں کے اہلحدیث، بدایوں کے اہلِ تشیع، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے دو غیر معروف مجاہد، جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے ضلع بدایوں پر مابعد اثرات، نواب بدایونی کا قصیدہ، بدایوں قدیم کے اُردو شعراء، مینا بازار، شہزادہ شجاع، تبصرہ حیات اعلیحضرت، تبصرہ تاریخ گرجر وغیرہ ان کے وہ علمی اور تحقیقی مقالے ہیں جو ہند و پاکستان کے مختلف علمی رسائل و جرائد مثلاً العلم (کراچی) الموتمر (کراچی) الشجاع (کراچی) جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی (کراچی) پیام حق (کراچی) انجمن اسلامیہ میگزین (کراچی) ذوالقرنین (بدایوں) مومن (بدایوں) الجمعیۃ (دہلی) اور روہیل کھنڈ اخبار (بریلی) میں طبع و شائع ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔

مولوی صاحب کے مزاج میں تحقیق و تنقید کا خاص مادہ تھا۔ بڑی تلاش سے مواد فراہم کرتے تھے۔ لکھنے میں ذرا سُست تھے۔ مختلف قسطوں میں مضمون پورا ہوتا تھا۔ بعض اوقات تو ایک پوسٹ کارڈ مختلف نشستوں میں لکھ کر پورا کرتے تھے۔ زبان و بیان سے قدامت کا رنگ جھلکتا تھا۔ بدایوں و اہلِ بدایوں کی ماضی قریب کی تاریخ و حالات کے بلاشبہ مولوی محمد سلیمان صاحب ماہر و محقق تھے۔ حافظہ بلا کا پایا تھا۔ ہر واقعہ کی جزئیات اس طرح بیان کرتے تھے۔ گویا ابھی آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہے۔

دوستوں کے بہت دوست اور خیر خواہ تھے۔ بدایوں کے موروثی سیاسی اور مذہبی اقتدار رکھنے والوں سے ہمیشہ الگ تھلگ ہی رہے بلکہ اکثر ان کے مقابلے میں حریف جماعت کا ساتھ دیا اور اکثر و بیشتر کامیابی و نصرت مولوی محمد سلیمان کی پارٹی کو

حاصل ہوتی تھی۔ مولوی سلیمان، حضرت شیخ شفیع الدین ناصر انصاری ساکن رام پور منہاراں نزیل بریلی سے بیعت تھے۔

مولوی محمد سلیمان بہت وضعدار بزرگ تھے۔ دوستوں کی ہر حال میں مدد کرتے تھے بدایوں کے مشہور وکیل اکرام عالم صاحب نے ایک مرتبہ تقریباً ایک لاکھ کی مالیت کی جائداد مولوی محمد سلیمان صاحب کے نام سے خریدی۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے وہ خود اپنے نام نہیں خرید سکتے تھے۔ میونسپل بورڈ بدایوں کے الیکشن میں دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ زیادتی مولوی اکرام عالم کی بیان کی جاتی ہے۔ مولوی صاحب نے از خود اصرار کر کے وہ جائداد ان کو واپس کی۔ ان کے ایک دوست محمد اقبال خاں بدایونی مرحوم کی صاحبزادی کراچی میں رہتی ہیں ہمیشہ ان کی خبر گیری کرتے تھے۔ محمد اقبال صاحب کا کئی ہزار روپیہ کراچی کے کسی بینک میں جمع تھا۔ متعلقہ جملہ کاغذات مولوی صاحب کے پاس رہتے تھے۔ مولوی صاحب نے ان کے انتقال کے بعد وہ تمام رقم ان کی صاحبزادی کو دلوائی۔

مولوی محمد سلیمان نئی نسل سے مایوس تھے۔ مگر پھر بھی نبھانے کی کوشش کرتے۔ انہیں تصنع اور خود رائی سے سخت نفرت تھی۔ اگر ان کو اندازہ ہو جاتا کہ مخاطب حقائق سے گریز کر کے تصنع کی طرف قدم بڑھا رہا ہے تو بقول شخصے "حقائق کی نقاب کشائی کر کے فوراً گرکری کر دیتے تھے۔"

۲۸٫۷۰۲ / ۹۰ ۳۵۰

مولوی صاحب رہن سہن طرز معاشرت، میل ملاقات ہر چیز میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے تھے۔ پچھلے سال حج کی درخواست دی تھی منظور نہ ہوئی۔ اب کی مرتبہ جب قرعہ میں نام آیا تو بہت خوش ہوئے۔ ۲۰ اپریل ۶۳ء کو میں مرحوم سے ملا۔ مختلف مباحث پر گفتگو ہوئی۔ بڑی محبت سے چائے بنا کر پلائی۔ مولوی صاحب چائے بڑے اہتمام سے پیا کرتے تھے۔ ۲۱ اپریل کو کراچی سے روانہ ہوئے اور ایسے گئے کہ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ حج میں بعض تکالیف اور پریشانیاں بھی ہوئیں مگر ہنسی خوشی برداشت کیں۔ اس موضوع پر جانے سے چند روز پہلے تبادلہ خیال کر چکے تھے۔ سفر حج

میں مولوی صاحب کے رفیق قاضی سجاد حسین بدایونی تھے۔ قاضی صاحب نے مولوی صاحب کی بڑی خدمت اور مدد کی۔ مولوی صاحب نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ قاضی سجاد حسین ایسی خدمت کر رہے ہیں جیسی بھائی یا بیٹے کرتے۔ یکم جون ۱۹۶۳ء بروز ہفتہ کو مولوی صاحب مکہ معظمہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے کیسی کامیاب زندگی گزاری اور کیسی شاندار موت پائی،

حق مغفرت کرے عجیب آزاد مرد تھا

آخر میں ہم ایک قطعہ تاریخ نقل کرتے ہیں جو مولانا مفتی محمد ابراہیم فریدی شیخ الحدیث مدرسہ شمس العلوم بدایوں نے مرحمت فرمایا ہے۔

ہوا ان کو میسر حج اکبر فضل مولا سے	ہوا انجام ظاہر مغفرت فرمائی یزداں سے
ملا ہے "بے بدل" یہ مصرعۂ تاریخ برجستہ	رہ خلد معلی پائی مکہ میں سلیماں نے
۳۶	۱۴۱۹ - ۳۶ = ۱۳۸۳ھ

پروفیسر حامد حسن قادریؒ

۱۹۵۵ء کی بات ہے کہ ایک روز انجمن ترقی اُردو کراچی کے پندرہ روزہ اخبار قومی زبان میں مندرجہ ذیل مختصر سی خبر شائع ہوئی۔

"اردو کے مشہور نقاد اور داستانِ تاریخ اُردو کے مصنف مولانا حامد حسن قادری مستقل طور پر آگرہ سے کراچی تشریف لے آئے ہیں۔ مولانا حامد حسن قادری اس پیرانہ سالی میں بھی جواں ہمتی کے ساتھ تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف ہیں۔"

(قومی زبان مجریہ ۱۶ فروری ۱۹۵۵ء)

اس خبر کو پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی میں ان کی مشہور تصنیف "داستان تاریخ اُردو" متعدد بار پڑھ چکا تھا اور ان کے علم و فضل اور تحقیق و تنقید سے بہت متاثر تھا۔ خیال ہوا کہ اب اس محقق و فاضل سے براہِ راست استفادہ کا موقع مل سکے گا۔

دن اور مہینے گزرے مگر ملاقات نہ ہو سکی۔

اتفاق سے ایک روز مکتبہ فریدی (اُردو کالج کراچی) کے مالک فریدی صاحب نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے انٹرمیڈیٹ اور بی اے کی فارسی کتابوں نقش تازہ، (حصۂ نثر) اور حرف نو (حصۂ نظم) کی شرحیں چھپوائی ہیں۔ میں ان کتابوں کی کاپیاں اور پروف پڑھ دوں۔ انہوں نے یہ کام میرے سپرد کر دیا۔ ان کتابوں پر شارح کا نام نہ تھا مگر مطالب کی وضاحت و تشریح اور سلیس و سادہ اندازِ بیان سے

شارح کا پختہ کار اُستاد اور ادیب و نقّاد ہونا ظاہر ہوتا تھا۔ ان کتابوں کے
آخر میں شعرائ و مصنفین کے حالات بھی شامل تھے۔

کسی شاعر کے حالات میں کسی واقعہ کا سنہ غلط درج تھا۔ پروف
پڑھنے کے بعد مَیں نے فریدی صاحب سے کہا کہ اصل مسودہ میں یہ سنہ غلط
لکھا ہوا ہے۔ اگر آپ کہیں تو درست کردوں اس پر انہوں نے کہا کہ شارح بہت
عالم و فاضل ہے۔ میں نے کہا کہ درست ہے مگر یہ واقعہ تو اسی سنہ میں ہوا ہے
اس کو کیا کیا جائے۔ انہوں نے یہی بات پروفیسر حامد حسن قادری صاحب سے
دہرادی۔ قادری صاحب نے میری بات کی توثیق و تائید کی اور کہا کہ پروف ریڈر
نے صحیح نشان دہی کی ہے۔ اب فریدی صاحب نے مجھے بتا دیا کہ ان کتابوں
کے شارح پروفیسر حامد حسن قادری ہیں، انہوں نے آپ کی اس تصحیح کو شکریہ
کے ساتھ قبول کیا ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ آپ اُن سے مل لیں۔ مجھے اس
پیغام سے بہت مسرّت ہوئی کیونکہ مَیں تو خود ہی ان سے ملاقات کا متمنی تھا۔

ایک روز مَیں قادری صاحب کی قیام گاہ (جہانگیر روڈ ایسٹ) حاضر ہوا
جہاں وہ اپنے صاحبزادے خالد حسن قادری صاحب کے ساتھ مقیم تھے۔
انہوں نے بڑی شفقت و محبّت سے پذیرائی فرمائی۔ میرے حالات پوچھتے رہے
جب انہیں معلوم ہوا کہ میرا تعلق قصبہ آنولہ (ضلع بریلی) اور بدایوں سے ہے۔
تو انہوں نے اور بھی دلچسپی کا اظہار فرمایا۔ قادری صاحب کا وطن مالوف قصبہ
بچھراؤں (ضلع مراد آباد، یوپی) ہے وہ اس قصبہ کے ایک مرفہ الحال خاندان
میں مارچ ۱۸۸۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی احمد حسن (ف ۲۰ صفر ۱۳۳۱ھ)
رام پور میں وکیل تھے۔ قادری صاحب کی تعلیم و تربیت بھی رام پور میں ہوئی۔
ان کے پردادا مولوی محمود عالم (ف ۴ ذیقعد ۱۲۸۳ھ م ۱۱ مارچ ۱۸۶۷ء) بریلی
کے مشہور صوفی بزرگ شاہ نیاز احمد (ف ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) کے مرید و خلیفہ تھے۔
جب اس ملاقات میں ان کے پردادا مولوی محمود عالم اور ان کے دوسرے بھائیوں

مقصود عالم، منصور عالم، فضل عالم اور پھلواڑی کے دیگر علماء و اکابر مثلاً مولوی محمد علی تحصیلدار (ف ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۷ء) مولوی عبداللہ پھلواڑوی، مولوی نورالہدیٰ مؤلف انوار الرحمٰن و مرید و خلیفہ صوفی عبدالرحمٰن موحد لکھنوی (ف ۱۲۴۵ھ/۱۸۲۹ء) پروفیسر محمد محسن فاروقی (ف ۱۹۳۰ء) وغیرہ کا ذکر ہوا تو قادری صاحب فرمانے لگے کہ بھئی آپ تو میری کئی پشتوں سے واقف ہیں۔

بہت دنوں کے بعد پھر قادری صاحب کے کواٹر کی طرف سے گزر ہوا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ناظم آباد میں کہیں منتقل ہو گئے ہیں۔ غرض ناظم آباد پہنچا۔ اس موقع پر قادری صاحب نے ایک مختصر سا کتابچہ بعنوان، "جواہر المناقب فی الذکر امام جعفر صادق" مؤلفہ بخشی مصطفٰے علی خاں نقشبندی مرحمت فرمایا۔ فاضل مؤلف نے اس کتاب میں امام جعفر صادق کے حالات مستند مآخذ کی روشنی میں قلم بند کئے ہیں اور اس منظوم و مشہور روایت کی تغلیط کی ہے جو داستان عجیب کے نام سے ۲۲ رجب کو جعفر صادق کی نیاز کے موقع پر پڑھی جاتی ہے اور نیاز "رجب کے کونڈوں" کے نام سے مشہور ہے۔ داستان عجیب کو کسی غیر معروف شخص منشی جمیل احمد جمیل نے ۱۳۱۵ھ میں نظم کیا ہے۔

منشی ریاست علی رفیق نے داستانِ عجیب کی تاریخ کہی ہے۔

جمیل سخن سنج نے نظم کی   نئی اک روایت بہت دلپذیر
کہا ہاتف غیب نے اے رفیق   لکھو سال اس کا عدیم النظیر (۱۳۱۵ھ)

قادری صاحب نے اس پر ایک مختصر سا نوٹ لکھا ہے جس میں انہوں نے بتایا کہ یہ نیاز ریاست رام پور میں ۱۹۰۶ء میں امیر مینائی مرحوم (ف ۱۹۰۰ء) کے خاندان سے نکلی اس سے قبل اس کا کہیں رواج نہیں تھا۔ واقعہ یہی ہے کہ اسی زمانے میں یہ نیاز قلعہ رام پور سے جاری ہوئی۔ نواب حامد علی خاں رئیس رام پور اپنی ایک منظور نظر سے ناراض ہو گئے تھے۔ اس نے نواب صاحب کو منانے کے لئے امام صاحب سے منسوب کر کے یہ نیاز جاری کی۔ نواب صاحب

بنے اس نیاز میں شرکت کی۔ بس پھر کیا تھا کرامت کا شہرہ ہو گیا اور بلا زمین قلعہ میں اس کا شیوع ہوا۔ قلعہ سے نکل کر شہر رام پور اور قرب و جوار کے اضلاع میں رواج پذیر ہوئی اور آج تو باقاعدہ اس نے ایک تیوہار کی شکل اختیار کرلی ہے اس واقعہ کو مولوی یعقوب حسین ضیاؔ القادری بدایونی (ف ۱۹۷۰ء) اکثر بیان کیا کرتے تھے۔ میں نے اس سلسلہ میں مولوی حکیم عبد الغفور (ف ۱۴ اگست ۱۹۶۴ء) کے ایک مقالہ مطبوعہ صحیفہ اہلِ حدیث کراچی کی نشاندہی کی۔ قادری صاحب نے صحیفہ اہلِ حدیث کا یہ شمارہ مجھ سے خاص طور سے منگوایا اور حکیم صاحب کا یہ مضمون دلچسپی سے ملاحظہ فرمایا۔

اس مرتبہ گفتگو کا موضوع خود ان کی کتاب داستان تاریخ اُردو رہی۔ میں نے اس میں بعض تاریخی تسامحات کی نشان دہی کی کہ ولسن گردی کے واقعہ ۱۸۴۷ء سے قبل احمد اللہ مدراسی کو شہید کرا دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ ۱۸۴۷ء کے دس گیارہ سال بعد جنگ ۱۸۵۷ء میں مجاہدانہ کارنامے انجام دے کر شہید ہوئے اسی طرح مولانا فضل حق خیر آبادی (ف ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء) کو نولکشور پریس کے پروف ریڈروں میں دکھایا گیا ہے۔ حالانکہ وہ ۱۸۵۸ء میں جلاوطن ہو کر جزائر انڈمان پہنچ چکے تھے اور اس کے بعد مطبع نولکشور لکھنؤ قائم ہوا۔ قادری صاحب نے میرے معروضات کو نہایت توجہ اور غور سے سنا اور افسوس کرنے لگے کہ بعض ناقابلِ اعتبار ماخذ پر اعتماد کرنے کی وجہ سے کتاب میں یہ خامیاں رہ گئیں۔

قادری صاحب کی دیانت داری اور حسن معاملہ کے سلسلہ میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ داستان تاریخ اردو ۱۹۴۱ء میں آگرہ میں طبع ہوئی تھی۔ اس کے ناشر آگرہ کے مشہور تاجر کتب لکشمی نرائن اگروال تھے اور اس کا حق اشاعت بھی ان ہی کے پاس تھا۔ پاکستان میں آنے کے بعد متعدد ناشرین نے قادری صاحب سے رجوع کیا کہ ہم اس کتاب کو شائع کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اجازت دے دیجئے پاکستان میں قانونی طور سے کوئی پابندی نہیں ہے مگر انہوں نے جواب

دبا کر نہیں اخلاقی طور سے تو پابندی ہے۔ پھر آگرہ ہی سے ۱۹۵۷ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ ان کے انتقال کے بعد یہ کتاب کراچی سے شائع ہوگئی ہے۔

ناظم آباد میں قادری صاحب سے اکثر ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ نہایت آہستہ اور مختصر گفتگو فرماتے تھے۔ کبھی تو ہلکی مسکراہٹ ہی سے مضمون ادا فرما دیتے تھے۔

قادری صاحب سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب سے بیعت تھے۔ ان کے نقشبندی احباب کا ایک ہفتہ وار یا ماہانہ اجتماع غالباً صدر (کراچی) میں ہوتا تھا اس میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے۔ اس حلقہ کی طرف سے حضرت علی پوری کے مکتوبات و ملفوظات شائع ہوئے۔ قادری صاحب نے یہ دونوں کتابیں مجھے پڑھنے کے لئے مرحمت فرمائیں۔ رام پور کے نقشبندی سلسلہ کے دو بزرگ حافظ جمال اللہ (ف ۱۲۰۹ھ) اور حضرت درگاہی میاں (ف ۱۲۲۶ھ) کے حالات فارسی زبان سے اُردو میں مجمع الکرامات کے نام سے انہوں نے ترتیب دیئے تھے۔ میری درخواست پر یہ کتاب رام پور سے منگوا کر مرحمت فرمائی۔ قادری صاحب کا زیادہ وقت اوراد و اذکار اور اپنے سلسلہ کی خدمت میں گزرتا تھا۔

مَیں بالعموم علی الصبح ٹہلنے نکل جاتا ہوں۔ ایک روز منگھو پیر روڈ پر قادری صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ اس روز وہ بھی اسی طرف نکل آئے تھے فرمانے لگے بھئی خوب ملے، مَیں آپ کو خط لکھنے والا تھا۔ مَیں نے عرض کیا کہ حکم؟ فرمانے لگے کہ اعظم الدولہ محمد میر خاں سرور کی مثنویات کا ایک مجموعہ ہاتھ لگا ہے۔ اس سلسلہ میں علی گڑھ سے فرخ جلالی بدایونی صاحب نے لکھا ہے کہ محمد میر کا حال آپ کی کتاب علم و عمل (وقائع عبد القادر خانی) میں ہے میں اس کتاب کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مَیں نے عرض کیا کہ وقائع عبد القادر خانی میں جن محمد میر خان کا ذکر ہے۔ وہ دوسرے بزرگ ہیں۔ البتہ اعظم الدولہ محمد میر خان سرور اور

ان کی مثنویات کا مفصل ذکر مقالات شروانی میں موجود ہے۔ فرمانے لگے بھئی بہت خوب! پھر ارشاد فرمایا کہ یہ کتابیں فراہم کیجیے۔ میں نے دونوں کتابیں پیش کر دیں ہفتہ عشرہ کے بعد کتابیں واپس فرما دیں۔ وقائع عبدالقادر خانی کے متعلق بہت اچھے خیالات کا اظہار فرمایا۔

خاکسار کا ایک مفصل مضمون مولانا محمد احسن نانوتوی (ف ۱۳۱۲ھ) پر العلم (کراچی) میں تین قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ مولانا محمد احسن نانوتوی اپنے زمانے کے نامور عالم، مدرس اور مصنف تھے۔ انہوں نے بریلی میں مطبع صدیقی قائم کر کے علم و ادب کی بڑی خدمت انجام دی وہ بریلی کالج میں عربی و فارسی کے پروفیسر تھے انہوں نے زاد المخدرات، نافعہ خریداران وغیرہ کتابیں لکھیں (احیاء العلوم، غزالی اغاثۃ اللہفان (ابن قیم) عقد الجید (شاہ ولی اللہ) الانصاف (شاہ ولی اللہ) کنز الدقائق وغیرہ کتابوں کے ترجمے کئے تھے۔ جب یہ مضمون پروفیسر حامد حسن قادری صاحب کی نظر سے گزرا تو مندرجہ ذیل گرامی نامہ ارسال فرما کر ذرہ نوازی فرمائی۔

(کراچی ناظم آباد ۵۔ ای ۲۳/۵ ، ۷ اکتوبر ۱۹۶۰ء)

مکرمی قادری صاحب السلام علیکم

العلم (کراچی) میں مولانا محمد احسن نانوتوی پر آپ کا ایک مفصل مضمون نظر سے گزرا۔ بہت خوشی ہوئی۔ آپ نے بہت محنت اور تحقیق سے نانوتوی صاحب کے حالات لکھے ہیں۔ اللھم زد فزد ، میں چاہتا ہوں۔ آپ اس کا خلاصہ کر دیں تاکہ میں اپنی کتاب داستان تاریخ اُردو میں شامل کر سکوں فقط

احقر حامد حسن قادری

میرے ہم وطن عالم مفتی عبدالحفیظ حقانی بحیثیت خطیب و مفتی شاہی جامع مسجد آگرہ میں ایک مدت تک رہے تھے۔ مفتی صاحب اور قادری صاحب میں بہت اچھے تعلقات تھے۔ اکثر کراچی میں بھی قادری صاحب مفتی حقانی صاحب سے ملتے تھے۔ مفتی صاحب کراچی میں آنے کے بعد جناح مسجد میں خطیب مقرر ہو گئے۔

ایک مرتبہ خود میری موجودگی میں قادری صاحب جمعہ کی نماز کے بعد مفتی صاحب کے پاس جناب مسجد تشریف لائے۔ دیر تک علمائے سلف کا ذکر خیر ہوتا رہا۔ مفتی عبدالحفیظ صاحب کا ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۸ء میں ملتان میں انتقال ہوا۔ میں نے قادری صاحب سے درخواست کی کہ آپ مفتی صاحب کی تاریخ انتقال لکھ دیں۔ اس کے جواب میں قادری صاحب نے مندرجہ ذیل مکتوب گرامی مرحمت فرمایا۔

کراچی ناظم آباد ۵ ای ۲۳/۵   ۲۹ اگست ۱۹۵۹ء

جناب مکرم محمد ایوب قادری صاحب   السلام علیکم

حسب فرمائش تواریخ وفات حضرت مولانا مفتی عبدالحفیظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پیش کرتا ہوں۔ اور تاخیر تعمیل سے شرمندہ ہوں۔

مجھے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے علاوہ ان کے علم و فضل اور اخلاق و الطاف کے اس وجہ سے بھی خاص تعلق تھا کہ مفتی صاحب میرے پیر بھائی تھے یعنی میرے پیر و مرشد حضرت قبلہ عالم پیر سید جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری رضی اللہ عنہ کے مفتی صاحب مرید تھے۔ انہوں نے خود مجھ سے یہ بات کہی بھی تھی اور آگرہ میں ہمارے مکان پر جو ہفتہ وار حلقہ نقشبندیہ مجددیہ ہوتا تھا اس میں بھی مفتی صاحب شریک ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی روح پاک پر رحمتیں نازل فرماتے رہیں۔ آمین۔   والسلام   احقر حامد حسن قادری

وفات حضرت مولانا مفتی محمد عبدالحفیظ صاحب حقانی رحمۃ اللہ علیہ

هو الله وهاب غفور	مآثر تواریخ	غریق رحمت
۱۳۷۷ھ	۱۹۵۸ء	۱۹۵۸ء
ذو فضل علی العالمین	(قرآن مجید)	
۱۹۵۸ء		

مفتی عبدالحفیظ صاحب آج   پردہ فرما کے حق سے ہیں واصل
نیک دل، نیک طبع، نیک اوصاف   سربسر پاک جان و روشن دل

واعظ خوش بیان و بحر علوم　　صاحب فیض و فاضل کامل
تربت پاک ان کی نورانی　　رشک خلد ان کی اوّلیں منزل

قادری نے بھی ان کا سال وصال
لکھ دیا "وصل ذات کا حاصل"

۱۳۷۷ھ

قادری صاحب مرحوم کو تاریخ نکالنے میں خاص ملکہ اور کمال حاصل تھا۔ انہوں نے تقریباً پونے تین ہزار تاریخیں لکھی ہیں جو چار مجلدات میں قلمی صورت میں موجود ہیں۔ خاکسار نے بھی ڈیڑھ جلدوں کی زیارت کی ہے۔ قادری صاحب نے دو سو سے زیادہ تاریخیں آیاتِ قرآنی سے نکالی ہیں۔ مَیں نے اپنے چھوٹے بھائی عزیزی محمد نعمت اللہ قادری مرحوم کی شادی کے موقع پر قادری صاحب سے سرسری طور پر ذکر کیا کہ اگر آپ کوئی قطعہ تاریخ مرحمت فرما دیں تو سہروں کے مجموعہ میں شامل کر دوں۔ تیسرے یا چوتھے روز ڈاک سے ایک خط کے ساتھ مندرجہ ذیل قطعات تاریخ وصول ہوئے۔

مکرمی　السلام علیکم

حسب طلب دو قطعات تاریخ ارسال خدمت ہیں۔ رسید سے مطلع فرمائیے۔ اگر کسی روز ادھر آنا ہو تو کتاب "انوار الرحمٰن" لینے آیئے، شکر گزار ہوں گا۔

والسلام
احقر حامد حسن قادری
۲۵ مئی ۱۹۶۰ء

تواریخ جلوہ مسرّت

۱۹۶۱ء

(۱)

سجی ہے محفل شادی کھلے ہیں پھول سہرے کے
وہ جلوہ ہے کہ جی چاہے ہمیشہ دیکھتے رہیئے

بتائید دل شاد ، اس کی تاریخ مسرت زا
"عروسیٔ محمد نعمت اللہ قادری" کہیئے
۱۳۸۰ھ

(۲)

محمد نعمت اللہ قادری تم کو مبارک ہو
نمود نعمت و احسان رب سہرے کے پھولوں میں
تمہاری کتخدائی کی یہی تاریخ موزوں ہے
"ہے جلوہ ریز اب عیش و طرب سہرے کے پھولوں میں"
۱۳۸۰ھ

مولوی خصلت حسین صابری بی۔اے (ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس) مشہور صوفی بزرگ حضرت منشی ولایت علی خان المعروف بہ شاہ عزیز صفی پوری کے مرید تھے۔ وہ اپنے سلسلہ کے مشائخ اور خاص طور سے اپنے شیخ طریقت حضرت عزیز صفی پوری کا لٹریچر طبع و شائع کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے شیخ کے کلام کی تشریح و توضیح میں ایک کتاب "نغمات اسرار" مرتب کی، اور قادری صاحب سے درخواست کی کہ وہ اس کو دیکھ لیں اور دیباچہ وغیرہ لکھ دیں۔ قادری صاحب نے از اوّل تا آخر کتاب مذکور کو پڑھا اور بعض جگہ اس کو درست بھی کیا مگر از قسم دیباچہ کچھ لکھ کر نہ دیا۔ البتہ صابری صاحب کی ایک دوسری کتاب "انوار الصفا" پر مندرجہ ذیل قطعات تاریخ لکھے ہیں۔

انشاءٔ تقریظ
۱۹۶۲ء

معدن نوادر تاریخ	گل فشاں فیض
۱۳۸۱ء	۱۳۸۱ھ

"تالیف لطیف "انوار الصفا" مؤلف جناب محترم محمد خصلت حسین صابری

(۱)

آمد از فیض جناب صابری | ابر گوہر بار انوار الصفا
گشت از اذکار خاصان خدا | بحر فیض آثار انوار الصفا
گشت از اقوال و ملفوظات پاک | مخزن اسرار انوار الصفا
رحمت آمد "عند ذکر الصالحین" | گشت پر انوار انوار الصفا

قادری ہم سال تالیفش بگفت
رحمت بسیار انوار الصفا

۱۳۸۱ھ

(۲)

ہست از کلک جناب صابری | فضل و لطف داور انوار الصفا
سال تالیفش ز کلک قادری | آمدہ "سر تا سر انوار الصفا"

۱۳۸۱ھ

(۳)

یہ صابری نے لکھا حال و قال اہلِ صفا
کہ جس میں رشد و ہدایت ہے فیض و رحمت ہے
یہ قادری نے بھی تالیف کی لکھی تاریخ
کہ "واہ واہ! یہ سرچشمۂ طریقت ہے"

۱۳۸۱ھ

(۴)

دین و دُنیا کے مصالح سے ہے معمور کتاب
فیض یہ ہے، برکت یہ ہے، کرامت یہ ہے
سال ہجری میں یہ تالیف کی یہ تاریخ ہوئی
"واہ رنگ ہے عرفان حقیقت یہ ہے"

۱۳۸۱ھ

عیسوی سال میں بھی قادری اِک ہو تاریخ
"واہ مقصود گل نخل شریعت" یہ ہے

۱۹۶۲ء

ایک روز میں نے قادری صاحب سے دریافت کیا کہ حضرت آپ نقشبندی مجددی طریقہ کے صاحب سلسلہ شیخ ہیں پھر نقشبندی کی بجائے قادری کیوں لکھتے ہیں۔ یہ سُن کر مسکرائے اور فرمایا کہ بھئی یہ اس وقت کی بات ہے۔ جب میں نہ قادری تھا اور نہ نقشبندی، میں نے جب لکھنا شروع کیا اور میری چیزیں اخبار اور رسالوں میں شائع ہوئیں تو میں نے اپنے نام کے ساتھ کوئی نسبت لگانی ضروری سمجھی اور قادری لکھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس روایت کو نبھا رہا ہوں۔

قادری صاحب نے کراچی میں کسی علمی یا ادبی جلسے میں شرکت نہیں کی۔ لوگوں نے کھینچنا بھی چاہا مگر ہمیشہ محترز رہے ۱۹۶۱ء میں کراچی میں جشن جوش منایا گیا۔ ماہنامہ افکار نے اس موقع پر ایک نمبر شائع کیا۔ یہ تقریب "عبدالخالق عبدالرزاق سنگرٹ والوں" کے یہاں منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت کے لئے پہلے کسی سرکاری عہدیدار کا نام تجویز ہوا ان کے انکار پر پروفیسر حامد حسن قادری کے لئے صدارت تجویز ہوئی۔ اس تقریب کے رُوح و رواں جناب مبین الحق صدیقی صاحب تھے۔ جشن جوش کے تمام رسمی و غیر رسمی مشورے ان ہی کے دولتکدے پر ہوتے تھے۔ مولوی اعجاز الحق قدوسی اور پیر حسام الدین راشدی صاحب نے اس کمیٹی میں میرا نام بھی شامل کرا دیا طے ہوا کہ پروفیسر حامد حسن قادری صاحب سے صدارت کے لئے درخواست کی جائے اور مجھے اس کام پر مامور کیا گیا۔ رازق الخیری صاحب نے پیشکش کی کہ وہ میرے ساتھ جائیں گے اور انشاءاللہ قادری صاحب کو صدارت کے لئے ضرور آمادہ کر لیں گے۔ چنانچہ ہم دونوں قادری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ رازق الخیری صاحب نے ہر وہ نسخہ استعمال کیا جو اس موقع پر ضروری ہوتا ہے۔ مگر انہوں نے ہنستے ہوئے معذرت چاہی اور فرمایا کہ بھئی میں تو ہمیشہ

جشن و جلوس سے بھاگتا رہا اور اب آخر میں کیا اس جشن جوش میں شرکت کروں گا ؟

غالباً اکتوبر یا نومبر ۱۹۶۳ء کی بات ہے کہ غلام حسین اظہر صاحب لاہور سے تشریف لائے جو ماہنامہ سیارہ (لاہور) سے متعلق تھے۔ انہوں نے کراچی کے ممتاز اہلِ قلم اور دانشوروں کے انٹرویو لئے۔ اظہر صاحب ایک مرتبہ قادری صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے۔ مگر قادری صاحب ٹال گئے۔ دوبارہ وہ میری معیت میں قادری صاحب کے یہاں گئے۔ قادری صاحب نے حسب معمول شفقت کا اظہار فرمایا۔ اور شکایت کی کہ بہت دنوں میں ملے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کا موجودہ مکان مجھے معلوم نہ تھا اس لئے شرف ملاقات سے محروم رہا۔ اب اظہر صاحب کی معیت میں حاضر ہوا ہوں۔ اظہر صاحب نے داستانِ تاریخ اردو کے سلسلہ میں چند سوال کئے۔ انہوں نے بہت مختصر جواب دیئے۔ مغرب کا وقت قریب تھا اس لئے ہم اجازت لے کر چلے آئے۔ چلتے وقت مجھ سے فرمایا کہ بھئی کبھی کبھی ہو جایا کرو۔ میں نے کہا بہت اچھا۔ مگر افسوس کہ پھر کبھی حاضری کا موقع نہ ملا اور قادری صاحب سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔

میں مئی و جون ۱۹۶۴ء میں اپنے مخلص دوست ثناء الحق صاحب کی معیت میں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے ایبٹ آباد گیا تھا۔ ۷ جون ۱۹۶۴ء بروز یکشنبہ ایک بجے کی خبروں میں ریڈیو سے صرف اتنا سنا:

> "... صاحب کا انتقال ہو گیا، بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی کتابوں میں "داستان تاریخ اُردو" مشہور ہے۔

معلوم ہوا کہ پروفیسر حامد حسن قادری صاحب بھی چل بسے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ مرحوم کی نورانی صورت آنکھوں میں پھرنے لگی۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔ قادری صاحب شعر و سخن کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔

حکیم عبدالغفور

حکیم عبدالغفور، قدیم تہذیب کے نمائندے، مشرقی علوم کے فاضل، علمِ طب میں ماہر و کامل اور شاہ ولی اللہی افکار و نظریات کے حامل تھے۔ حلم و بُردباری طبیعتِ ثانیہ تھی۔ مگر اعلائے کلمتہ الحق میں جری تھے۔ مُلک کے اکثر رسائل و جرائد میں ان کے مذہبی و علمی مقالے شائع ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ سہ روزہ اخبار "مدینہ" بجنور نے ایک مقالہ پر ان کو انعام بھی دیا تھا۔ شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ ہوشیار تخلص فرماتے تھے۔ حکیم نثار احمد نثار سے طب اور شاعری میں استفادہ کیا تھا۔ نثار مرحوم کو مرزا قادر بخش صابر، فرزند مرزا قیصر بخت سے تلمذ تھا۔ حکیم عبدالغفور نے فارسی کی تحصیل قصبہ کے مشہور اُستاد خلیفہ ضیا علی اور عربی کی تکمیل مولانا سراج احمد شاہجہانپوری سے کی، بعض دوسرے علماء و اساتذہ مثلاً مولوی حکیم اَلطاف غنیؔ اور حکیم احسان غنی بدایونی سے بھی استفادہ کیا تھا۔

حکیم عبدالغفور نے زندگی کا آغاز درس و تدریس سے کیا۔ پھر طب و تجارت کو ذریعۂ معاش بنالیا، رجوع خلق خوب تھی۔ ان کا مطب ایک قسم کا دارالحکمت تھا اہلِ علم کی محفل بھی جم رہی ہے، مذہب و سیاست پر بھی گفتگو ہو رہی ہے علمی و مذہبی نکات بھی حل ہو رہے ہیں۔ حکیم صاحب نہایت خاموش طبیعت تھے۔ حسبِ ضرورت گفتگو میں حصہ لیتے تھے۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے سیرتُ النبیؐ کے جلسوں اور دوسرے مذہبی اجتماعات میں ان کی تقاریر ہوتی تھیں۔ محرم کے پہلے عشرہ میں، آنولہ کی مرکزی مساجد میں ان کی تقریریں ہوتی تھیں اور پسند کی جاتی تھیں۔ ان تقاریر کی ترتیب اس طرح ہوتی تھی کہ پہلے

سیرتِ مبارکہ کے واقعات پھر خلفائے اربعہ رض کے حالات اور آخری دو دنوں تاریخوں میں کربلا کے صحیح واقعات بیان کئے جاتے تھے۔ حکیم صاحب کا خط نہایت پاکیزہ تھا۔ نسخ و نستعلیق خوب لکھتے تھے۔ اِن کے والد (مُلا قادر بخش۔ ف ۱۳۲۰ھ) کا خط بھی بہت اچھا تھا۔ قصبہ کے بعض لوگ اُن کے والد کے کتبات محفوظ رکھتے تھے۔

حکیم صاحب کا کتب خانہ بھی اعلیٰ تھا۔ تین چار ہزار سے متجاوز کتابیں ہوں گی، اِن کے کتب خانے میں مذہب، طِب اور تاریخ کا اچھا ذخیرہ تھا۔ بعض اہم خطی نسخے بھی تھے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتاب "ازالۃ الخفاء" کا ایک نہایت صاف خطی نسخہ اِن کے کتب خانے میں ہماری نظر سے گزرا جو رجب ۱۱۸۷ھ کا مکتوبہ تھا۔ پُرانے اخبارات و رسائل کے فائل بھی محفوظ تھے مدینہ (بجنور) معارف (اعظم گڑھ) برُھان (دہلی) الفرقان (لکھنؤ) اور قومی زبان (دہلی) کے وہ مستقل خریدار تھے اور ان رسالوں کی باقاعدہ فائلیں رکھتے تھے۔

حکیم صاحب کی طبی مہارت و تجربہ کے دو ذاتی واقعات قابلِ ذکر ہیں۔
میری والدہ ماجدہ کے دماغ میں پھوڑا نکلا۔ کان میں شدید درد ہوا پھر اس سے پانی سا نکلا۔ حکیم صاحب سے رجوع کیا گیا، انہوں نے دیکھ کر فرمایا کہ مریضہ کے دماغ میں پھوڑا نکلا ہے، اگر فاسد مواد کا اخراج منہ کے علاوہ ہوا تو فکر کی ضرورت نہیں ہے، بصورتِ دیگر تشویش ناک بات ہے اور مریضہ کو سول ہسپتال بریلی لے جانا چاہیئے۔ چونکہ صبح کی ٹرین بریلی جا چکی تھی، لہٰذا شام تک انتظار ضروری تھا۔ حکیم صاحب نے دوا دی۔ خدا کا شکر کہ مواد منہ کے علاوہ خارج ہونے لگا۔ حکیم صاحب کو اطلاع دی گئی۔ انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور فرمایا کہ اب کل تک اور علاج کیجئے دوسرے دن کی حالت کے بعد اطمینان کا اظہار کیا اور ایک ہفتہ میں مریضہ صحت یاب ہو گئیں۔

۱۹۴۷ء کا واقعہ ہے کہ خاکسار کی نکسیر مسلسل پھوٹنے لگی۔ خون کافی مقدار

میں خارج ہوا۔ کئی ڈاکٹروں سے رجوع کیا، مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ پھر طے کیا کہ بریلی چلنا چاہیئے۔ میرے بڑے بھائی اتفاقیہ حکیم صاحب کے پاس گئے، محفل جمی ہوئی تھی، بھائی صاحب درمیانِ مجلس سے اُٹھنے لگے، اور میری علالت کا ضمناً ذکر کیا۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ تابرخاست مجلس بیٹھو۔ انشاءاللہ ناک کا خون بند ہو جائے گا۔ مجلس کے بعد جب بھائی صاحب اُٹھے تو انہوں نے ایک شیشی میں دوا کے چند قطرے دیئے کہ صبح شام ناک کے اُس نتھنے میں اِس دَوا کے دو دو قطرے ڈالو جس سے خون خارج نہیں ہوتا ہے اور سنترے خوب کھلاؤ، دو تین دفعہ کے استعمال سے افاقہ ہو گیا اور اب تک اس مرض سے مامون و محفوظ ہوں۔

حکیم صاحب تصنیف و تالیف کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ ان سے مندرجہ ذیل کتابیں یادگار ہیں۔

۱۔ تنبیہ المتکبرین . . . . . یہ رسالہ مساواتِ اسلامی کے بیان میں لکھا ہے۔ اس میں کفو کے مسئلہ پر محققانہ و مجتہدانہ بحث کی ہے۔ ایک اہم عنصر کا رد کیا گیا ہے۔

۲۔ براہینِ بالغہ . . . . بعض مذہبی و اصلاحی مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین مختلف رسائل و جرائد میں چھپ چکے ہیں۔

۳۔ وسیلۃ النجات . . . . شاہ عبدالعزیز دہلوی کا رسالہ ہے، اس کے اردو ترجمہ کی تہذیب و نظرثانی فرمائی ہے۔

۴۔ الطاف القدس . . . . مؤلف شاہ ولی اللہ دہلویؒ (اردو ترجمہ)

۵۔ المنقذ من الضلال . . . . مؤلف امام غزالیؒ (اردو ترجمہ)

۶۔ سوانحات المتاخرین آنولہ . . . . خاکسار کی درخواست پر مشاہیرِ آنولہ کے حالات پر یہ کتاب لکھی ہے۔ اِس کتاب میں سب سے پہلے آنولہ کے مختصر سے تاریخی حالات پیش کئے گئے ہیں اور بتایا ہے کہ آنولہ ہندوستان کے قدیم شہروں میں سے ہے۔ نواب

علی محمد خاں کے زمانے میں اس شہر کو خاصی ترقی ہوئی، اس کے بعد محلہ وار آنولہ کے مشاہیر کے حالات لکھے ہیں - ان مشاہیر کے سلسلہ میں ضمناً حکیم عبد الغفور نے اپنے حالات بھی لکھے ہیں۔ کتاب کا آخری حصہ ان کے خاندان اور خود ان کے حالات پر مشتمل ہے۔ کتاب کے درمیان میں اکثر جگہ بعض حضرات کے حالات کے بعد نتیجہ کے طور سے بعض علمی و مذہبی مباحث و مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

مولوی حکیم عبد الغفور کا ۵ ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۴ اگست ۱۹۶۴ء بروز جمعہ رات کے ساڑھے دس بجے انتقال ہوگیا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) خدا مرحوم کو غریق رحمت فرمائے بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔

قطعۂ تاریخ انتقال مولوی حکیم عبد الغفور مرحوم

از نذر علی درد کاکوروی

ہزار حیف کہ فرما گئے ہیں وہ رحلت	نمونہ تھے جو علمائے سلف کا در حکمت
وفات پا گئے ہیں باشعور عالم دہر	حکیم مولوی عبد الغفور عالم دہر
امین علم خفی و جلی، بڑے صالح	بڑے خلیق، بڑے متقی، بڑے صالح
مطابقت سنہ چونسٹھ کی صاف ہے کہتی	اگست چودہ تو پنجم ربیع ثانی تھی
کہی ہے ہاتف غیبی نے درد ہم سے یہ بات	"خزینہ باب بہشت" آپ کا ہے سال وفات

۱۳۸۴ھ

یہ تخرجہ ہے بقلب صبور ہے تاریخ
بغیر "داد" کے۔ "عبد الغفور" ہے تاریخ

۱۳۹۳ھ ۹

۹

۱۳۸۴ھ

شاہد احمد دہلوی

ہماری بڑی آپا کا مکان، ہمارے گھر سے تیسری گلی میں تھا۔ پندرہویں بیسویں دن یا مہینے پیچھے وہ اکثر رات کو ہمارے یہاں آیا کرتی تھیں۔ جس رات آپا آتی تھیں وہ رات ہم چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے شب برات سے کم نہ ہوتی تھی۔ کیونکہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آپا سے کہانیوں کا تقاضا ہوتا تھا۔ پہلے تو وہ "دبی مٹو کری تحفہ بی بی" کی کہانی سناتی تھیں۔ اس کے بعد ہم سب بچوں کا متفقہ مطالبہ ہوتا تھا کہ آپا ہم تو اصغری اکبری کی کہانی سنیں گے۔ اوّل تو وہ حسب معمول ٹال مٹول کرتی تھیں مگر آخر کار اصغری اکبری کا قصہ سناتیں۔ اگر چھوٹی اُمت کی اکثریت ہوتی تو یہ قصہ زبانی ہوتا اور اگر چھوٹے اقلیت میں ہوتے تو باقاعدہ کتاب پڑھی جاتی۔ مسلمانوں کا وہ کون سا گھرانا ہوگا کہ جس میں پڑھی لکھی بیبیاں اصغری اکبری کا قصہ نہ پڑھتی ہوں۔ جب کتاب مدرسہ سے ہمارا تعلق ہوا اور اردو لکھنی پڑھنی آگئی تو ہم نے اپنی آپا سے لے کر اصغری اکبری کی کتاب پڑھی۔ پھر معلوم ہوا کہ اس کتاب کا اصل نام مراۃ العروس ہے اور اس کے لکھنے والے دلی کے نامی گرامی مصنف ڈپٹی نذیر احمد ہیں۔

اس کتاب کا اثر تھا کہ اصغری اکبری اور محمودہ وغیرہ ہمارے خاندان میں متعارف شخصیتیں تھیں جو سگھڑ اور شعور دار بی بی یا لڑکی ہوتی تھی۔ اس کو اصغری کہا جاتا اور جو پھوہڑ اور بدتمیز ہوتی تھی۔ اس پر اکبری بیگم کی پھبتی کسی جاتی تھی۔ غرض ہمارے یہاں ڈپٹی نذیر احمد کی کتابیں مراۃ العروس، بنات النعش اور توبۃ النصوح وغیرہ بالعموم پڑھی جاتی تھیں اور اسی کا اثر تھا کہ اکثر بچیوں اور بچوں کے نام، حمیدہ، فہمیدہ، محمودہ اور سلیم وغیرہ رکھے جاتے تھے۔ میری دو سگی بہنوں کے نام حمیدہ اور فہمیدہ ہیں۔

اس طرح بچپن میں ہم دلی والے ڈپٹی نذیر احمد کے نام اور ان کی کتابوں سے متعارف ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں میں نے مڈل پاس کیا اور چھٹیوں میں ہمارے قصبے کے چند نوجوانوں نے ایک کتب خانہ اور دارالمطالعہ قائم کیا۔ قصبہ کے پرانے خاندانوں اور باذوق حضرات سے کتابیں مانگی گئیں جو ہزاروں کی تعداد میں مل گئیں۔ روزناموں میں انجام، وحدت، تیج، تنویر، الامان (سہ روزہ) مدینہ (سہ روزہ) اور رسالوں میں ساقی، منادی، مولوی، پیشوا، کامیاب، معارف، الفرقان، غنچہ وغیرہ آتے تھے۔ میں ساقی بالالتزام پڑھنے لگا۔ نئے پرچے کا بڑی شدت سے انتظار ہوتا تھا۔ اکثر رسالے دارالمطالعہ سے گھر لے آتا تھا۔ ایک روز میں "ساقی" پڑھ رہا تھا کہ میرے والد مرحوم نے پوچھا کہ میاں! کیا پڑھ رہے ہو؟ میں نے عرض کیا "ساقی" رسالہ پڑھ رہا ہوں۔ پوچھا کہاں سے نکلتا ہے؟ میں نے کہا کہ دلی سے نکلتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی صاحب نکالتے ہیں "اس میں افسانے بہت اچھے ہوتے ہیں۔" اس پر والد صاحب نے فرمایا۔ معلوم ہے یہ شاہد صاحب کون ہیں؟ یہ اصغری اکبری کے بھتیجے ہیں"۔ میں خاموش! پھر فرمایا کہ اصغری اکبری والی کتاب۔ ان کے دادا ڈپٹی نذیر احمد مرحوم نے لکھی ہے۔ شاہد صاحب کا قلم بھی خوب روانی دکھاتا ہے بڑے باغ و بہار آدمی ہیں۔ دلی میں ان سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ آدمی خوب ہیں"۔ ایک لہجے میں یہ ساری تقریر ہو گئی۔ یہ ہمارا پہلا غائبانہ تعارف شاہد صاحب اور ان کے رسالہ ساقی سے تھا۔

قیام پاکستان کے بعد ہم کراچی آ گئے۔ یہاں بھی ساقی ملنے لگا مگر اس میں اب وہ بات نہ تھی کہ جس کو دیکھ کر نعرہ لگایا جاتا تھا، الا یا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا! لیکن بہرحال پھر بھی بہت کچھ تھا۔ ساقی پر پتہ ہوتا تھا ـــــ ساقی، کراچی ۵ کئی مرتبہ خیال ہوا کہ ساقی کے مدیر شاہد صاحب سے ملاقات کرنی چاہیے، مگر کوئی موقع نہ مل سکا۔ ایک روز پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کا ایک علمی جلسہ تھا۔ کراچی کے بہت سے ممتاز ادیب دانشور اور اہل قلم جمع تھے اس زمانے میں میری ملازمت کا تعلق ہسٹاریکل سوسائٹی سے تھا۔ اس جلسے میں شاہد صاحب بھی تشریف لائے۔ میں نے اپنا خود تعارف کرایا۔ فرمایا بہت خوب! میں

آپ سے واقف ہوں، آپ نے وقائع عبدالقادر خانی خوب مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں دہلی سے متعلق بہت قیمتی معلومات ہیں۔ لال قلعے کے بارے میں مصنف نے جو معلومات و تفصیلات دی ہیں وہ تو کہیں اور ملتی ہی نہیں۔ مگر یہ کیا کیا کہ سید الطاف علی بریلوی صاحب نے اس کا نام "علم و عمل" رکھ کے اس کی حیثیت ہی بگاڑ دی گویا مولوی اشرف علی تھانوی کی کوئی کتاب ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق کے انتقال و تدفین کے موقع پر مولوی اعجاز الحق قدوسی صاحب کے توسط سے جمیل جالبی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ قدوسی صاحب کی معیت میں اکثر جالبی صاحب کے یہاں جانا ہوتا اور نشست رہتی، قدوسی صاحب کی ملاقاتیں خوب جم کر ہوتی ہیں۔ قدوسی صاحب کی ملاقات کا انداز کچھ اس طرح کا ہوتا کہ پہلے مبین الحق صدیقی صاحب کے یہاں جھانکی مارتے، پھر شاہد صاحب کے یہاں اور آخر میں جالبی صاحب کے یہاں پہنچتے اور کبھی اس کے برعکس ہوتا۔ مگر شاہد صاحب درمیان میں ضرور پڑتے تھے اور اب گویا شاہد صاحب سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔

شاہد صاحب سے ملاقات بالعموم عصر کے بعد یا عشاء سے پہلے ہوتی تھی۔ بنیان پہنے، تہبند باندھے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہوتی کمرے میں عام طور پر تخت پر نشست ہوتی۔ یہی ان کا ڈرائنگ روم تھا اور یہی ساقی کا دفتر چند منٹ کے بعد چائے آتی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم لوگ کمرے میں داخل ہو گئے ہیں اور شاہد صاحب اندر سے چائے کی پیالی لیے چلے آ رہے ہیں۔ پھر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی، بات ٹھہر کر آہستہ کرتے جس میں متانت اور سنجیدگی ہوتی۔ خلوص، صاف گوئی، اور کھرا پن ان کے مزاج میں بدرجہ اتم تھا۔

شاہد صاحب کے پاس تبصرے کے لیے بہت سی کتابیں آتی تھیں۔ خالص ادبی کتابوں کے علاوہ وہ دوسری سب کتابیں دوستوں کو دیدیتے تھے۔ مذہبی اور تاریخی کتابیں

تو خاص طور سے کسی نہ کسی کو دے ہی ڈالتے تھے۔ اس قسم کا اکثر مال غنیمت قدوسی صاحب کے حصے میں آتا تھا۔ ایک آدھ مرتبہ مجھے بھی حصہ رسد ملا۔ ایک روز میں پہنچا تو فرمایا خوب آئیے آپ کے لیے ایک کتاب رکھی ہے، کتاب لے جائیے اس پر ایک مختصر سا تبصرہ لکھ دیجئے۔ وہ کتاب کارخانہ نور محمد کی مطبوعہ "تقویۃ الایمان"، "تذکیر الاخوان"، "حادق الاشرار"، "سعادت دارین"، "نصیحۃ المسلمین" وغیرہ اصلاحی رسالوں کا مجموعہ تھی میں نے تبصرہ لکھ کر دے دیا جو ساقی کے سالنامہ مارچ ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔

رسالہ ساقی جنوری ۱۹۲۶ء میں دہلی سے جاری ہوا۔ شاہد صاحب نے اس رسالے کے ذریعے تہائی صدی سے زیادہ اردو ادب کی خدمت کی۔ نئے ادیبوں کی تربیت کی۔ شاہد صاحب نئی نسل کے قافلہ سالار تھے۔ ساقی میں کسی کا چھپنا استناد کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ لکھنے والوں کو معاوضہ دیتے۔ کتابوں کی رائلٹی دیتے۔ لکھنے والوں کو وہ معاوضہ دے کر خوش ہوتے تھے۔ کراچی میں آنے کے بعد بھی انھوں نے جس طرح ہو سکا ساقی کو باقی رکھا۔ ساقی سے شاہد صاحب کی زندگی تھی۔ ساقی میں اگرچہ یہاں خسارہ ہی خسارہ تھا مگر وہ اس کو ڈھکیلتے رہے ——— ساقی دہلی سے بڑی آب و تاب سے نکلتا تھا۔ اس کا دفتر ڈپٹی نذیر احمد کے مشہور تاریخی مکان میں تھا۔ ہمیں اس دارالادب کی زیارت کا بھی جولائی ۱۹۶۳ء میں شرف حاصل ہوا۔ میں دہلی گیا، اور صدر میں اپنے ایک قریبی عزیز کے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ مگر دن کا بیشتر حصہ اردو بازار میں گزرتا تھا۔ اردو بازار میں میں نے کتابوں کی ایک دکان پر بورڈ دیکھا۔ "کتب خانہ نذیریہ"، خیال ہوا کہ غالباً شمس العلماء میاں نذیر حسین (سرخیل جماعت اہلحدیث) سے متعلق کوئی کتب خانہ ہے مگر جب اندر داخل ہوا تو میں نے تصانیف ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کا بورڈ نمایاں طور سے لگا ہوا دیکھا اس سے معلوم ہوا کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم سے متعلق ہے اور اس کے مالک محمد مسلم ایم۔ اے (شاہد صاحب کے علاتی بھائی) ہیں علیک سلیک کے بعد تعارف ہوا۔ وہ کراچی کے اعزہ و احباب کو پوچھتے رہے۔ شاہد صاحب کا بھی ذکر آیا۔ پھر روزانہ ملاقات ہوتی رہی۔ محمد مسلم صاحب صوفی منش اور خوش عقیدہ آدمی

ہیں۔ تصوف سے متعلق لٹریچر شائع کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک روز فرمایا کہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب والے مکان پر جس میں ساقی کا دفتر تھا، کسٹوڈین نے قبضہ کر لیا تھا۔ ایک زمانے سے اس پر مقدمہ چل رہا تھا۔ آج اس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا ہے۔ کل کچھ احباب تشریف لائیں گے۔ آپ بھی آئیے۔ میں دوسرے دن اپنے ایک عزیز کے ہمراہ پہنچا مگر مجھے دیر بہت ہو گئی تھی اور اجتماع ختم ہو چکا تھا۔ بہر حال ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کے مکان اور ساقی کے دفتر کی زیارت کی اور سیدھا کتب خانہ نذیریہ (اردو بازار) آیا۔ مسلم صاحب نے معذرت چاہی۔ فوراً دوکان پر مٹھائی وغیرہ منگائی اور بڑے تکلف سے چائے پلائی۔

شاہد صاحب کی گفتار و رفتار، کردار و مزاج اور لباس و معاشرت میں ایک وضع داری اور مشرقی انداز تھا۔ مغربی تعلیم انھوں نے اعلیٰ پیمانے پر پائی تھی۔ مگر ان کی گفتگو سے کبھی اس قسم کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ شیروانی اور پاجامہ ان کا لباس تھا۔ چاہے کسی جلسے کی صدارت ہو یا عام شرکت، گلڈ کی کوئی بڑی سے بڑی تقریب ہو یا صدر اور گورنر کی ملاقات، شاہد صاحب کا لباس وہی ہوتا۔ ایک مرتبہ وہ غالباً یونیسکو کی دعوت پر موسیقی پر چند لیکچر دینے کے لیے باہر گئے مگر وہاں بھی ان کا لباس مشرقی ہی رہا۔

بات کرتے تو آہستہ آہستہ رک رک کر، ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ کھیلتی رہتی۔ صاف گوئی ان کا مزاج تھا جس میں کبھی کبھی کھرے پن تک کی جھلک آ جاتی تھی۔ طول کلامی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شاہد صاحب، مولوی قدوسی صاحب اور میں، جالبی صاحب کے یہاں بیٹھے تھے اور محفل جمی ہوئی تھی۔ اتنے میں سید یوسف بخاری تشریف لے آئے۔ بخاری صاحب امام جامع مسجد، دلی کے خاندان کے رکن، گفتگو سے ان کی پھول جھڑیں، باتیں ان کی میٹھی اور سلونی۔ مگر طول کلام ان کا مزاج اور قرأت لمبی۔ وہ گفتگو کرتے رہے۔ اس دوران میں شاہد صاحب بالکل خاموش رہے۔ جالبی صاحب بھی اوک گئے۔ میں اور قدوسی صاحب تھوڑی دیر کے لیے وہاں سے ٹل گئے۔ جب بخاری صاحب

چلے گئے تو پھر محفل جمی۔ دیر تک شاہد صاحب بخاری صاحب پر تبصرہ کرتے رہے۔

دلی سے شاہد صاحب کو بہت محبت تھی۔ جب تک "شاہد احمد" کے ساتھ "دہلوی" کا لاحقہ نہ لگایا جائے ان کا نام ادھورا رہتا۔ ہزاروں دلی والے ہیں مگر "شاہد احمد دہلوی" ہمیشہ لکھے اور بولے جاتے۔ ساقی میں دلی کی تہذیب و ثقافت پر کئی مضمون، مثلاً دلی کی بہاریں، برکھارت کی بہاریں وغیرہ لکھے۔ انجام میں ایک سلسلہ "دلی جو ایک شہر تھا" لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ دلی کی زبان تو گویا ان کی تین پشت سے خادمہ تھی۔ بے ساختہ لکھتے اور خوب لکھتے، دلی کے محاورے اور روزمرہ تو ان کے نوک قلم پر رہتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑے سے بڑا مضمون اس طرح ادا کر دیتے تھے جیسے نگینے جڑ دیئے ہیں۔

میں اکثر ان سے بعض محاوروں اور الفاظ کے سلسلے میں استفادہ کرتا تھا۔ شاہد صاحب سے ایک دفعہ میں نے پوچھا کہ آپ نے اپنی تحریروں میں "بیاہی تیائی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہمارے روہیل کھنڈ (بریلی و بدایوں وغیرہ) میں "بیاہی تھیاہی" بولتے ہیں اور "تھیائی" غالباً "تھیونا" مصدر سے مشتق ہے، فرمایا، ممکن ہے ایسا ہی ہو مگر دلی میں اسی طرح بولتے ہیں جیسے میں نے لکھا ہے۔" پھر میں نے عرض کیا، ایک صاحب نے "بیاہی بٹھیائی" لکھا ہے۔ فرمایا کہ وہ گوڑگانوں کے رہنے والے ہوں گے، میں نے عرض کیا کہ ہمارے علاقے میں مستورات ایک لفظ "سوفتہ" بولتی ہیں جس سے مراد سہولت یا اطمینان کی حالت ہوتی ہے۔ فرمایا کہ دلی میں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ایسے الفاظ تحریر میں رواج پانے چاہئیں۔ یہ لفظ تو صوتی اعتبار سے بھی اچھا لگتا ہے۔ جالبی صاحب نے بھی اس لفظ کو پسند فرمایا۔ اس سلسلہ میں "معافی چاہنا" اور "معافی مانگنا" بھی زیر بحث آیا فرمایا اچھے پڑھے لکھے لوگ "معافی مانگنا" بولتے ہیں مجھے اس سے بڑی کوفت ہوتی ہے۔

شاہد صاحب نے پاکستان رائٹرس گلڈ کے قیام میں پوری جدوجہد اور کوشش کی اور آخر وقت تک وہ ادیبوں کی اس جماعت سے وابستہ رہ کر اس کی ترقی و بہبود میں کوشاں رہے۔ تین سال پاکستان رائٹرس گلڈ (کراچی ریجن) کے سیکرٹری رہے۔
ان ہی کی سکریٹری شپ کے زمانے میں پاکستان رائٹرس گلڈ ہاؤسنگ سوسائٹی وجود میں آئی جس کے تحت رائٹرس کالونی کی جدوجہد شروع ہوئی، ۱۹۶۵ئ میں پاکستان رائٹرس گلڈ (کراچی ریجن) کے انتخابات ہوئے، میں بھی مجلس عاملہ کے لیے کھڑا ہو گیا۔ مولوی اعجاز الحق قدوسی صاحب ہمارے محدود معاون اور مشیر و کارکن تھے۔ یوسف بخاری اور نور الصباح بیگم کے ساتھ ہمارا مختصر سا پینل تھا۔ یہ الیکشن بھی ایک مصیبت تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ الیکشن ہمیشہ مصیبت ہی ہوتا ہے۔ بڑے پاپڑ بیلے دن کو رات اور رات کو دن کر دیا۔ وقت بے وقت مولوی قدوسی صاحب کی معیت میں گھر جھنکائی ہو رہی ہے، ہم اپنی ناتجربہ کاری سے کچھ ایسے لوگوں کے ساتھ پھنس گئے جو ہماری گوں کے نہ تھے اور بعض اوقات ان کی خفیف الحرکتی سے ہماری خواری بھی ہوئی۔ اس پورے ہنگامے میں قدوسی صاحب کی معیت میں شاہد صاحب سے ملاقاتیں ضرور رہیں۔ اور انھوں نے حسب موقع مشورے بھی دیئے مگر اپنی آفیشل حیثیت کو محفوظ رکھتے ہوئے۔ ایک روز ہم پہنچے قدوسی صاحب نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہا بھئی شاہد صاحب! ایوب قادری آپ کے پاس ایک کام سے آئے ہیں بولے فرمایئے کیا کام ہے؟ قدوسی صاحب نے ٹیپ کا بند ادکیا کہ آپ ان کو اپنا ووٹ تو دیں گے ہی مگر کچھ اور ووٹ بھی دلوایئے۔ شاہد صاحب نے ہنستے ہوئے فرمایا۔ بھئی مولوی! سنو خیر ان کو تو میں ووٹ دے دوں گا باقی اور کسی کے لیے مجھ سے اُمید نہ رکھیے اور یہ بات تو میرے لیے بالکل ناممکن ہے کہ میں کسی سے ووٹ کے لیے کہوں۔ میں کسی سے کیوں کہوں؟ ہمارا مطلب ان کے ووٹ کی توثیق کرانا تھا انتخاب ہوا، شاہد صاحب نے مجھے ووٹ دیا۔ وہ رائے شماری میں بھی تھے۔ باقاعدہ اعلان سے چند منٹ پہلے شاہد صاحب آئے اور اشارے سے مجھے کامیابی کی اطلاع دی۔ اس کے بعد جناب ابن انشاء نے بتایا کہ بھئی

تم کامیاب ہو گئے۔ اس تقریب کا ایک گروپ فوٹو لیا گیا جو متعدد رسائل میں چھپ چکا ہے۔ شاہد صاحب اس گروپ فوٹو کی گویا جان ہیں۔

شاہد صاحب پرانی تہذیب اور نئی تہذیب کی درمیانی کڑی تھے۔ مگر مشرقیت ان کے مزاج میں رسی بسی تھی، وہ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ دم توڑتے ہوئے مسلم معاشرے کی یادگار تھے۔ جہاں ان میں مروت اخلاص، ملنساری بدرجہ اتم تھی وہیں بعض منفی پہلو بھی تھے۔ "خطائے بزرگان گرفتن خطا است" کے وہ سختی سے قائل تھے۔ خاندان اور بزرگوں کا بھرم قائم رہے۔ ان روایات کو آنچ نہ آئے۔ ہوا یہ کہ جوش ملیح آبادی صاحب نے ان کے دادا جان مرحوم ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کی کتاب منتخب الحکایات کی زبان و بیان کو زمانہ حال کے مطابق کر دیا یا شاہد صاحب کے الفاظ میں اس کتاب کی غلطیاں نکالیں۔ یہ بات شاہد صاحب کو سخت ناگوار ہوئی۔ بلکہ ان کے دل میں جوش صاحب کی طرف سے گرہ پڑ گئی۔ اور جب صہبا لکھنوی نے افکار کا جوش نمبر نکالا تو شاہد صاحب نے بھی مدیر "افکار" کے جوش نمبر میں مضمون لکھا۔ پھر کیا تھا جوش صاحب کو بھی یار لوگوں نے پھر سے پرچڑھایا، انھوں نے بھی ایک "جواب نامہ" رقم فرمایا جس میں جوش صاحب نے اپنی صفائی پیش کی اور اشارے کنائے میں دو چار باتیں ایسی بھی کہہ گئے کہ جو شاہد صاحب کے خون کھولانے کا سبب بنیں اور انھوں نے اس کے انتقام میں ساقی کا جوش نمبر نکالا۔ اس کے لیے انھوں نے دہلی کا سفر اختیار کیا، پاکستان و ہند کے علمی و ادبی حلقوں سے ربط قائم کر کے ہر وہ اخبار، رسالہ، مضمون، کاغذ اور ریزہ حاصل کیا جس میں جوش صاحب کے خلاف کچھ لکھا گیا تھا اور اس طرح شاہد صاحب نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اس کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ "جوش" کے سلسلے کا جو منفی ادب تھا وہ شاہد صاحب کی کوششوں سے سب یکجا ہو گیا اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک اچھی خاصی دستاویز مہیا ہو گئی۔ اس میں ان کے مشرقی رکھ رکھاؤ، خاندانی وقار اور بڑے کا سوال تھا۔ جس کا شاہد صاحب نے بھرم رکھا۔ حالانکہ کراچی اور لاہور کے اکثر

ادیبوں اور دانشوروں نے پوری پوری کوشش کی کہ ساقی کا جوش نمبر نہ نکلے مگر شاہد صاحب کے عزم وارادہ، یا انتقامی جذبے کے سامنے کسی کی پیش نہ گئی چاہے وہ پیر حسام الدین راشدی ہوں یا جمیل جالبی۔ اس نمبر کے سلسلے میں میں نے بھی بعض چیزوں کی نشاندہی کی اور ایک دو چیزیں فراہم کرکے بھی دیں۔ یاد پڑتا ہے کہ دہلی یا کراچی سے شاہد صاحب نے مجھے ایک یا دو خط بھی لکھے۔ افسوس کہ وہ اس وقت ہم دست نہ ہو سکے۔

میں نے شاہد صاحب سے عرض کیا کہ جوش نمبر میں ایک مضمون رہ گیا جو بہت ضروری تھا۔ فرمانے لگے کیا؟ میں نے کہا کہ منتخب الحکایات کی جو غلطیاں جوش صاحب نے نکالی تھیں وہ نقل کی جاتیں اور پھر ان پر آپ کی محاکمانہ رائے ہوتی۔ سن کر خاموش ہو گئے۔

دہلی کی زبان، ادب، ثقافت، معاشرت اور تہذیب و تمدن پر لکھنے والوں میں ملا واحدی، فضل احمد خاں شیدا، خواجہ محمد شفیع، اشرف صبوحی، یوسف بخاری اور شاہد صاحب سر فہرست ہیں۔ ملا واحدی اور شیدا صاحب تو اب بالکل چراغ سحری ہیں۔ خواجہ صاحب امریکہ سدھارے۔ اشرف صبوحی صاحب کو ہمدرد نے داب رکھا ہے۔ یوسف بخاری صاحب کو اردو بورڈ کی مصروفیات کب فرصت دیتی ہیں۔ شاہد صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شاہد صاحب نے ساقی اور انجام میں دہلی کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ یک جا کرکے "دلی جو ایک شہر تھا" کے عنوان سے شائع ہونا چاہیئے اور ہم اس سلسلے میں دہلی کے نامی گرامی فرزند حکیم محمد سعید دہلوی کی توجہ مبذول کراتے ہیں کہ وہ ہمدرد اکیڈیمی سے شاہد دہلوی صاحب کی یہ یادگار روزگار کتاب شائع کر کے اہل ادب کو عموماً اور دلی والوں کو خصوصاً شکریہ کا موقع دیں[1]۔

---

[1] یہ کتاب شائع ہو چکی ہے۔

شاہد صاحب نے "دلی کی بپتا" میں نہ صرف اپنی بپتا بیان کی ہے بلکہ پوری قوم کی مصیبت کا خاکہ کھینچ دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دلی والوں پر ۱۹۴۷ء عہد انقلاب میں کیا گزری۔ فسادات کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ

شاہد صاحب نے اپنی کتاب "گنجینہ گوہر" میں سترہ ادیبوں اور دانشوروں کے خاکے لکھے ہیں۔ اردو ادب میں گنجینہ گوہر یادگار کتاب ہے۔ اس موضوع پر سب سے پہلی قابل ذکر کتاب بابائے اردو مولوی عبدالحق کی چند ہم عصر ہے اس کے بعد رشید احمد صدیقی کی گنجہائے گراں مایہ اور مولانا عبدالمجید سالک کی "یاران کہن" ہیں۔ چوتھی کتاب گنجینہ گوہر ہے جو زبان و بیان اور صداقت و خلوص کے اعتبار سے منفرد ہے۔ اس میں عظمتوں کے منارے بھی قائم کیے گئے ہیں! اور کھنڈروں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی غربت و افلاس خواجہ حسن نظامی کی کتاب سازی کی فیکٹری، ایم اسلم کی شرافت اور عظیم بیگ چغتائی اور میراجی کی سچی تصویر شاہد صاحب ہی کا قلم کھینچ سکتا تھا۔

درد کاکوروی پرانے بزرگ ہیں کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ انھوں نے اردو کے ادیبوں اور دانشوروں کا ایک تذکرہ مرتب کیا ہے۔ جدید نسل کے نمائندوں کے حالات کی فراہمی میں مجھ سے مدد چاہی۔ میں نے بہت سے لوگوں کے حالات فراہم کر کے دے دیئے ایک روز شاہد صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا۔ میرا سوال سن کر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد ٹال گئے چند روز کے وقفے کے بعد پھر میں نے ایک روز ذرا اصرار سے کہا تو انگریزی میں ٹائپ شدہ حالات دے دیئے۔ گلڈ کے سکریٹری کی حیثیت سے اکثر ضرورت پڑتی تھی۔ اس غرض سے یہ حالات ٹائپ کروا لیے تھے۔ خیر اس وقت تو ان حالات سے میں نے کام چلا لیا۔ مگر میرے دل میں یہ خواہش رہی کہ شاہد صاحب کا باقاعدہ انٹرویو لوں۔ ایک روز حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ اسپتال میں ہیں۔ جب اسپتال سے واپس آئے تو میں پھر حاضر خدمت ہوا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں چلا آیا۔ خیال

کیا کہ کسی اور روز آکر ملوں گا تو انٹرویو لوں گا کہ ۲۸ مئی ۱۹۶۷ء بروز اتوار روزنامہ "جنگ" (کراچی) میں یہ جانکاہ خبر پڑھی کہ رات گیارہ بجے شاہد احمد دہلوی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ رہے نام اللہ کا۔

قطعہ تاریخ وفات

شاہد احمد دہلوی مرحوم و مغفور مدیر "ساقی"

وصال شاہد احمد دہلوی ہے — ادب کا نثر کا انشا کا ماتم!
مدیر ساقی بزم صحافت — ادیب و نکتہ پرداز مسلّم
عبارت نثر دہلی کا نمونہ — نذیر احمد کی تحریروں کا عالم
وہ سب کچھ کہہ گیا ہے کہہ چکا ہے — رئیسؔ اس کے علاوہ کیا کہیں ہم
جہاں تک سال غم کا ہے تعلق — غم شاہد ہے گویا شاہد غم

۱۳۸۷ ہجری

رئیسؔ امروہوی

مولوی شمس الدین

۔۔۔۔۔ ۱۲ جنوری ۱۹۶۸ء کو صبح ہی سے طبیعت پر حزن و یاس کی سی کیفیت طاری تھی۔ کچھ لکھنا چاہا مگر طبیعت آمادہ نہ ہوئی، پڑھنا چاہا تو آنکھوں تلے اندھیرا سا آ گیا۔ دل کسی کام میں نہیں لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج کوئی بات ہونے والی ہے۔ وقت مقررہ پر کالج گیا مگر وہاں بھی طبیعت کچھ بندھی بندھی سی رہی۔ شام کو کالج سے گھر پہنچا تو ڈاک دیکھی۔ سب سے پہلے مخدومی جناب حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کا لفافہ کھولا اور جیسے ہی "نہایت رنج و افسوس" کے الفاظ نظر پڑے دل دھک سے ہو گیا۔ آخر پورا مکتوب پڑھا۔

محترمی جناب قادری صاحب

سلام مسنون! نہایت رنج و افسوس کے ساتھ اطلاع دے رہا ہوں کہ محترم مولوی شمس الدین صاحب تاجر کتب رات کے تین بجے ہم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ جنازہ آج چار بجے پڑھا جائے گا۔ حق مغفرت کرے مولوی صاحب مرحوم و مغفور کے سب دوستوں کو اطلاع کر دیجیے۔

مخزون

محمد موسیٰ عفی عنہٗ

مورخہ ۱۱ $\frac{۱}{۶۸}$ ۱۲ بجے دن

تھوڑی دیر کے لیے سکتے کا سا عالم رہا۔ ایک شریف، کریم النفس، علم دوست، پیکر اخلاص و انکسار شخصیت سے ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ مولوی شمس الدین کتابوں کے شیدائی، اہل علم کے فدائی اور سراپا خلوص و کرم تھے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

۱۹۶۲ء کا ذکر ہے کہ میں ایک روز کراچی کی مشہور دوکان "بک لینڈ" پر گیا ایک دوست میرے ساتھ تھے، میں نے کچھ کتابیں دیکھیں۔ بعض کتابوں اور مصنفوں کا ذکر آیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سنجیدہ شخص سٹیل پائی پر بیٹھے کتابیں دیکھنے میں مشغول ہیں۔ عمر چالیس سے متجاوز۔ سفید قمیص اور شلوار زیب تن ہے۔ چاروں طرف کتابیں جمع ہیں۔ اندازہ ہوا کہ وہ صاحب میری گفتگو میں بھی دلچسپی لے رہے ہیں۔ انھوں نے میرے دوست سے میرے متعلق آہستہ سے پوچھ لیا اور پھر بڑے تپاک سے میری طرف بڑھ کر مخاطب ہوئے۔ "مجھے شمس الدین کہتے ہیں اور میرا لاہور میں کتابوں کا کاروبار ہے۔ آپ نے ماشاءاللہ تذکرہ علمائے ہند پر مقدمہ اور حواشی خوب لکھے ہیں۔"

مولوی صاحب نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

میں نے ان کی ہمت افزائی کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مولوی صاحب! مجھے آپ کا غائبانہ تعارف مشتاق بک ڈپو (کراچی) کے مالک اکرام احمد صاحب کے ذریعہ سے حاصل ہے۔ آپ کی کچھ خطی اور نایاب کتابیں بھی ان کے یہاں دیکھی تھیں۔ مختلف اہل علم اور دوستوں سے اکثر آپ کا ذکر سنا اور اشتیاق دید بھی تھا۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا اور بہت سی باتیں ہوئیں۔ مولوی صاحب نے وہ کتابیں دکھائیں جو انھوں نے بک لینڈ سے منتخب کی تھیں، ان میں مولوی سعید احمد مارہروی مرحوم کی کتاب "آثار خیر" خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ مولوی صاحب بہت دیر تک اس کتاب کی تعریف فرماتے رہے۔ درحقیقت یہ کتاب مفید معلومات سے پُر ہے۔ اس میں اسلامی ہند کے امور خیر یعنی مدرسوں، شفاخانوں، سڑکوں، سراؤں، نہروں، تالابوں، پلوں، لنگر خانوں اور خیرات خانوں سے متعلق معلومات ہیں اور مسلمان بادشاہوں کی علمی فیاضیوں کا تذکرہ ہے۔

اسی ملاقات میں مولوی صاحب نے فرمایا کہ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری آپ کو پیر غلام دستگیر نامی مرحوم کی کچھ تصانیف بھیجنی چاہتے تھے معلوم نہیں وہ کتابیں پہنچیں یا نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ وہ کتابیں مجھے مل گئیں۔ اور اب گفتگو کا موضوع پیر غلام دستگیر نامی مرحوم ان کا علمی شغف اور حکیم محمد موسیٰ صاحب تھے۔ یہ تھے مولوی شمس الدین صاحب

سے میری پہلی ملاقات۔

مولوی صاحب کا کئی ماہ کراچی میں قیام رہا اور متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ میں ان کی قیام گاہ نگار ہوٹل گیا اور میری درخواست پر وہ میرے غریب خانے پر بھی تشریف لائے۔ اور خوب محفل جمی۔ خاکسار کے ذخیرہ کتب کو ملاحظہ فرماتے رہے۔ رخصت ہوتے وقت انہوں نے اپنے ان مخطوطات کی ایک تفصیلی فہرست بھی مرحمت فرمائی جو انہوں نے نیشنل میوزیم آف پاکستان (کراچی) کو فروخت کیے تھے۔ اور یہ فہرست مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی نے تیار کی تھی۔ میں نے اس فہرست میں سے ایک مضمون "قرآن کریم کا قدیم ترین فارسی ترجمہ" کے عنوان سے "بصائر" (کراچی) جنوری ۱۹۶۳ء میں شائع کر دیا۔ اور جب محترمی مسعود حسن صاحب شہاب ایڈیٹر الزبیر بہاولپور نے الزبیر کے کتب خانہ نمبر شائع کرنے کا پروگرام بنایا تو میں نے دوسرے مضامین کے ساتھ یہ تفصیلی فہرست بھی اپنے تعارفی نوٹ کے ساتھ شہاب صاحب کو بھیجدی۔ جو الزبیر کے کتب خانہ نمبر میں شائع ہو گئی ہے۔

مولوی صاحب کی زندگی کتابوں اور اہل علم کی خدمت کے لیے وقف تھی۔ وہ سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر علم اور اہل علم کی خدمت کو اپنا مقصد حیات سمجھتے تھے۔ اہل ذوق کو ان کی مطلوبہ کتب فراہم کرنے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔ جولائی ۱۹۶۳ء میں خاکسار ہندوستان سے کراچی واپس آیا تو دو ایک روز کے لیے لاہور بھی ٹھہرا۔ دہلی سے میں کچھ کتابیں بھی خرید کر لایا تھا۔ مولوی صاحب کی مجلس میں ضمناً دہلی کے کتب فروشوں کی تکنیک کا ذکر بھی آ گیا کہ میں نے مولوی بشیرالدین کی ضخیم کتاب "واقعات دارالحکومت دہلی" گلی قاسم جان میں پرانی کتابوں کے دوکاندار سے پچاس روپے میں خریدی۔ اور میں اس کتاب کی خریداری پر خوش ہوا۔ مگر دوسرے دن اردو بازار میں مجھے یہی کتاب بآسانی پچیس روپے میں مل گئی۔ لہذا میں نے یہ نسخہ بھی خرید لیا — مولوی شمس الدین صاحب نے چودھری بشیر احمد خاں صاحب کے ذریعہ سے خواہش ظاہر کی کہ پچاس روپے والا نسخہ اگر آپ چاہیں تو مجھے دے دیں۔ میں نے وہ نسخہ مولوی صاحب کو دے دیا۔ اب اس معتبد کی خبر ملاحظہ ہو کہ کچھ دنوں بعد مجھے

پھر لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو میرے ایک دوست نے کہا کہ قادری صاحب! بہت دنوں سے مجھے "واقعات دارالحکومت دہلی" کی تلاش تھی پچھلے دنوں یہ کتاب مولوی شمس الدین صاحب نے فراہم کردی۔ میں نے پوچھا کتنے میں ملی، انہوں نے بتایا کہ صرف پچاس روپے میں مل گئی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا کہ مولوی شمس الدین صاحب کتب فروش ہیں یا کتب بخش!

ایک واقعہ اور سنیئے۔ پنجاب یونیورسٹی میں پروفیسر حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم کا مرتب کردہ تذکرۂ شعراء، مجموعہ نغز (قدرت اللہ قاسم) کی پوری لاٹ بہت کم قیمت پر مل رہی تھی، مولوی صاحب کو اطلاع ملی لیکن انہوں نے اس وجہ سے یہ خریداری مناسب نہ سمجھی کہ شاید میں پھر زیادہ قیمت پر فروخت کرنے لگوں اور یہ بات علم اور اہل علم کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ ایک صاحب دانش تاجر کتب نے اس کو خرید لیا اور اب وہ کتاب ان کے لیے کیمیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ کاش مولوی شمس الدین خرید لیتے تو ان کی گراں فروشی کے باوجود اہل علم کو ارزاں ہی پڑتی اور اب تو اس تذکرے کی قیمت آسمان سے باتیں کرتی ہے۔

میں جب لاہور وارد ہوتا تو اندازہ ہوتا کہ مولوی صاحب خوشی سے کھِلے جا رہے ہیں۔ نئی نئی کتابیں دکھاتے، مخطوطات کی زیارت کراتے۔ مختلف کتابوں، مخطوطات اور مصنفوں پر رائے زنی ہوتی۔ میری مطلوبہ چیزیں فراہم کر دیتے۔ دوستوں اور اہلِ علم کا جمگھٹا رہتا ہی تھا۔ بعض اوقات خاص خاص احباب کو مدعو کیا جاتا۔ چاء کے دَور چلتے۔ "نعمت کدہ" پر تاخت ہوتی اور خوب محفلیں جمتیں۔ ہائے مولوی صاحب کی کن کن باتوں کو یاد کیا جائے۔

لاہور کے قیام میں میرا مشغلہ کتابوں کی تلاش اور خریداری رہتا ہے۔ میں ادھر اُدھر سے کتابیں لاتا اور مولوی صاحب کی دوکان پر رکھ دیتا۔ مولوی صاحب مجھے دور سے دیکھتے ہی دوڑتے اور ہمیشہ دوکان سے نیچے آکر کتابیں لے لیتے۔ ان کو سنبھال کر رکھتے۔ جب تک میں لاہور رہتا یہی سلسلہ رہتا۔ جب میں کراچی آتا تو ساری کتابیں مولوی صاحب کے سپرد کر آتا۔ وہ عزیزی چودھری بشیر احمد کے ذریعہ پیکٹ بنواتے اور پیٹی میں بند کر کے ٹرک سے کراچی بھجواتے بلٹی کے ساتھ مکمل فہرست اور بعض اوقات ہدایات بھی ہوتیں۔ آہ کیا دوست نوازیاں تھیں۔

ان کا یہ طریقہ سارے دوستوں کے ساتھ تھا۔ مخدومی پیر حسام الدین صاحب راشدی نے بحسرت و تاسف فرمایا کہ انہوں نے جنوری کے پہلے ہفتے میں فارسی کی کچھ کتابیں دیوان غنی یا بیدل وغیرہ خریدیں۔ مولوی صاحب نے احتیاط اور سلیقے سے پیکٹ بنا کر پیر صاحب کو دیا۔ جہاز کے سفر کی وجہ سے پیر صاحب وہ پیکٹ ایک دوست کے پاس لاہور چھوڑ آئے۔ پیر صاحب فرماتے ہیں کہ :-

"میرا وہ پیکٹ کھولنے کو جی نہیں چاہتا کہ اب ایسے پیکٹ کون باندھ کر دیگا۔ مولوی شمس الدین صاحب کی طرح ستلیوں کی گانٹھیں کون باندھے گا۔ ع

رفتید ولے نہ از دلِ ما

ستمبر ۱۹۶۶ئہ کا ذکر ہے کہ میں ایک روز دوکان پر پہنچا، میرے ہاتھ میں میری کتاب "مولانا محمد احسن نانوتوی" کے چھپے ہوئے فرمے تھے۔ مولوی شمس الدین صاحب نے وہ فرمے دیکھنے کے بہانے سے لے لیے۔ تین چار گھنٹے کے بعد میں گھوم پھر کر واپس آیا تو مجھے ایک دیدہ زیب جلد کی شکل میں وہ کتاب ملی ۔ "مولوی محمد احسن نانوتوی" کا پہلا نسخہ تھا جو میں نے اپنے محترم دوست محمد عالم مختار حق صاحب کی خدمت میں مولوی صاحب کی دوکان پر نذر کر دیا۔ مولوی صاحب صحیح معنوں میں کتاب کے قدر دان تھے

میں جب لاہور حاضر ہوتا تو مولوی صاحب مجھے کوئی نہ کوئی نادر کتاب تحفتہً مرحمت فرماتے۔ ایک مرتبہ جی۔ ڈبلو لائٹنر (پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور) کی مشہور کتاب سنین اسلام کی دو جلدیں مرحمت فرمائیں یہ وہ کتاب ہے جس کی تالیف میں مولینا فیض الحسن سہارنپوری اور مولوی غلام مصطفےٰ نے لائٹنر کو مدد دی تھی، اور جس کی زبان کی اصلاح مولانا محمد حسین آزاد نے کی تھی ۔ اسی کتاب کو دیکھ کر علامہ شبلی نعمانی کو تاریخ اسلام کو جدید انداز میں پیش کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب نے فرانسیسی زبان کی ایک قواعد مرحمت فرمائی۔ جس کا نام "اصول تحصیل لسان فرانسوی" تھا۔ یہ کتاب ترکی زبان میں سلطان عبد الحمید خاں ثانی کے عہد میں تالیف ہوئی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی متعدد تصانیف اور تصوف پر متعدد کتابیں

باصرار رحمت فرمائیں۔ یہی نہیں وہ میرے دوستوں کے ساتھ بھی یہی طریقہ برتتے تھے۔ میں نے مولوی صاحب کا غائبانہ تعارف حاجی محمد زبیر، سابق اسسٹنٹ لائبریرین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے کرادیا۔ ایک مرتبہ جب حاجی صاحب لاہور گئے تو وہ مولوی شمس الدین صاحب کی دوکان پر بھی گئے اِنہوں نے میرے حوالے سے ملاقات کی اور دوکان سے کچھ کتابیں انتخاب کیں۔ جب قیمت کا سوال آیا تو مولوی شمس الدین ہیں کہ قیمت ہی نہیں لیتے۔ بالآخر حاجی محمد زبیر صاحب نے کہہ دیا کہ اگر آپ قیمت نہیں لیتے تو میں کتابیں نہیں لیتا۔ پھر خاص رعایت سے کتابوں کی قیمت لی۔

ستمبر ۱۹۱۶ء کے دوسرے ہفتے میں جبیب جالب صاحب کی نظموں کا مجموعہ "سرِمقتل" مکتبہ کارواں سے شائع ہوا۔ چونکہ وہ ایک قسم کا موسمی تحفہ تھا مولوی صاحب نے دس بارہ کتابیں منگوا کر ان تمام احباب میں تقسیم کر دیں جو اس وقت دوکان پر موجود تھے۔ ایک میرے حصہ میں بھی آئی۔ یہ تھا اس مردِ قلندر کا اندازِ تجارت۔

حقیقت یہ ہے کہ مولوی شمس الدین مرحوم تاجران کتب لاہور کی آبرو تھے۔ دیانت و امانت اور اخلاص و محبت ان کے نمایاں جوہر تھے۔ میرے ایک نہایت ہی قریبی عزیز تجارت کتب کا مشغلہ رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب ہمیشہ ان کی رہنمائی اور مدد کرتے، مفید مشورے دیتے اور مختلف نقصانات سے بچاتے۔ ایک مرتبہ لاہور کے ایک تاجر کتب نے ان عزیز سے ایک تجارتی معاملہ کیا۔ اور اس میں صفائی معاملات کا ثبوت نہ دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس واقعہ سے مولوی صاحب کو بہت دکھ ہوا۔ حالانکہ ان کا اس لین دین سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ میرا یہ خیال ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی بالواسطہ اور بلاواسطہ کوشش سے اس معاملہ کو سلجھایا۔ چودھری بشیر احمد خاں صاحب کی کوششوں کو بھی اس کے سلجھانے میں خاصا دخل رہا۔ میرے وہ عزیز مولوی صاحب کے نیاز مند ہوئے۔

مولوی صاحب کا اپنا ذاتی کتب خانہ نہایت منتخب اور اعلیٰ تھا۔ اس میں نایاب مطبوعات اور قیمتی مخطوطات تھے۔ مطبوعات کا بیشتر حصہ ۱۸۵۷ء سے پہلے کا چھپا ہوا تھا۔ ۱۹۶۴ء میں میں نے مولوی صاحب کے پاس مطبوعہ کتابوں کا ایک ایسا ہی ذخیرہ

دیکھا۔ وہ کتابیں تمام تر لکھنؤ اور کانپور کی مطبوعہ تھیں۔ جن کی کتابت وطباعت عُلیٰ اور کاغذ دبیز تھا۔ میں نے ان میں سے کچھ کتابوں کے اقتباسات بھی لیے۔ مولوی صاحب اپنی کتابیں دکھا کر بھی بہت خوش ہوتے تھے۔ اور مولوی صاحب کے کتب خانے سے بہت سے اہل قلم، طلبہ اور دوست مستفید ہوتے تھے۔

ستمبر ۱۹۶۶ء میں چودھری بشیر احمد خاں صاحب کی معیت میں مولوی صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوا اور ان کے ذاتی ذخیرۂ کتب کو دیکھا جو زیادہ تر تصوف، تاریخ، فہرست کتب اور تذکروں پر مشتمل تھا۔ خطی کتابیں بھی خاصی تھیں۔ میں نے علامہ فضل حق خیرآبادی کی روض المجود، مولوی صاحب ہی کے یہاں دیکھی۔ افسوس کہ قلت وقت کی وجہ سے فہرست یا یادداشت مرتب نہ کر سکا۔ اس ذخیرے میں مجھے مولانا پروفیسر نور الحق علوی کی وہ درخواست ملی جو ایک طرح سے ان کے خودنوشت سوانحی اشارات پر مشتمل تھی۔ جس کو میں نے اپنے تعارفی نوٹ کے ساتھ ماہنامہ الرحیم حیدرآباد (اگست ۱۹۶۷ء) میں شائع کرا دیا۔ اسی موقع پر ان کے ربیب شفیق احمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔

مولوی صاحب کی مخطوطات پر گہری نظر تھی۔ رسم الخط کاغذ اور جلد سے مخطوطے کا اندازہ لگا لیتے تھے۔ اصلی اور جعلی مخطوطات کی پرکھ خوب رکھتے تھے۔ مختلف قسم کے خط اور خطاطوں کے حالات سے بھی واقف تھے۔ اور اس موضوع پر ان کے کتب خانے میں خاصا مواد تھا۔

مولوی صاحب کو تصوف سے خاصا ذوق تھا۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ سے ان کو گہری عقیدت تھی۔ انہوں نے سب سے پہلی کتاب مجدد صاحبؒ کے حالات ہی میں شائع کی تھی۔ اور قیام پاکستان سے پہلے وہ اکثر مجدد صاحب کے عرس میں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ان کے ذخیرۂ کتب میں مجددی نقشبندی سلسلے کی خاصی چیزیں تھیں۔ لکھنؤ کے مشہور بزرگ مولانا عین القضاۃ (ف ۱۹۲۵ء) کے حالات میں ایک رسالہ "مصباح المشائخ" مؤلفہ حکیم محمد ہادی رضا خاں (منبع الطب پریس لکھنؤ ۱۹۲۵ء) مجھے ان کے یہاں ملا جس سے میں نے ضروری اقتباسات لیے۔ مولوی شمس الدین مرحوم کو

حنفیت اور نقشبندیت سے گویا عشق تھا۔

مولوی شمس الدین مرحوم کی دوکان اہلِ علم کا مرکز تھی اور وہ ایک ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ مولوی صاحب کا حلقہ بھی وسیع تھا۔ اس میں ہر مکتب فکر و خیال کے لوگ تھے۔ یہ دوکان ایک قسم کا ادارہ تھی جہاں نہ صرف اہل علم کی آمد و رفت رہتی، بلکہ مستقل نشست جمتی۔ علم و ادب پر گفتگو ہوتی۔ شعر و ادب پر اظہار خیال ہوتا۔ تصنیف و تالیف کا جائزہ لیا جاتا۔ مصنفین کے تذکرے ہوتے۔ کتابوں کی طباعت و اشاعت پر نقد و تبصرہ ہوتا، نفس کتاب پر تنقید ہوتی۔ یوں تو لوگ قاضی عبدالودود (پٹنہ) مولانا امتیاز علی عرشی رامپوری، مالک رام (دہلی) مولانا غلام رسول مہر (لاہور) مولانا ماہر القادری (کراچی) جیسے نقادان علم و ادب کے تبصروں سے گھبراتے ہیں مگر میں مولوی شمس الدین مرحوم کی دوکان کو سب سے بڑی نقد گاہ سمجھتا تھا۔ وہاں مختلف حضرات ایک نشست میں ایک کتاب پر بڑی جچی تلی رائے کا اظہار کرتے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ اگر "ادارہ شمسیہ" میں کتاب پسند کرلی گئی تو علمی حلقوں میں باریابی کی مستحق ہوگئی اور ظاہر ہے کہ ادارۂ شمسیہ کے مستقل صدر تو مولوی صاحب تھے۔

وہاں قدیم تعلیم یافتہ مدرس بھی پہنچتے تھے اور کالج اور یونیورسٹی کے فارغ التحصیل پروفیسر اور ڈاکٹر بھی۔ یہی وہ مرکز تھا جہاں قدیم و جدید تعلیم یافتہ پہلو بہ پہلو بیٹھتے تھے۔ اور علم و ادب کے گوہر لٹاتے تھے۔ اگر وہاں مفتی سیاح الدین کاکاخیل (لائل پور) مولانا احمد حسین بخاری (راولپنڈی)، مولوی شریف احمد شرافت نوشاہی (ڈھنڈہ عالیہ)، شاہ بشیر گیلانی، مولوی محمد بخش مسلم بی اے۔ مولانا محمد عبیدہ، حکیم محمد موسیٰ امرتسری۔ مولوی امام خاں نوشہروی اور مولوی عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ملیں گے تو ان کے ساتھ ہی پروفیسر علم الدین سالک، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فقیر محمد (بابائے پنجابی) ملک عبداللطیف، علامہ اقبال احمد فاروقی، احسان دانش اور عتیق فکری (ملتان) بھی ملیں گے۔ بہت سے وہ بزرگ جن سے کراچی میں بسا اوقات ملنا دشوار ہوتا تھا ان سے لاہور میں مولوی شمس الدین مرحوم کی دوکان پر ملاقات ہونی ممکن تھی۔ ان میں ممتاز حسن، پیر حسام الدین راشدی، لفٹنٹ کرنل خواجہ عبدالرشید وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ خواجہ رضوانی، محمد عالم مختار حق، چودھری بشیر احمد خاں وغیرہ تو اس ادارے کے مستقل حاضر باش

ممبر ہیں۔

مولوی شمس الدین مرحوم راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نہایت غیور اور خود دار تھے۔ ایک مرتبہ میں نے بعض کتابوں کے متعلق عرض کیا کہ یہ کتابیں آپ فلاں لائبریری میں کیوں نہیں دے دیتے۔ وہاں ان کی قیمت اچھی مل جائے گی۔ مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ پھر اصرار کیا تو فرمایا بھئی قادری صاحب! وہاں کی پابندیاں میرے لیے ناقابل برداشت ہیں۔۔۔ پہلے اطلاع کرائی جائے۔ پھر دو گھنٹے کے بعد شرف باریابی حاصل ہو گا۔ ایک خاص وقت پر کتابیں ملاحظہ فرمائی جائیں گی۔ پھر ان کی چڑچڑی عادت۔ لہٰذا میں باز آیا ایسی تجارت سے جیسے ضرورت ہو دے جائیے دو روٹیاں اللہ تعالیٰ ویسے ہی دیتا ہے۔

نئے اور ناتجربہ کار ناشروں اور کتب فروشوں کی ہمت افزائی ان کے فرائض میں داخل تھی۔ میرے حلقے کے کئی ایسے حضرات ہیں کہ جنہوں نے کوئی کتاب چھاپی اور مولوی صاحب مرحوم کے پاس ان کی اجازت یا بلا اجازت دس بیس نسخے بھیج دیئے۔ مولوی صاحب نے ان کو ٹھکانے لگا کر پیسے فراہم کر دیئے۔

ضرورتمند اور صاحب ذوق کو کتاب فراہم کر کے ان کو دلی مسرت ہوتی تھی۔ مولوی صاحب ضرورت مند کی کتاب کی تلاش و جستجو رکھتے تھے اور فراہم ہونے پر بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک صاحب کو خزینۃ الاصفیا (مفتی غلام سرور لاہوری) کی سخت ضرورت تھی۔ مولوی صاحب نے یہ کتاب فراہم کر دی۔ اسی طرح حکیم محمد موسیٰ صاحب نے کسی کتاب کے لیے کہا وہ بھی مہیا کر دی اور جب مرض موت میں حکیم صاحب عیادت کے لیے تشریف لے گئے تو مولوی صاحب نے حکیم صاحب کو کتاب کی دستیابی کی اطلاع دی۔ حالانکہ اس وقت ان کی کتاب حیات کا آخری ورق الٹا جا رہا تھا۔

میں نے مولوی شمس الدین صاحب کو ہمیشہ ہشاش بشاش اور خوش و خرم پایا۔ چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ۔ کسی کی چغلی، غیبت تو بڑی بات ہے وہ کسی کا نام بھی بغیر احترام کے لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایک آدھ دفعہ میں نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب کو کسی کی کوئی بات پسند نہیں ہے تو وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے بعد اس کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ مولوی ابو یحییٰ امام خاں

نوشہروی ان کی دوکان پر مجھ سے ملنے آئے۔ مولوی نوشہروی چونکہ پرانے تعلیم یافتہ اور بوڑھے آدمی تھے اور پھر کٹر سے وہابی۔ یعنی کریلا اور نیم چڑھا۔ حاضرین میں سے ایک آدھ صاحب نے مولوی صاحب سے مخاطب ہونے کی کوشش کی مگر مولوی صاحب کب کسی کو خاطر میں لاتے۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے منہ پھیر لیا۔ میں نے دیکھا کہ مولوی شمس الدین مرحوم کو امام خاں کی یہ بات اچھی نہیں لگی لیکن طرح دے گئے۔ مولوی نوشہروی نے اپنے خاص انداز میں بعض لوگوں پر تنقید شروع کردی۔ میں نے محسوس کیا کہ مولوی صاحب مرحوم کو یہ انداز پسند نہیں ہے مگر برداشت کر رہے ہیں۔

مولوی صاحب نے اپنی شخصیت خود بنائی تھی۔ ۱۹۱۶ء میں کھوڑہ تحصیل حویلی (پونچھ) میں پیدا ہوئے۔ باپ کا نام احمد علی ——— تھا۔ بچپن میں داغ یتیمی لگا۔ اعزہ و اقربا نے دھن دولت کے لالچ میں ان کا چراغ حیات ہی گل کرنا چاہا۔ لہٰذا یہ اپنے گاؤں سے بھاگ کر وزیرآباد پہنچے وہاں حضرت میاں شیر محمد شرقپوری کے مرید شاہ قمرالدین کی سرپرستی میں لکھنے پڑھنے کا آغاز ہوا۔ پھر لاہور چلے آئے اور مسجد موران میں خلیفہ نصیرالدین سے فارسی اور عربی پڑھی۔ اور ان ہی کے زیر تربیت رہے۔ عربی و فارسی کی تعلیم ابتدائی منزلوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مگر مطالعہ، تجربہ، علمی شغف، اور کتابوں کی محبت و تجارت نے ان کو اہل علم کا مرجع بنا دیا۔ اول چھوٹی موٹی کتابیں بیچنی شروع کیں، اور پھر آہستہ آہستہ اس سلسلہ کو وسعت ہوئی۔ پھر تو کتابوں سے ایسا تعلق ہو گیا کہ مولوی شمس الدین اور کتابیں لازم و ملزوم تھیں، نادر و نایاب کتابوں کی تلاش میں رہتے۔ اس کی تڑپ میں بھوپال اور حیدرآباد دکن تک پہنچے۔ مغربی پاکستان کے دیہات و قصبات میں پہنچتے اور نایاب چیزیں تلاش کر کے لاتے۔ یہی سبب تھا کہ کتابوں کے شیدائی مولوی صاحب کو گھیرے رہتے۔

مولوی شمس الدین صاحب اچھے بھلے تھے کہ درد قولنج کا دورہ پڑا اور چٹ پٹ ڈھائی تین دن میں اپنی کتاب حیات ختم کر کے دارالخلد کی راہ لی اور حضرت شیخ طاہر بندگی کے قرب میں آرام فرما ہوئے۔ مولوی صاحب مرحوم اپنے احباب اور دوستوں کے دل میں

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے محبت وخلوص کا غیر فانی نقش چھوڑ گئے۔ عزیزوں اور دوستوں نے ماتم کیا۔ احباب اشکبار ہوئے۔ شناسا جان پہچان والے بھی غم میں ڈوب گئے۔ دوستوں نے اپنی عقیدت کے پھول تحریر کی صورت میں، مختلف رسائل وجرائد، جنگ، کراچی (احمد ندیم قاسمی) نوائے وقت، لاہور (عبدالقادر حسن) کوہستان، لاہور (محمد عالم مختار حق) چٹان، لاہور (عابد نظامی) لاہور، لاہور، لاہور (مولوی مسعود الرحمٰن) سواد اعظم لاہور (مفتی محمد حسین نعیمی) الاعتصام لاہور (احسان الٰہی ظہیر) تبصرہ، لاہور (مرزا جانباز) اور مجلہ طبیہ، لاہور (حکیم محمد موسیٰ امرتسری) کی وساطت سے تیار کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان اپنے ایک عظیم فرزند سے محروم ہو گیا۔ اے مرنے والے اللہ تعالیٰ تیری تربت کو نور سے بھر دے اور جنت میں تیرے مراتب بلند کرے۔ آمین [1]

---

[1] "آہ آہ مولوی شمس الدین صاحب تاجر کتب لاہور" سے سال انتقال ١٩٦٨ھ برآمد ہوتا ہے۔ (محمد ایوب قادری)

اللہ بخش یوسفی

ابھی کل کی بات ہے کہ کراچی سے مصنف شہیر جناب رئیس احمد جعفری ایک علمی و ادبی ماہنامہ "ریاض" نکالتے تھے جو غالباً دو ڈھائی سال اپنی بہار دکھا کر غائب ہو گیا۔ یہ پرچہ بڑا معیاری تھا۔ اس کے دو خاص شمارے "شوکت نمبر" اور "سلیمان نمبر" بھی نکلے تھے جو علمی و ادبی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ "شوکت نمبر" جنوری ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا جس کی پاکستان و ہند میں دھوم رہی ہیں نے "شوکت نمبر" کے بعد ایک خط جعفری صاحب مدیر "ریاض" (کراچی) کی خدمت میں بھیجا تھا۔ جس کو انہوں نے "بزم ریاض" کے عنوان کے تحت "ریاض" مجریہ فروری ۱۹۵۴ء میں شائع کر دیا۔ اس خط کا ایک اقتباس درج ذیل ہے :-

"اللہ بخش یوسفی صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا شوکت علی کا قول لکھا ہے۔ "میں نے پٹھانی کا دودھ پیا ہے۔" پھر یوسفی صاحب لکھتے ہیں "جب تحریک احیاء مسلم لیگ کے سلسلے میں پھر پشاور آئے تو انھوں نے اس گاؤں (مرغز ضلع مردان) کو خاص طور پر جا کر دیکھا جہاں سے ان کے بزرگ ہندوستان پہنچے (صفحہ ۳۱) قاضی عباس حسین دہلوی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے "ان تحریکات کے روح رواں سید شوکت علی صاحب تھے۔" (صفحہ ۵۰) مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے اپنے مضمون میں لکھا ہے "رام پور میں مولانا شوکت علی کا خاندان "شیخوں کا خاندان" کہلاتا تھا۔" (صفحہ ۸۰) اس نمبر میں تین مضمونوں میں مولانا کے خاندان کو تین نسبوں سے متعلق کرنا سمجھ میں نہیں آیا۔ اس میں آپ کی رائے اور رہبری کی ضرورت ہے۔"

اللہ بخش یوسفی کے نام سے تو میں بہت دنوں سے متعارف تھا۔ "شوکت نمبر" میں ان کا مضمون پڑھ کر ملاقات کا اشتیاق ہوا۔ چنانچہ ایک روز ایک دوست کی رفاقت اور رہنمائی میں ان کے مکان "یوسفی ہاؤس" واقع تین ہٹی (کراچی) پہنچا۔ بڑے اخلاق سے ملے۔ گفتگو کا موضوع زیادہ تر ان کا مضمون "مولانا شوکت علی" علی برادران اور تحریک خلافت رہا۔ میں نے علی برادران کے نسب کے سلسلے میں عرض کیا کہ مرادآباد و رام پور (روہیل کھنڈ) میں یہ حقیقت معلوم و مشہور ہے کہ ان کا تعلق اس علاقے کے مشہور شیوخ (کلال) سے ہے۔ اور اس خاندان کے مؤرخ و تذکرہ نویس مصنف تذکرہ کاملان رام پور مولوی احمد علی شوق نے بھی جو علی برادران کے حقیقی چچا زاد بھائی ہیں اپنے بزرگوں کو شیخ لکھا ہے۔ اور روہیل کھنڈ کے مشہور مؤرخ و نساب مولوی محمود احمد عباسی نے بھی تاریخ امروہہ میں ان کے سلسلے میں اس نظریے کی تائید کی ہے۔ یوسفی صاحب نے میری گفتگو کو بڑی توجہ سے سنا، مگر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میری رائے سے متفق نہیں ہیں۔

اس کے بعد عرصے تک یوسفی صاحب سے ملاقات نہ ہوئی مگر یہ معلوم ہوتا رہا کہ وہ پٹھانوں کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ اور اس موضوع پر ان کی کئی کتابیں نظر سے گزریں۔ میں نے ان کی کتابوں کو بڑے شوق اور توجہ سے پڑھا کیونکہ راقم الحروف کا سابق وطن علاقہ روہیل کھنڈ ہے۔ جہاں اٹھارہویں صدی عیسوی میں رجال افاغنہ داؤد خاں، نواب علی محمد خاں حافظ الملک حافظ رحمت خاں، بخشی سردار خاں، نواب دوندے خاں اور نواب نجیب الدولہ وغیرہ کا اقتدار رہا تھا۔ ان لوگوں کے واقعات و حالات اور افغانوں کی تاریخ سے مجھے دلچسپی ہے۔ یوسفی صاحب کی تصانیف میں جستہ جستہ ان لوگوں کے تذکرے بھی آئے تھے۔ اس طرح یوسفی صاحب سے ایک نوع کی فکری ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔

یکم جنوری ۱۹۶۵ء سے یوسفی صاحب کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار "آوازِ پختون" شائع ہونا شروع ہوا۔ اس اخبار کے بعض شمارے نظر سے گزرے۔ اس میں اکثر فکر انگیز مضامین نظر آئے۔ غالباً نومبر ۱۹۶۶ء کی ایک شام کو اچانک یوسفی صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ خوب گھل مل کر باتیں ہوئیں۔ تاریخ افاغنہ، پشتو زبان، اور روہیل کھنڈ کی تاریخ پر اظہارِ

خیال ہوا۔ ستمبر ۱۹۵۴ء میں میرا ایک تفصیلی مقالہ "ہم نے ہندوستان میں کیا چھوڑا"۔ "روہیل کھنڈ کی تاریخی عمارات" "العلم" (کراچی) میں دو قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ یوسفی صاحب نے اپنے اخبار "آوازِ پختون" میں اس مقالے کی دوبارہ اشاعت کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں نے یہ مضمون نظرثانی کے بعد ان کی خدمت میں پیش کر دیا جو "آوازِ پختون" کی مسلسل کئی قسطوں میں شائع ہوا۔ اور اس اخبار کے حلقۂ ناظرین میں یہ مقالہ پسند کیا گیا۔ اس کے بعد یوسفی صاحب نے خاکسار کے کئی اور مضمون جہاد ہنومان گڑھی اور تحریک سید احمد شہید وغیرہ اپنے اخبار میں شائع کیے۔

یوسفی صاحب راقم الحروف پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ انھوں نے اپنی زیرِ تالیف کتاب "مولانا محمد علی جوہر" کی مبسوط سوانح عمری جو انگریزی میں لکھی ہے، خاکسار کو دکھائی۔ علمی و تاریخی موضوعات پر ان سے گفتگو رہتی۔ تاریخ اسلام سے ان کو خاصی دلچسپی تھی اور وہ اس سلسلے میں ایک صحت مندانہ نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ ان کے خیال میں تاریخ اسلام کی ازسرِ نو ترتیب و تدوین ہونی چاہیئے اور تعصب و تنگ نظری سے بالاتر ہو کر یہ کام انجام دینا چاہیئے۔ یوسفی صاحب فرماتے تھے کہ اموی دورِ خلافت کی تاریخ خاص طور سے مسخ کی گئی ہے اس پر خصوصی توجہ دینی چاہیئے۔ وہ علماء کی تنگ نظری تعصب اور مصلحت کوشی کو بھی سخت ناپسند کرتے تھے اور بسا اوقات اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔

اللہ بخش یوسفی تحریکِ آزادی کے نامور اور نڈر سپاہی تھے۔ انھوں نے برطانوی استبداد سے ٹکر لی، قید و بند کو لبیک کہا۔ خلافت کی تحریک کو پروان چڑھایا مسلم لیگ کو مقبول بنایا۔ تحریک پاکستان کی نشر و اشاعت کی۔ وہ پاکستان کو ایک فلاحی مملکت دیکھنے کے متمنی تھے۔ جس میں سارے پاکستانی، قوم، رنگ، نسل اور علاقے کے امتیازات کو ختم کر کے ایک "بنیان مرصوص" بن جائیں، موروثی تفوق اور اجارہ داریاں ختم ہوں اور ہر شخص آزادی کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو سکے۔ ان کا اخبار "آوازِ پختون" ان ہی اصولوں کا مبلغ تھا۔

یوسفی صاحب کی صحت کچھ بری نہ تھی۔ رواں دواں چل رہے تھے۔ ۲۸ فروری ۱۹۶۸ء

کو خاکسار "یوسفی ہاؤس" حاضر ہوا تو ان کے بڑے صاحبزادے محمد علی صاحب سے معلوم ہوا کہ ان پر دل کا دورہ پڑا ہے اور وہ سول ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ دو تین دن کے بعد میں سول ہسپتال عیادت کے لیے حاضر ہوا تو یوسفی صاحب کے پاس ان کی بیگم اور دونوں صاحبزادگان محمد علی و طارق موجود تھے اور وہ بہت خوش تھے۔ نہایت خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ بڑی محبت سے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ کسے معلوم تھا کہ مرحوم سے یہ آخری ملاقات ہے۔ ۱۳ مارچ بروز بدھ ۱۹۶۸ء یوسفی صاحب نے سول اسپتال میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون رہے نام اللہ کا۔

اللہ بخش یوسفی، غلزئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا نام محمد شریف خان تھا اور ان کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ وہ زیادہ تر افغانستان سے تجارت کرتے تھے۔ ۱۹۱۹ء میں محمد شریف خاں کا انتقال ہوا۔

اللہ بخش یوسفی ۲۵ دسمبر ۱۹۰۰ء کو پشاور (محلہ کریم پورہ) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت پشاور میں ہوئی۔ ۱۹۱۵ء میں میٹرک کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۱۷ء میں لندن چیمبر آف کامرس کا امتحان پاس کیا اور فرنٹیئر کانسٹبلری میں ملازم ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ملک میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور جلیانوالہ باغ کے حادثہ فاجعہ کے بعد ملک میں آگ لگی ہوئی تھی اور انگریزوں کے اقتدار کی جڑیں ہلتی نظر آ رہی تھیں۔ اس موقع پر نوجوان یوسفی نے انگریزوں کے ظلم و استبداد کے خلاف کھلم کھلا اظہار کیا اور رولٹ ایکٹ کی مخالف تحریک میں حصہ لیا۔ ظاہر ہے کہ گورنمنٹ ملازم کا یہ اقدام کسی طرح مناسب نہ تھا۔ لہٰذا ۱۱ مئی ۱۹۲۰ء کو یوسفی صاحب کا کورٹ مارشل ہوا۔ اور ان کو قلعہ شب قدر میں چھ ماہ کے لیے نظر بند کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد انھوں نے ملازمت سے استعفاء دے دیا۔

صوبہ سرحد کی سیاسی بیداری میں یوسفی صاحب کا بڑا حصہ رہا ہے۔ جس کا اندازہ ان کی کتاب "جد و جہد آزادی میں صوبہ سرحد کا حصہ" سے ہو گا۔ انھوں نے ترک موالات کی تحریک میں بڑے زوروں سے حصہ لیا اور جب افغانستان کے لیے ہجرت شروع ہوئی تو یوسفی صاحب سکریٹری مقرر ہوئے اور شب قدر میں ان کا قیام رہا پھر پشاور آ گئے۔ خلافت

تحریک کے تو گویا صوبہ سرحد میں وہ روح و رواں تھے۔ خلافت کمیٹی کے جوائنٹ سکریٹری رہے۔ پرنس آف ویلز کی آمد پر انھوں نے شہر پشاور میں ایسی کامیاب ہڑتال کرائی کہ جس کا دوسرے شہر مقابلہ نہ کر سکے۔ اس کے نتیجے میں یوسفی صاحب اور ان کے رفقاء دو دو سال کے لیے داخل زنداں ہوئے اس طرح انھوں نے سنت یوسفی کو بھی ادا کیا۔

۱۹۳۰ء میں میاں جعفر شاہ کی شرکت میں فرانٹیر ٹریجڈی (FRONTIER TRAGEDY) کتاب شائع کی جس میں صوبہ سرحد کے سیاسی حالات، وہاں کی بدانتظامیوں اور انگریزوں کے ظلم و استبداد کا مفصّل و واضح نقشہ کھینچا گیا تھا۔ یہ کتاب ہندوستان اور انگلینڈ سے بیک وقت شائع ہوئی۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد یوسفی صاحب کو مجموعہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۱ کے تحت بمبئی سے گرفتار کر کے پشاور لایا گیا اور ان پر مقدمہ چلا اور حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی پھر سیشن سپرد ہوئے اور بالآخر حالات سے مجبور ہو کر حکومت نے ان کو رہا کر دیا۔

اس کے بعد یوسفی صاحب خلافت کمیٹی کے سکریٹری ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں یونٹی کانفرنس (UNITY CONFERENCE) ہوئی تو وہ اس میں مسلم ڈیپوٹیشن کے سکریٹری رہے۔ ابتدائی دور میں اس کانفرنس کے سربراہ مولانا شوکت علی اور بعد میں شیخ عبدالمجید سندھی رہے۔ جب ۱۹۳۸ء میں مولانا شوکت علی کا انتقال ہو گیا تو یوسفی صاحب مستقل طور سے بمبئی میں رہنے لگے اور آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سکریٹری ہو گئے۔ خلافت ہاؤس کو آباد رکھا۔ اور مسلمانانِ بمبئی کی نمایاں خدمات انجام دیں۔

یوسفی صاحب صوبہ سرحد مسلم لیگ کے پراونشیل سکریٹری رہے۔ قائد اعظم نے جو پارلیمنٹری بورڈ بنایا تھا اس کے ایک رکن اللہ بخش یوسفی بھی تھے۔ جب ۱۹۴۳ء میں صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کا کنونشن ہوا۔ تو یوسفی صاحب اس کنونشن کے جنرل سکریٹری تھے۔ جب صوبہ سرحد میں سردار اورنگ زیب خاں نے مسلم لیگ کی وزارت بنائی تو یوسفی صاحب پبلسٹی افسر مقرر ہوئے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ایک سال کے بعد ہی مستعفی ہو گئے۔

اللہ بخش یوسفی کو "علی برادران" سے عشق تھا۔ انھوں نے مولانا محمد علی جوہر کی مبسوط

سوانح عمری انگریزی زبان میں لکھی۔ ان کا مجموعہ کلام مرتب کیا۔ اپنے اور دوسرے قریبی اعزہ کے بچے اور بچیوں کے نام، محمد علی، شوکت علی، ذوالفقار علی، جوہر یوسفی، گوہر یوسفی، خالد علی، گلنار اور خالدہ وغیرہ رکھے۔ انھوں نے کراچی میں ایک ادارہ "محمد علی ایجوکیشنل سوسائٹی" کے نام سے قائم کیا جس کے مقاصد درج ذیل ہیں۔

۱۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی تحریروں اور تقریروں کی اشاعت۔

۲۔ ملت اسلامیہ پاکستان کی تعمیر و تحفظ سے متعلق موضوعات پر تصنیف و تالیف۔

۳۔ نادر اور نایاب کتابوں کا حصول اور ان کی اشاعت۔

۴۔ بلند پایہ جرائد و رسائل کا اجرا۔

۵ رئیس الاحرار کے شایان شان یادگار کا قیام۔

۶۔ کتب خانے اور دار المطالعوں وغیرہ کا قیام۔

ایک مدت تک اس سوسائٹی کے تحت ایک اسکول جاری رہا۔ یوسفی صاحب کی تمام کتابیں اسی سوسائٹی کے تحت شائع ہوئی اور اس ادارے سے پروفیسر لطف اللہ کی ایک کتاب ۱۸۵۷ء (جنگ آزادی) کے نامور قائد عظیم اللہ خاں کے حالات ۔ (MAN BEHIND THE WAR OF INDEPENDENCE) شائع ہوئی۔

اللہ بخش یوسفی صوبہ سرحد کے ایک نامور اور ممتاز صحافی تھے ۱۹۲۴ء میں انھوں نے پشاور سے "سرحد" نام کا ایک ماہنامہ جاری کیا۔ انگریزوں کے خلاف اس رسالے کا لب و لہجہ دیکھ کر جعفر شاہ صاحب نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ اس رسالے کا اجرا آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ بعد کو یہ ماہنامہ روزنامے میں تبدیل ہوگیا اور ۱۹۵۰ء تک جاری رہا۔ یوسفی صاحب نے ایک انگریزی ہفتہ وار اخبار "پروگریس" اور دوسرا اردو اخبار روزنامہ "سرحد" بمبئی سے نکالا۔ یکم جنوری ۱۹۶۵ء سے ان کی ادارت میں ایک ہفتہ وار اخبار "آواز پختون" جاری ہوا جو نہایت باقاعدگی سے ۱۹۶۷ء تک چلتا رہا۔ پھر اس کا نام بدل "الاخبار" کر دیا گیا۔ غالباً فروری ۱۹۶۸ء میں اس اخبار سے ان کا تعلق منقطع ہوگیا۔ قائداعظم کی ہدایت پر یوسفی صاحب نے پشاور سے ایک اخبار "ہلال پاکستان" نکالا تھا۔ جو قیام پاکستان تک جاری

رہا۔ ان کے علاوہ یوسفی صاحب بعض دوسرے رسائل وجرائد "ادیب (پشاور)" "خلافت" (بمبئی) "اتحاد" (کراچی) اور مشعل راہ (کراچی) وغیرہ کی ادارت سے بھی وابستہ رہے ہیں۔

اللہ بخش یوسفی ایک تجربہ کار اور منجھے ہوئے صحافی تھے۔ اخبار کا اداریہ، خبریں، مضامین ہر چیز سے ان کی تجربہ کاری اور سلیقہ شعاری کا اندازہ ہوتا تھا۔ جب "الاخبار" سے یوسفی مرحوم کا تعلق ختم ہوگیا تو اس میں وہ دلچسپی اور جاذبیت باقی نہ رہی اور وہ "اخبار" محض ہو کر رہ گیا۔

اللہ بخش یوسفی کو اردو زبان سے بہت محبت تھی۔ وہ اردو زبان کو پاکستان کی سالمیت اور بقاء کا بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ چند کتابوں کو چھوڑ کر ان کی تمام تر تصانیف اردو زبان میں ہیں۔

۱۹۴۸ء میں یوسفی صاحب کراچی آگئے۔ یہاں آکر وہ سیاست سے علیحدہ رہے پہلے تو وہ دو ایک تجارتی فرموں سے منسلک رہے۔ پھر انھوں نے اپنا ایک پریس "شریف آرٹ پریس" کے نام پر قائم کرلیا۔ اور تمام تر توجہ تصنیف و تالیف کی طرف لگادی۔ مندرجہ ذیل تصانیف ان کی دائمی یادگار ہیں۔

(۱) تاریخ یوسف زئی پٹھان۔ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صدر پاکستان نے اس کتاب پر یوسفی صاحب کو ایک ہزار روپے اور اباسین آرٹ سوسائٹی پشاور نے پانچ سو روپے انعام دیئے۔

(۲) تاریخ آزاد پٹھان (جلد اول) پہلی جلد ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔

(۳) تاریخ آزاد پٹھان (جلد دوم) دوسری جلد ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

(۴) افغان یا پٹھان۔ اس کتاب کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ آخری ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔

(۵) مختصر تاریخ کشمیر۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔

(۶) تاریخ ریاست سوات۔ ریاست سوات کی مختصر تاریخ ہے۔

(۷) حقیقت پختونستان اور ڈیونڈر لائن۔ افغانستان اور پاکستان کے سرحدی تنازعے اور

مسئلے پر ایک مفصل اور مدلل کتاب ہے۔

(۸) الامین (AL-AMIN)۔ محمد مارماڈیوک پکتھال نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر انگریزی میں ایک مختصر سی کتاب لکھی تھی جس کو یوسفی صاحب نے اضافے کے ساتھ دوبارہ مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں شائع ہوئی ہے۔

(۹) (MARTIAL LAW) مارشل لا (انگریزی) پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ پر یہ کتابچہ شائع ہوا ہے۔

(۱۰) (MEET THE FRONTIER GANDHI) اس کتاب کا ترجمہ "سرحدی گاندھی سے ملاقات" کے عنوان سے اردو، پشتو اور گجراتی میں ہو چکا ہے۔

(۱۱) احرار افاغنہ۔ اس کتاب میں غازی عبدالرحمٰن، حاجی امیر محمد خاں، قاضی محمد ولی خاں اور علی عباس بخاری کے حالات ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی ہے۔

(۱۲) جدوجہد آزادی میں صوبہ سرحد کا حصہ۔ مرکزی اردو بورڈ (لاہور) نے اس کتاب کو شائع کیا ہے۔

(۱۳) (LIFE OF MAWLANA MOHAMMAD ALI)۔ کتاب کا پہلا حصہ شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا حصہ زیر اشاعت ہے۔

اللہ بخش یوسفی کی مندرجہ ذیل تالیفات مسودات کی صورت میں ان کی صاحبزادگان کے پاس موجود ہیں۔

(۱) سوانح حیات علی عباس بخاری۔ صوبہ سرحد کے ایک قومی کارکن کے سوانح حیات۔

(۲) سلطان محمود غزنوی۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہے۔

(۳) آفریدی

(۴) مہمند

(۵) غلزئے

(۶) عدالت سے خطاب۔ فرنٹیئر ٹریجڈی (FRONTIER TRAGEDY) کی ضبطی پر عدالت کو جو بیان دیا تھا۔ اس کو مرتب کیا ہے۔

(۷) سوانح حیات علامہ عنایت اللہ مشرقی۔

(۸) تاریخ پشاور

(۹) تاریخ درہ کوہاٹ

(۱۰) کلام جوہر۔ مولانا محمد علی جوہر کا مجموعہ کلام

(۱۱) پشتو اردو لغت۔

(۱۲) تاریخ بلوچستان

یوسفی صاحب نے مندرجہ ذیل عناوین کے تحت مبسوط اور طویل مقالے، مختلف رسائل و جرائد میں لکھے۔ جو مستقل تالیف کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔

(۱) گاندھی جی کا پیش کردہ سادہ چیک (۲) وہ سرزمین جس پر دوست بھی بستے ہیں اور دشمن بھی۔ (۳) کشمیر پر ڈوگرہ راج کا ابتدائی دور (۴) یادِ ایام (۵) چودھری خلیق الزماں کے دعوے۔ (۶) سیاسیات سرحد کے ارتقائی منازل۔

مُفتی انتظام اللہ شہابی

پڑھنے لکھنے کے اعتبار سے جب میں نے ہوش سنبھالا تو "حیات خواجہ" "تذکرہ صابر" اور "فاطمہ کا لال" وغیرہ کتابیں میرے گھر کے ذخیرہ کتب میں نظر سے گزریں جن پر بحیثیت مصنف "مفتی انتظام اللہ شہابی" کا نام درج تھا مگر ان کتابوں کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوئی۔ جب مفتی صاحب کی کتاب "معلومات قرآن" پڑھی تو اس کتاب کے مؤلف کا ایک نقش دل پر بیٹھ گیا۔ اسی دوران میں ان کی کتابیں مولانا فضل حق خیر آبادی و عبدالحق خیر آبادی" (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں) "غدر کے چند علماء" "ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما" اور "علمائے حق کی مظلومیت کی داستانیں" دیکھیں تو مفتی صاحب سے غائبانہ عقیدت ہوگئی کہ یہ شخص کیا خوب صاحب قلم ہے کہ غازیوں اور مجاہدوں کی داستان کو روشناس عوام وخواص کر رہا ہے۔

پاکستان آنے کے بعد جنوری ۱۹۵۱ء سے میرا قیام عثمانیہ کالونی سے متصل وحید آباد (کراچی) میں ہوا۔ کبھی کبھی عثمانیہ کالونی (رحمانی کوارٹرز) سے گزرتا تو دیکھتا کہ ایک بزرگ ایک بچے کو کندھے پر ڈالے گھوم رہے ہیں، لباس و وضع سے بھی بے پروا اور آزاد معلوم ہوتے ہیں۔ میں کبھی کبھی ان صاحب کو سلام کر لیتا۔ اسی زمانے میں ایک روز میں سید الطاف علی بریلوی مصنف "حیات حافظ رحمت خاں"، و مدیر "العلم" سے ملنے ان کے دفتر واقع سندھ مدرسہ پہنچا۔ میں نے انھی بزرگوار کو ایک میز پر کتابوں کے مطالعہ میں محو پایا۔ بعد میں بریلوی صاحب سے معلوم ہوا کہ یہ صاحب ملک کے نامور مصنف اور اہل قلم مفتی انتظام اللہ شہابی ہیں۔

اس کے بعد مفتی صاحب سے علیک سلیک کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اکثر بریلوی صاحب کے ہاں ملاقات ہوتی۔ اسی دوران میں ان کی ملازمت کا تعلق قاموس الکتب کی ترتیب و تدوین

کے سلسلے میں انجمن ترقی اردو سے ہوگیا تھا (۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۹ء) اکثر اردو کالج اور انجمن میں ملاقات ہوتی، کتابوں کا تبادلہ اور علمی مذاکرات رہتے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی صد سالہ برسی کے موقع پر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے جنگ آزادی کی مکمل و جامع تاریخ چار جلدوں میں مرتب کرنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ راقم الحروف ڈاکٹر معین الحق صاحب کی تحریک پر آٹھ سالہ گورنمنٹ ملازمت (محکمہ رسد و ترقیات، وزارت صنعت) چھوڑ کر سوسائٹی سے منسلک ہوگیا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر معین الحق صاحب کے ہاں مفتی صاحب کی آرجار بہت بڑھ گئی اور ۱۹۵۹ء میں تو وہ سوسائٹی میں ملازم ہی ہوگئے۔ لہٰذا اب ان سے رفاقت و معیت کا تعلق ہوگیا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی ۱۸۹۲ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے، ان کے والد مولوی اکرام اللہ (ف ۱۹۰۴ء) مختاری کا مشغلہ رکھتے تھے تصنیف و تالیف کا بھی شوق تھا۔ مفتی صاحب کا خاندان اودھ کے مشہور قصبہ گوپامئو (ضلع ہردوئی) کا رہنے والا تھا، ان کے دادا انعام اللہ صاحب بہ سلسلہ روزگار آگرہ آئے تھے۔ مفتی صاحب اکثر اپنے نام کے ساتھ "گوپاموی ثم اکبرآبادی" لکھا کرتے تھے۔

مفتی صاحب نے مروجہ طریقہ پر عربی فارسی کی تحصیل کی۔ مفتی محمد رمضان، مولوی سعادت اللہ بنی اسرائیلی سنبھلی (ف ۷، نومبر ۱۹۴۷ء) اور مولوی عبدالغنی ساکن قائم گنج ان کے اساتذہ میں تھے۔ مفتی صاحب کی تعلیم متوسطات سے آگے نہ بڑھ سکی۔ قدیم طریقہ تعلیم اور وہ بھی نجی طور پر، مفتی صاحب کما حقہ، مستفید نہ ہو سکے مگر یہ حقیقت ہے کہ مفتی صاحب علمی ذوق، مبدائے فیاض سے لے کر آئے تھے ان کی تعلیم کی کمی کو بڑی حد تک ان کی کتب بینی اور مطالعہ نے پورا کر دیا۔ کچھ دنوں سروییر کا کام سیکھا اور کلابھون بڑودہ سے ۱۹۰۹ء میں سرویر کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

مفتی انتظام اللہ شہابی کے بہنوئی منشی ارشاد حسین ابن ولایت علی مرادآبادی اچھے کھاتے پیتے شخص تھے، ان کا ہاتھی اور شیر وغیرہ کی تجارت کا مشغلہ تھا وہ یہ جانور روساء امراء اور عجائب گھروں کو فراہم کرتے تھے، وہ بھی اپنے بہنوئی کے اس کاروبار سے وابستہ

ہو گئے اور ۱۹۱۵ء سے ۱۹۳۵ء تک مفتی صاحب کا یہ مشغلہ رہا۔ اس سلسلے میں وہ تقریباً تمام شمالی ہند اور رجواڑوں میں گھومے پھرے۔ چونکہ علمی ذوق طبیعت میں رچا بسا تھا لہٰذا جہاں جاتے وہاں کے علماء، مشائخ اکابر اور مشاہیر سے ملتے، کتب خانے اور آثار قدیمہ دیکھتے اور اپنے ذوق کی تسکین کرتے، دیار و امصار میں گھومے پھرے، ہر مجلس اور سوسائٹی کو دیکھا، سفر اور تجربے نے ان کو "مردِ جہاندیدہ" بنا دیا تھا وہ لوگوں سے نباہنا خوب جانتے تھے اور پھر مختلف و متضاد ماحول میں نباہتے تھے۔ مشرقی تہذیب کا نمونہ اور وضعداری کے پابند تھے۔

۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء تک مفتی صاحب دہلی کے ایک اشاعتی ادارے "نیا کتاب گھر" سے وابستہ رہے۔ ایک سو پچیس روپے مشاہرہ ملتا تھا، اس ادارہ سے ان کی کئی کتابیں، نظیر اور ان کے معاصر، بیگمات اودھ کے خطوط، غدر کے چند علماء، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء، اسلامی معاشرت، احکام القرآن، لطائف الشعراء، صناد یدِ ہند، علمائے حق کی مظلومیت کی داستانیں، سلطانہ رضیہ، تاریخ خاندانِ مغلیہ اور آتش بے دود وغیرہ شائع ہوئیں۔ مفتی صاحب کچھ وقت ندوۃ المصنفین (دہلی) کو بھی دیتے تھے۔ پچاس روپے ماہوار معاوضہ ملتا تھا چنانچہ اس ادارے کے لیے سلاطین ہند (دو حصے) اور تاریخ ملت (آٹھ جلد) لکھیں۔ ندوۃ المصنفین کے ارباب حل و عقد مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمان اور دوسرے اکابر مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولوی محمد میاں، مولانا امداد صابری، مولوی عبدالروف بانی نذیریہ لائبریری (نبیرہ شیخ الکل شمس العلماء میاں نذیر حسین سرگروہ اہل حدیث) عزیز حسن بقائی ایڈیٹر "پیشوا" کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا اور ملنا جلنا رہتا تھا۔ جب مفتی صاحب موج میں ہوتے تو ان حضرات کے اکثر واقعات مزے لے لے کر سنایا کرتے تھے۔

۱۹۴۹ء میں انجمن اسلامیہ (آگرہ) کی بیس ہزار کی رقم خطیر حاجی ریاض الدین سکریٹری جناح کالج اپنے اور مفتی صاحب کے دستخط سے برآمد کر کے کراچی لے آئے۔ حکومت اس "جرم" میں مفتی صاحب کو ماخوذ کرنا چاہتی تھی کہ وہ سن گن لگتے ہی فوراً راہی پاکستان ہوئے اور ٹنڈو آدم میں قیام کیا۔ ۱۹۵۱ء میں کراچی پہنچے۔ مفتی صاحب "صاحب قلم" تھے۔ مختلف اشخاص اور

اداروں سے رجوع کیا مگر کوئی مستقل تعلق پیدا نہ ہو سکا۔ وقت گزرنے اور حالات سدھرنے کے ساتھ ساتھ مختلف ادارے، انجمن اسلامیہ، ایجوکیشنل کانفرنس، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اور جناح کالج وغیرہ کا قیام عمل میں آیا اور اب مفتی صاحب اور یہ ادارے لازم و ملزوم تھے۔

مفتی صاحب کی زندگی "ادارہ و قلم" سے عبارت تھی وہ درحقیقت "انجمن ساز" اور "ادارہ باز" شخص تھے، تقسیم سے قبل ہندوستان میں مختلف اداروں اور تحریکات سے وابستہ رہے۔ "کانگریس"، "خلافت کمیٹی"، "مسلم لیگ"، "امن سبھا"، "وار فنڈ کمیٹی" اور حد یہ ہے کہ فری میسن سوسائٹی میں بھی شریک ہوئے۔ اسی طرح پاکستان آنے کے بعد مختلف اداروں اور انجمنوں سے منسلک رہے۔ ان ہنگاموں پر موقوف تھی ان کی زندگی!۔ وہ نہایت مرنجان مرنج اور باغ و بہار شخصیت تھے۔

مفتی صاحب جب موج میں ہوتے تو اپنے لیے "یار خاں" کا لفظ استعمال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "یار خاں" کے بغیر کوئی ادارہ، ادارہ نہیں اور کوئی انجمن، انجمن نہیں، چاہے انھیں صدر بنا دیجئے یا سکریٹری، چاہے خازن یا عام ممبر، یہ ارباب حل و عقد بلکہ "ارباب انجمن" پر منحصر تھا کہ مفتی صاحب کو کونسا عہدہ دیا جائے، وہ ہر ایک میں راضی، بڑے بڑے کاٹیاں مفتی صاحب کا اشتراک ضروری سمجھتے تھے، بڑی صفت یہ تھی کہ وہ مخالف و متضاد ماحول میں مقبول و معزز، انجمن ترقی اردو پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن اسلامیہ، مفتی صاحب ہر ادارے سے منسلک اور ہر جگہ معتمد و محترم، ان کی نظر تنظیم و تعمیر پر رہتی تھی، برائی اور بدگوئی سے گریزاں اور اختلاف و انشقاق سے دور، جب دو دوستوں میں رنجش یا اختلاف ہوتا تو مفتی صاحب مصالحت کراتے، آڑے وقت میں مفتی صاحب کی بردباری و تحمل اور تدبیر و رائے کام آتی، پھر تواضع و انکسار کا یہ عالم کہ جلسے میں سب سے پیچھے کسی گوشے میں ٹکے ہوں گے، مگر نظر انتخاب کی رسائی کا یہ حال کہ اپنے مطلب اور گوں کے آدمی کو بھرے مجمع میں سے چھانٹ لیتے غرض وہ بڑے باصلاحیت انسان تھے۔

مفتی صاحب کو لکھنے پڑھنے کا بڑا شوق تھا، علمی ماحول اور علمی فضا میں آنکھیں کھولیں، گھر میں ایک اچھا کتب خانہ تھا۔ لہٰذا تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کی سب سے پہلی

کتاب ۱۹۱۴ء میں داعی اسلام چھپی اور آخری کتاب "قافیہ سنجان اکبرآباد" تھی جو (انجمن اسلامیہ میگزین) ستمبر ۱۹۶۸ء میں مکمل ہوئی۔ چھپن سال تک ان کا قلم حرکت میں رہا۔ اور انھوں نے بہت کچھ لکھا وہ "بسیار نویس" اور "زود نویس" تھے۔ انھوں نے اپنی حالیہ تصنیف "مشاہیر اکبرآباد" میں اپنی ایک سو انتیس (۱۲۹) کتابوں کے نام لکھے ہیں اس میں بعض کتابیں کئی کئی حصوں میں ہیں، اور پھر بھی یہ فہرست نامکمل ہے۔

مفتی صاحب نے مذہب، تاریخ اسلام، تاریخ ہند و پاکستان، تحریک آزادی، تاریخ تعلیم و علماء، ادب، سوانح اور کتابیات، غرض بہت سے موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ وہ "جمع و تدوین" کا کام خوب کرتے تھے، ان کی وسعت مطالعہ اور قوت حافظہ ان کو خوب مدد دیتے تھے۔ اخذ و قبول روایات میں وہ بڑے فراخ دل واقع ہوئے تھے لہٰذا ان کے اکثر مندرجات جرح و تنقید کی زد میں آجاتے تھے، مفتی صاحب ان باتوں کی قطعاً پروا نہیں کرتے تھے۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء پر اردو میں بعض لوگوں نے کام کیا تھا مگر ان کی حیثیت انگریزوں کے مداحین سے زیادہ نہ تھی۔ خواجہ حسن نظامی نے اس مواد کو افسانوی رنگ میں پیش کیا مگر اس موضوع پر قومی تحریک کی حیثیت سے مفتی صاحب ہی نے قلم اٹھایا۔ انھوں نے اس تحریک میں علمائے ہند و پاکستان کی شرکت کا سراغ لگایا اور تاریخی شواہد اور ہم عصر تحریرات کی روشنی میں ثابت کیا کہ اس تحریک کے قائدین میں مولوی احمد اللہ شاہ مدراسی، عظیم اللہ کانپوری، مولوی لیاقت علی الہ آبادی اور مولوی سرفراز علی گورکھپوری وغیرہم سرفہرست تھے اور اس تحریک میں مسلم زعماء، امراء اور عوام نے بھرپور حصہ لیا۔

مفتی صاحب کو آگرہ اور اودھ سے خاص تعلق تھا، انھوں نے آگرہ اور مشاہیر آگرہ پر کئی کتابیں لکھیں وہ اپنے کو سلسلہ علمائے فرنگی محل اور مدرسہ خیرآباد سے وابستہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے ان دونوں خانوادوں کے متعلق بھی لکھا ہے بلکہ مولانا فضل حق خیرآبادی کو نئی نسل سے متعارف کرانے میں مفتی صاحب کا خاصا حصہ ہے۔

مفتی صاحب کی کتابیات پر اچھی نظر تھی اور وہ اس فن کی تکنیک سے خوب واقف تھے۔ ان کا ذہن اور حافظہ خوب تھا۔ کتاب، مصنف اور موضوع ان کو ازبر تھے اگر ان سے

ان کے موضوع پر گفتگو کی جاتی تو وہ پہلی ملاقات میں تو مخاطب پر ایسا چھا جاتے تھے کہ ان کا لوہا ماننا پڑتا تھا۔ انگریزی کی بھی شد بد تھی، کتب حوالہ جات سے کام نکال لیتے تھے۔ ابن خلکان (انگریزی) "مطبوعہ ہسٹاریکل سوسائٹی" کا انھوں نے انڈکس بنایا۔

مفتی صاحب کی کتابیں آئے دن بازار میں آتی رہتی تھیں۔ ان کی کتابیں تبصرہ و تعارف سے مستغنی تھیں۔ وہ کبھی تبصرے کے لیے کتاب نہیں بھیجتے تھے، اگر کوئی ان کی کتاب پر تنقید کرتا، یا ان کے کسی بیان کی تردید کرتا تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ انھیں کیسا ہی بھڑے پر چڑھایا جاتا مگر وہ برف کی سل ہو جاتے تھے، کہا کرتے تھے "میاں! آگے بڑھو پیچھے مت دیکھو، ہم غلطی کرتے ہیں دوسرا تصحیح کر دے گا کسی نہ کسی عنوان سے "یار خاں" کا ذکر تو آرہا ہے" ایک دفعہ ایسا ہوا کہ مفتی صاحب کی کتاب "جغرافیہ قرآں" انجمن ترقی اردو سے شائع ہوئی میں نے اس پر تنقیدی تبصرہ کر دیا۔ میں نے سوچا کہ وہ ناراض ہوں گے مگر ان کے طرز عمل میں کوئی فرق نہ آیا۔ پہلے تو خیال ہوا کہ یہ تبصرہ ان کی نظر سے نہیں گزرا ہو گا، مگر جب یہ معلوم ہوا کہ وہ تبصرہ دیکھ چکے ہیں اور ان کے طرز عمل کو حسب معمول مشفقانہ و محبت آمیز پایا تو مجھے حیرت بلکہ پشیمانی ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی کتابیں دینی بند کر دیں مگر اپنی کتابوں کے پیش لفظ یا دیباچہ میں میرا ذکر ضرور کرتے رہے۔

ایک اور لطیفہ ملاحظہ ہو مفتی صاحب ایک کتاب "آخری بزم" لکھ رہے تھے کسی واقعہ کے متعلق کمزور یا مشکوک ماخذ کی بنا پر مدیر "قومی زبان" مشفق خواجہ صاحب نے کہا کہ مفتی صاحب اگر آپ نے یہ واقعہ لکھا تو میں تنقید و تردید کردوں گا۔ انھوں نے متبسم ہو کر فرمایا کہ میاں آپ کیا تردید کریں گے؟ کتاب چھپ کر آئی تو وہ روایت موجود، اور کتاب کے پیش لفظ میں مدیر "قومی زبان" کی اعانت اور مشورے کا بھی شکریہ ادا کیا گیا ہے ــــــ مفتی صاحب کسی کی برائی نہیں کرتے تھے اور بگاڑ کی بجائے بناؤ کی بات کرتے تھے وہ جس سے ربط و تعلق بڑھاتے اس کو تصنیف و تالیف کا ضرور چسکا لگا دیتے تھے چاہے وہ رئیس ہو یا زمیندار، افسر ہو یا تاجر، میجر شمس الدین اور سید رضوان اللہ وغیرہ انھی وجوہ سے ان پر جان چھڑکتے تھے۔ ڈاکٹر معین الحق اور الطاف علی بریلوی صاحب ان کی قدر کرتے تھے۔ بہت سے مضامین

اور کتابیں دوسروں کے نام سے لکھ دیں اور ان کو مضمون نگار اور مصنف بنا دیا۔ اس سلسلے میں وہ بڑے فراخ دل واقع ہوئے تھے۔

مفتی صاحب کے مزاج میں بڑی لچک تھی۔ ایک مرتبہ فضل الرحمان مرحوم سابق صدر پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے کسی مقالے کی ترتیب کے سلسلے میں ان سے واقدی کے حالات لکھنے کے لیے فرمایا، انھوں نے خاصا مواد واقدی کے مناقب میں جمع کر دیا۔ جب فضل الرحمان نے اس کو دیکھا تو کہا کہ یہ آپ نے کیا کیا آپ اس کے ہر پہلو پر لکھیئے۔ کمزور پہلو کو کیوں چھوڑ دیا؟ چنانچہ اب مفتی صاحب نے واقدی کے کمزور پہلو پر لکھ ڈالا۔

جب ڈاکٹر معین الحق صاحب نے دائرہ معین المعارف کے قیام کا ارادہ کیا تو مفتی صاحب نے اس ادارے کے قیام اور ترقی و بقا کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ دائرے کے لیے کوئی مستقل ذریعہ آمدنی نہ ہونے کے باوجود مفتی صاحب کی کوششوں کی بنا پر دائرے کا کام رواں دواں چلتا رہا۔ دائرے کا سہ ماہی مجلّہ "بصائر" بھی نکلتا رہا اور کتابوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ وہ مایوس ہونا تو جانتے ہی نہ تھے کہیں نہ کہیں سے کوئی سبیل نکالتے ہی رہتے تھے۔

مفتی صاحب مختلف رسائل و اخبارات سے بھی وابستہ رہے، دربار اخبار (آگرہ) اردوئے معلیٰ (دہلی) پیامِ حق (کراچی) ان کی ادارت میں نکلے، کچھ دنوں برہان (دہلی) سے بھی متعلق رہے، دس سال سے انجمن اسلامیہ میگزین، کے مدیر تھے، خباح لٹریری اکیڈیمی، ان کی بدولت زندہ تھی، چونکہ اکیڈیمی کا مستقل فنڈ یا گرانٹ وغیرہ نہ تھی اس لیے وہ متعدد کتابیں انجمن اسلامیہ میگزین میں بالاقساط شائع کرتے رہتے تھے اس طرح اس اکیڈیمی سے مفتی صاحب کی ایک درجن سے زائد تصانیف (۱) نجیب الدولہ اور جنگ پانی پت (۲) آخری بزم (۳) اسلامی نظام تعلیم کا چودہ سو سالہ مرقع (۴) مسلم فلاسفہ (۵) حیات خان آرزو (۶) چند مسلم سائنسدان (۷) شیخ الشیوخ شہاب الدین عمر سہروردی اور ان کے علمی و سیاسی کارنامے (۸) شعرائے دربار رسالت (۹) مشاہیر اولیائے ہند و پاکستان (۱۰) مشاہیر اکبر آباد (۱۱) اسوۃ الرسول من القرآن (۱۲) حیات نظیر (۱۳) قافیہ سنجان اکبر آباد طبع و شائع ہوئیں۔

جب مفتی صاحب عثمانیہ کالونی میں رہتے تھے تو میرے ہاں ان کی آمد و رفت نہ تھی۔ مہینے

دو مہینے میں آنا ہوتا تھا۔ جولائی ۱۹۶۶ء میں میں اپنے نئے تعمیر شدہ مکان (نارتھ ناظم آباد) میں منتقل ہو گیا۔ اتفاق کی بات کہ سال بھر کے بعد ۱۹۶۷ء میں مفتی صاحب بھی نارتھ ناظم آباد ہی میں آ گئے۔ ان کا مکان بھی اسی بلاک میں تعمیر ہوا تھا۔ اب میرے ہاں مفتی صاحب کا آنا جانا دوسرے تیسرے دن ہو گیا۔ جمعہ اور اتوار کا آنا تو لازمی تھا، آتے، مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔ مختلف اسکیمیں بنتیں، کتابوں اور مصنفوں کی باتیں ہوتیں اور خوب گھٹتی۔

۱۲ر جون ۱۹۶۸ء کو میرے ہاں چند احباب مدعو تھے مفتی صاحب بھی تشریف لائے دو تین روز کے بعد معلوم ہوا کہ وہ علیل ہیں اور ان کو بخار آ گیا ہے۔ میں خیریت طلبی کے لیے گیا تو پتا چلا کہ اس دن دفتر (ہسٹاریکل سوسائٹی) میں بخار آ گیا تھا اور وہاں سے رکشا میں آئے۔ یہ ایسا بخار تھا کہ جان لیوا ثابت ہوا۔ مختلف ڈاکٹروں اور اطباء کے زیر علاج رہے۔ ایک ڈیڑھ ہفتے سول اسپتال میں بھی رہے۔ ۱۶ر اگست کو وہاں سے گھر آ گئے۔ ۱۸ر اگست کو میں ثناء الحق صاحب کی معیت میں عیادت کے لیے گیا تو حسب معمول ڈرائنگ روم میں آ کر ملاقات کی۔ اس کے بعد ایسے صاحب فراش ہوئے پھر باہر نکلنا نصیب نہ ہوا اور نکلے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکلے مگر یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان کے رفقاء میں سید سخاوت علی نے علالت کے زمانے میں حق رفاقت پورا پورا ادا کیا۔

۶ر ستمبر ۱۹۶۸ء کو عزیزی سید فرید الحق اور پروفیسر سید مرتضیٰ کے ہمراہ دیکھنے کے لیے گیا۔ آج حالت سخت مایوس کن تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اب "مجلس تصنیف و تالیف" درہم برہم ہوا چاہتی ہے اور مصنف کی کتاب حیات کا آخری ورق الٹا جا رہا ہے دوسرے دن مفتی صاحب کی بستر مرگ کی دو تصویریں لیں۔ ۸ر ستمبر ۱۹۶۸ء بروز اتوار ساڑھے چھ بجے شام مفتی صاحب کی کتاب حیات تمام ہوئی۔ اللّٰھم اغفرلہٗ۔

امیرُ الدّین خاں جے پُوری

انغانستان و علاقہ روہ کے بہت سے خاندان روہیلوں کے دورِ حکومت میں روہیل کھنڈ میں بالعموم اور رام پور میں بالخصوص آگر آباد ہوئے ان ہی میں ایک خاندان حاجی رحیم الدین خاں مرحوم کا تھا جو روہ سے آکر رام پور کے محلہ بنگلہ آزاد خاں میں سکونت پذیر ہوا۔ حاجی رحیم الدین خان زیارت بیت اللہ سے مشرف، نہایت دیندار اور مقدس بزرگ تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے مولوی جلال الدین خاں جلالی ۲۵ شوال ۱۲۴۵ھ کو رام پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فارسی کی مروجہ تعلیم مولوی خلیفہ غیاث الدین عزت، صاحب غیاث اللغات (ف ۱۲۶۸ھ) اور شیخ احمد علی رام پوری (ف ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۲ء) سے حاصل کی جو رام پور کے مشہور استاد تھے۔[۱]

مولوی جلال الدین نے عربی علوم کی تحصیل رام پور کے دوسرے نامی گرامی علمائے سے کی بعد ازاں وہ مختلف مقامات پر ملازم رہے۔ جب صاحبزادہ زین العابدین خاں عرف کلن میاں کسی نزاع خاندانی کی وجہ سے جے پور آگئے تو ان کے ساتھ مولوی جلال الدین خاں بھی چلے آئے اور صاحبزادہ صاحب کی سرکار سے وابستہ رہے۔

مولوی جلال الدین جے پور سے ترکِ تعلق کے بعد رام پور چلے گئے اور وہیں خانہ نشین ہوگئے۔ درس و تدریس کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا۔ رام پور اور جے پور میں ان کے سیکڑوں شاگرد تھے۔ ۱۱ شعبان ۱۳۱۳ھ کو مولوی جلال الدین خان کا رام پور میں انتقال ہوا اور مولوی ولی اللہ کے

---

[۱] ان اکابر و افاضل کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ تذکرہ کاملان رام پور مؤلفہ احمد علی خاں شوق مطبوعہ دہلی ۱۹۲۹ء و انتخاب یادگار مؤلفہ منشی امیر احمد مینائی، (تاج المطابع لکھنؤ ۱۲۷۶ھ)

قبرستان میں دفن ہوئے۔ وہ اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں فکرِ سخن کرتے تھے۔ منشی امیر احمد مینائی لکھتے ہیں[1]

"مولوی جلال الدین احمد تخلص یندی ابن حاجی رحیم الدین خاں اصل وطن یہی ریاست ہے۔ اب مدت سے جے پور میں اقامت ہے۔ مرد مستغنی ہیں۔ عالم و صوفی ہیں۔ نظم و نثر فارسی و اُردو سب میں مداخلت ہے۔ تقریباً پچپن برس کی عمر ہے۔ سنا گیا کہ جناب مولانا محمد غیاث الدین صاحب عزت سے تلمذ ہے یہ ان کا کلام ہے۔

ہم جلالی کو سمجھتے تھے کہ کافر عشق
یہ تو اے وائے بڑا سخت مسلمان نکلا

مولوی جلال الدین خاں کے دو[2] فرزند تھے۔ مولوی سراج الدین خاں سراج اور حافظ معز الدین خاں عزیز۔ حافظ معز الدین رام پور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے بھائی مولوی سراج الدین احمد خاں اور والد مولوی جلال الدین احمد خاں سے تعلیم پائی۔ قرآن کریم حفظ کیا۔ جے پور میں مولوی سلیم الدین تسلیم سے بھی استفادہ کیا[1]۔ فارسی کے منتہی تھے۔ عربی کی تحصیل متوسطات تک کی تھی۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں حافظ صاحب خود رقمطراز ہیں[2]

"اول میرا تقرر ۱۸۷۴ء میں بزمرۂ سپاہیان فتح پلٹن ہوا۔ اس کے بعد اسامی روزنامچہ نویسی پر پھر اسامی اہل کاری جنسی تلنگان پر پھر نائب سر رشتہ داری بخشی خانہ پر پھر عہدہ سر رشتہ داری پر ترقی ہوئی۔ فروری ۱۹۰۱ء میں عہدہ نیابت بخشی خانہ پر بمشاہرہ ماہانہ ۱۰۵ معہ الاؤنس و سواری، تقرر ہوا پھر اضافہ عام میں تنخواہ ما لعہ ۵ مئی ۱۹۲۰ء سے پنشن کی کارروائی ہوئی لیکن کام ۲۵ اگست تک کیا۔ تنخواہ بدر ماہہ صہ دلائی گئی اس طرح ۴۷ سال تک ملازمت کی۔"

---

[1] انتخاب یادگار۔ ص ۱۰۵
[2] روزنامچہ حافظ معز الدین خاں (قلمی)

حافظ صاحب ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنا تمام وقت تعلیمی و قومی خدمات میں صرف کرتے تھے۔ گھر پر بچوں کو قرآن پڑھاتے اور حفظ کراتے تھے۔ وہ مستحق اور قابل امداد طلبہ کی مدد بھی کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے بچے زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر کار آمد بنیں اور ملک و قوم کی خدمت باحسن وجوہ انجام دیں۔ حافظ صاحب کو اخبار بینی کا خاصا ذوق تھا۔ پیسہ اخبار زمیندار اور تیج بالالتزام دیکھتے تھے۔ پیسہ اخبار کے مستقل خریدار تھے۔ پیسہ اخبار کے ایڈیٹر مولوی محبوب عالم سے ان کی خط و کتابت بھی تھی۔ کبھی کبھی ان کا کوئی مضمون بھی پیسہ اخبار میں شائع ہوتا تھا۔ کتب بینی میں خاصا وقت صرف کرتے تھے۔ ان کا خاص موضوع "تاریخ اسلام" تھا۔ مولانا تسلیم سے ان کے بھی خاص روابط و تعلقات تھے۔ حافظ صاحب ہر سال نماز تراویح میں بالالتزام قرآن کریم سناتے تھے۔ مرنے سے دو سال قبل تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ مسجد میں جمعہ کی نماز خود پڑھاتے تھے اور خطبہ دیتے تھے۔ سال بھر کے لیے خطبوں کا مجموعہ خود تیار کیا تھا۔ عربی کے خطبہ کا اردو میں ترجمہ بھی کیا کرتے تھے۔

حافظ صاحب کو شعر و شاعری کا بھی ذوق تھا۔ عزیز تخلص کرتے تھے۔ مؤلف تذکرہ شعرائے جے پور نے دو شعر بطور نمونہ نقل کئے ہیں۔

اسمِ اعظم یہ ترے ہاتھ لگا خوب عزیز
رکھ سدا وردِ زباں نامِ خدا بسم اللہ

اچھے ہیں وہ جنھیں ہے بھروسہ حضورؐ کا
عاصی رہے جو کثرتِ عصیاں سے ڈر گئے

حافظ صاحب نے جے پور کی تاریخ سے متعلق ایک مسدس بعنوان "بہارِ جے پور" لکھی تھی جو طبع بھی ہوئی تھی۔[1]

---

[1] تذکرہ شعرائے جے پور۔ ص ۲۳۳

۱۹ اپریل ۱۹۳۶ء کو جے پور میں حافظ معز الدین کا انتقال ہوا۔ حافظ صاحب نے تین فرزند منشی امیر الدین خاں، پروفیسر حامی الدین خاں اور عزیز الدین خاں یادگار چھوڑے اوّل الذکر امیر الدین خاں ہمارا موضوعِ سخن ہیں۔

امیر الدین خاں جے پور کے محلے ہاڑی پورہ میں ستمبر ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے دادا اور والد سے حاصل کی۔ اس کے بعد شمس العلماء مولوی عبد الرحمان (پروفیسر مشن کالج)، مولوی مبارز الدین پروفیسر الطاف حسین (اورینٹل کالج جے پور) اور مولوی اولاد حسین شاداںؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور ۱۹۰۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ جب چیف کورٹ (جے پور) میں سر رشتہ دار مقرر ہوئے تو ۵۲ سال کی عمر میں انھوں نے میٹرک بھی پاس کر لیا۔[۱]

امیر الدین خاں کی زندگی کا آغاز فوجی ملازمت سے ہوا وہ سب سے پہلے ساڑھے چار روپے ماہوار تنخواہ پر سپاہیانہ پلٹن سوم نجیب جے پور میں ملازم ہوئے۔ بعد ازاں ترقی کرتے کرتے محکمہ اپیل صیغہ دیوانی کے سر رشتہ دار مقرر ہو گئے۔ ان کے والد حافظ معز الدین خاں مرحوم ایک قلمی یادداشت میں لکھتے ہیں:[۲]

"امیر الدین احمد خاں عرف امیر الدولہ منشی فاضل پنجاب یونیورسٹی اوّل تحصیل دانتہ رام گڑھ میں پیشکار بدر ماہوار ؏ ۱۹۱۰ء میں ہوئے پھر پیشکار سابق کے بحال ہونے پر علیحدگی ہوئی۔ جون ۱۹۱۱ء میں تعلقدار السیر بمشاہرہ ؏ ہوئے۔ ۱۹۱۲ء میں منصرم کوکس بمشاہرہ ؏ ہوئے۔ ۱۹۱۳ء میں ٹھکانہ سیتارام بھی سپرد ہو کر ؏ کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۱۴ء میں علیحدگی ہوئی۔ ۲۹ ستمبر ۱۹۱۵ء کو عدالت دیوانی میں اہلمد متفرقات بمشاہرہ ؏ ہوئے۔ جون ۱۹۱۹ء میں سر رشتہ دار عدالت

---

[۱] تذکرہ شعرائے جے پور ص ۲۸۹

[۲] روزنامچہ حافظ معز الدین خاں (قلمی)

دیوانی غربی بمشاہرہ صے اور للعہ اجرت نقل نویسی مقرر ہوئے۔ مئی
۱۹۲۰ء میں اضافہ عام کے ساتھ پانچ روپے کا اضافہ ہوکر للعہ
تنخواہ مقرر ہوئی اور دسمبر ۱۹۲۱ء میں سررشتہ دار محکمہ اپیل صیغہ دیوانی
مقرر ہوئے صہ للعہ تنخواہ کے مدعہ سواری کے اور للہ ماہوار اُجرت
نقل نویسی کے کل معہ روپے ملتے ہیں۔"

پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴–۱۸ء کے خاتمے پر برِصغیر پاک و ہند میں مختلف سیاسی تحریکات نے زور پکڑا اور آزادیِ ملک کے مطالبہ کا غلغلہ بلند ہوا۔ ان تحریکات میں خلافت کی تحریک خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی نے تحریکِ آزادی کی سرگرمیوں کو آسمان پر پہنچا دیا۔ امیر الدین خاں علی برادران سے متاثر تھے۔ انہوں نے ان بھائیوں سے رابطہ قائم کیا۔ پہلے مولانا شوکت علی کے اخبار "خدام کعبہ" اور بعد ازاں مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" کے عملہ ادارت میں شامل رہے۔ اس زمانے میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک زوروں پر تھی۔ منشی امیر الدین خاں نے اس تحریک سے بھی گہری علمی دلچسپی کا اظہار کیا[۱] انھوں نے ایک نظم لکھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دولتِ دنیا نہ لے اور دولتِ اسلام لے
اپنے علم و فضل کی گرتی عمارت تھام لے
یا علمبردار علم و فضل بن کر نام کر
یا نہ پھر غرناطہ و اشبیلیہ کا نام لے
ہے فضلائے دہر ذکر و شغل سے پُر صبح دم
مسلم خوابیدہ اُٹھ، تو بھی خدا کا نام لے

امیر الدین خاں کی ان دلچسپیوں اور مصروفیات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو جے پور سے خارج البلد کر دیا گیا۔ نواب ممتاز الدولہ سر محمد فیاض علی خاں (ف ۱۹۲۲ء) کی وزارت

---

[۱] تذکرہ شعرائے جے پور ص ۲۸۷

کے زمانے میں خان بہادر علی احمد خاں فرخ آبادی ممبر محکمہ محتشمیہ عالیہ کونسل جے پور نے یہ پابندی منسوخ کی[1] - اور امیر الدین خاں عدالت دیوانی میں اہلِ مد مقرر ہو گئے۔ یکم مئی سنہ ۱۹۲۹ء سے چیف کورٹ میں سر رشتہ دار مقرر ہوئے۔ مشاہرہ صہ اور دو روپیہ سالانہ اضافہ مقرر ہوا۔ اس کے بعد تنخواہ میں پانچ روپے سالانہ اضافہ ہوا اور سنہ ۱۹۳۱ء میں تنخواہ صعہ روپے ماہوار ہو گئی۔ سنہ ۱۹۴۲ء میں منشی امیر الدین خاں ریٹائر ہو گئے۔

ملازمت سے سبکدوشی کے کچھ دنوں بعد نواب ممتاز الدولہ محمد مکرم علی خاں کی سرکار کے مینجر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد ریاست دوجانہ میں ناظم (کلکٹر) سشن جج، چیف رجسٹرار اور میر منشی کے عہدوں پر فائز ہوتے رہے[2]۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں وہ دوجانہ میں تھے۔ انھوں نے تحصیل بہو اور ناہڑ میں جان پر کھیل کر مسلم آبادی کو ہندو بلوائیوں سے بچایا۔ پھر دہلی، علی گڑھ، رام پور ہوتے ہوئے جے پور پہنچے اور جلد ہی پاکستان آ گئے۔ حافظ مبارک علی شاہ کے اصرار پر حیدر آباد سندھ میں قیام کیا۔ تعلیم و تعلم سے ایک فطری مناسبت تھی۔ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول (حیدر آباد، سندھ) میں عربی، فارسی اور دینیات کے مدرس مقرر ہو گئے۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں گورنر سندھ نے گورنمنٹ اسپتال کے لئے ایک ایڈوائزری بورڈ قائم کیا۔ امیر الدین خاں اس بورڈ کے ممبر نامزد کئے گئے۔ بعد ازاں وہ اس بورڈ کے چیئرمین مقرر ہوئے پھر بوجہ کبر سنی یہ تعلق بھی ختم ہو گیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ خود اپنی ایک قلمی یادداشت میں لکھتے ہیں۔

> "میں اب سن انیس سو اکہتر میں نوے برس کا ہوں اور فٹ بال کی بدولت گھٹنوں کی خرابی سے دس برس سے گھر میں بند ہوں۔ مطالعہ کتب سے تھکا نہیں بیزار ہو گیا ہوں۔ سوتے سوتے اکتا گیا ہوں۔ وقت کاٹنا، دن گزارنا اجیرن ہو گیا ہے۔ گنتے چنتے عزیزوں کے چہرے دیکھتے رہنے میں کوئی لطف جلوت نہیں اور تنہائی۔ خدا کی پناہ!

---

[1] تذکرہ شعرائے جے پور صہ ۲۸۷

[2] تذکرہ شعرائے جے پور صہ ۲۸۷

پرانی گزری باد یں طوق و زنجیر بن جکڑ کر خدا کے سامنے کھینچے لیے جاتی ہیں۔ مذہب سے روگردانی کا تصور۔ منہ پر آتشیں طمانچے مارتا ہے گناہوں کی ایک لمبی فہرست فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے آئے جاتی ہے اور زیادہ جگہ اپنے کرتوت پوری عریانی کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ کانوں میں اپنی جانی پہچانی ایسی آوازیں آتی ہیں کہ کبھی دل مچل جاتا ہے۔ کبھی جان نکل جاتی ہے۔ گذشتہ خوشیاں گدگدا کر رلاتی ہیں۔ اوران سب کا اثر جو مجھ پر مترتب ہوتا ہے۔ وہ میرے ان فارسی کے الفاظ میں ہے:

فرسودگیٔ قامت بنگر چشمانِ سرشک انگیز نگر
افسانۂ عمرِ کوتاہ و پیمانۂ من لبریز نگر

یہاں تک کہ ۱۲ اگست ۱۹۷۰ء مطابق ۹ جمادی الآخرہ ۱۳۹۰ھ بوقت ۵ بجے شام پیمانۂ عمر لبریز ہوگیا۔ اور منشی امیرالدین خاں نے عالمِ جاودانی کی راہ لی۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

ان کے حبیبِ لبیب مولوی احترام الدین شاغل (ف ۱۸ جنوری ۱۹۷۱ء) نے مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ وفات کہا:

مولوی منشی امیر الدین خان
جب گئے دُنیا سے باقلبِ منیر
دیکھ کر جنت پہ رضوان نے کہا
آیئے معجز قلم حضرت امیر

۱۹۷۰ء

منشی امیرالدین خاں مرحوم اعلیٰ اخلاق کے مالک تھے۔ صوم وصلوٰۃ اور تلاوت قرآن کے پابند، خلیق، ملنسار اور مخلص، قومی جذبہ سے ان کا دل معمور تھا۔ مطالعہ کا شوق آخر عمر تک رہا۔ تقریر کا ملکہ خوب رکھتے تھے بلکہ مجلس پر چھا جاتے تھے۔

برِ صغیر میں مسلمان تعلیمی میدان میں یوں بھی پیچھے تھے اور پھر ریاستوں کا حال تو اور بھی بدتر تھا اور کسی ہندو ریاست میں تو ان کی تعلیمی ترقی کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ منشی امیرالدین خاں ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ انھیں جے پور میں مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا احساس ہوا اور انھوں نے ۱۹۲۵ء میں جے پور کے محلے چابک سواران میں اونچی مسجد کے اندر ایک چھوٹا سا مکتب قائم کیا اور اس کی ترقی میں لگ گئے یہاں تک کہ خود تعلیم دیتے تھے۔ ۱۹۲۶ء میں اسلامی پنچایت کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی اور یہ درس گاہ اس کی نگرانی میں آگئی چنانچہ جولائی ۱۹۲۶ء میں یہ مکتب "مسلم پرائمری اسکول" میں تبدیل ہو گیا اور ۱۹۲۷ء میں جے پور کا "مسلم راجپوت اسکول" اس میں ضم ہو گیا اور اس نے "مسلم مڈل اسکول" کی شکل اختیار کر لی۔

اسکول کی مالی دشواریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے منشی امیرالدین خان نے سخت جد و جہد کی اور آخر اس میں کامیاب ہوئے۔ مڈل اسکول کے لئے سرکاری امداد حاصل کی حکومت سے ایک عمارت (مع چاہ و مسجد) حاصل کی بالآخر امیرالدین خاں اور ان کے رفقا کی کوششوں سے ۱۹۴۴ء میں مڈل اسکول نے "مسلم ہائی اسکول" کا درجہ لے لیا۔ اس داستان کو خود منشی امیرالدین خاں کی زبانِ قلم سے سنیئے۔[۱]

"۱۹۲۵ء میں ایک مکتب محلہ چابک سواراں کی اُونچی مسجد میں نیاز مند نے جاری کیا اور ماسٹر شہاب الدین کو بمشاہرہ عے ماموں کیا وہ طلبہ کو پڑھاتے تھے اور میں ان کی نگرانی کرتا تھا اور فرصت کے وقت خود بھی درس دیتا تھا۔ طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی اور یہ اندازہ ہوا کہ اگر اس مکتب میں اساتذہ کا اضافہ کر دیا جائے۔ اور انگریزی شامل کر دی جائے تو یہ مکتب اسکول کی شکل اختیار کر سکتا ہے اور مسلمانوں کی تعلیمی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا آخر فروری ۱۹۲۶ء میں پانچ برادرانِ اسلام سے قائمی اسلامی پنچایت کے لیے محکمہ فوجداری میں

۱۔ مسلم ہائی اسکول میگزین جے پور جلد اوّل شمارہ اوّل ۱۹۵۲ء ص ۱-۲

درخواست پیش کرائی گئی جس کا مقصد حسب ذیل قرار دیا گیا۔

۱۔ مسلمانوں میں ترقی تعلیم کی کوشش

۲۔ مسلمانوں کی اصلاح رسوم

مارچ ۱۹۲۶ء میں محکمہ خاص سے منظوری آگئی۔ فراہمی روپے کیلئے چٹکی چٹکی آٹا، چوکڑی رام چندرجی اور گھاٹ دروازہ سے مانگا گیا۔ ۲۳ اپریل کو اس اسلامی پنچایت کا پہلا اجلاس محلہ بساطیان کی مسجد میں ہوا۔ مولوی محمد اشفاق رسول صاحب جوہر مرحوم صدر اور سید شوکت حسین کاظمی سیکرٹری منتخب ہوئے اور مکتب کو اسلامیہ مدرسہ نام دیا۔ سرکاری نصاب کے مطابق کورس مقرر کیا گیا نیز تعلیم دینیات لازمی قرار دی گئی۔ دوسرا اجلاس ۲۰ اپریل ۱۹۲۶ء کو ہوا۔ جس میں میرے والد مولوی حافظ محمد معز الدین خاں صاحب پنشنر نائب بخشی خانہ فوج نے پانصد روپے نقد اجرائے اسکول کے لئے عطا کئے اور دیگر اصحاب نے بھی مالی امداد فرمائی۔ بعد ازیں چندہ کی وصولیابی کے لئے اکثر مساجد میں اعلان کئے گئے اور مسلمانوں کے گھروں میں ہانڈیاں چٹکی آٹے کے لئے رکھی گئیں۔"

ایک اور موقع پر منشی امیر الدین خاں لکھتے ہیں [1]

"مجھے یاد ہے کہ ۲۶ جنوری ۱۹۲۶ء کو چابک سواروں کے محلے میں میرے مکان کے پاس اونچی مسجد میں یہ مدرسہ جاری ہوا تھا۔ میں پروفیسر حامی الدین خاں ایم اے اور مولوی سعید حسن خاں منشی فاضل اور دیگر چند اصحاب بڑی مشکلوں سے طالب علموں کو گھروں سے نکال کر لائے تھے۔ کسی بچے کے بزرگ لاحول پڑھ کر انگریزی تعلیم کو کفر قرار دیتے تھے کچھ شرماتے ہوئے بچوں کو کسی نوکری مزدوری پر

---

[1] قلمی یادداشت منشی امیر الدین

لگا دینے کا عذر کر دیتے تھے۔ مہینوں میں دس پندرہ طالب علموں سے
زیادہ اسکول نہ چلا۔ خرچ اس طرح چلتا تھا کہ گھروں میں ہانڈیاں رکھی
جاتی تھیں۔ روزانہ گھر والے ان میں چٹکی آٹا ڈال دیتے تھے۔ ہم ہر ہفتے
وہ آٹا لے آتے تھے۔ میلوں ٹھیلوں میں چوراہوں پر پیسے جمع کرتے تھے
عرس اجمیر شریف میں کفش برداری کر کے اچھی رقم لے آتے تھے۔ جن
لوگوں نے یہ خدمات انجام دیں۔ ان میں سے بہت سے اللہ کو پیارے
ہو گئے اللہ انھیں جنت الفردوس عطا فرمائے"۔

اس ادارے کی آخری شکل کے متعلق وہ لکھتے ہیں [1]

"یہ جے پور کا مسلم اسکول ہے۔ اتنی وسیع اور شاندار، لاکھوں روپے
کی عمارتیں، بڑے بڑے کلاس روم، لمبا چوڑا ہال، خوبصورت فرنیچر
سے آراستہ ہے۔ کتب خانہ اور لیبارٹری وغیرہ کے لئے محفوظ قطعات
کھیلوں کے لئے میدان اور بڑی سڑک کی طرف شاپنگ سینٹر ڈیڑھ ہزار
سے زیادہ طلبہ"

منشی امیر الدین نے تعلیم نسواں کے لئے بھی سر توڑ کوشش کی اور مسلم گرلز اسکول قائم کیا
جے پور کا یہ اسکول بھی بڑی کامیابی سے چل رہا ہے اور مسلم طالبات کی تعلیمی ضروریات کو بڑی
حد تک پورا کر رہا ہے۔ اس اسکول کی ابتدائی ذمہ داریاں ان کی صاحبزادی جمیلہ بیگم نے سنبھالیں
غرض جے پور کے مسلمانوں کی تمام تر تعلیمی ترقی کا سہرا مرحوم امیر الدین خاں کے سر ہے
چنانچہ خان بہادر الطاف احمد خیری لکھتے ہیں [2]

"میرا خیال ہے کہ ۱۹۲۵ء کے بعد سے جے پور کے جتنے بھی مسلمان
لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کر کے نکلے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد
ان کی ہے جنھوں نے امیر الدین خاں کے قائم کردہ اداروں میں تعلیم پائی۔

---

[1] قلمی یادگار منشی امیر الدین خاں

[2] جے پور کے ایک دیدہ ور" از الطاف احمد خیری"

ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے اچھی ترقی کی۔ مرحوم امیرالدین خاں صاحب کو لوگ "جے پور کا سر سید" کہتے تھے۔ ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر جے پور مسلم ہائی اسکول میں ایک بڑا ہال "امیر ہال" کے نام سے تعمیر کیا گیا۔ اور مرحوم کی ایک بہت بڑی تصویر اس میں آویزاں کی گئی۔"

پروفیسر عبدالرشید فاضل جے پوری لکھتے ہیں[۱]

"آج جے پور یا پاکستان میں جو تعلیم یافتہ جے پور والے نظر آتے ہیں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے ان (منشی امیرالدین خاں مرحوم) کی ان کوششوں کے مرہون منت ہیں جو انھوں نے تعلیم کے میدان میں کی تھیں۔"

منشی امیرالدین خاں ایک علمی خاندان کے رکن تھے۔ دادا، چچا، والد شعر و ادب سے گہری وابستگی رکھتے تھے۔ انھیں یہ ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ منشی امیرالدین خان نے جنوری ۱۹۳۷ء سے جے پور سے ایک ماہنامہ "روشنی" جاری کیا جو ۱۹۴۷ء تک نہایت پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے ایڈیٹر تو مولوی سعید حسن خاں ہیڈ ماسٹر مسلم ہائی اسکول تھے مگر اس کا اجرأ اور ترقی تمام تر امیرالدین خاں کی بدولت ہوئی۔ امیرالدین خاں نظم و نثر لکھنے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ جے پور میں ۲۰ تا ۲۲ اپریل ۱۹۳۵ء میں جو پہلا آل انڈیا مشاعرہ ہوا اس کے انعقاد اور کامیاب بنانے کے سلسلے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا[۲] اس مشاعرہ کے بعد جے پور اور اس کے قرب و جوار میں مشاعروں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مختلف قومی و ملکی تقریبات و مواقع پر جے پور میں کئی یادگار مشاعرے منعقد ہوئے۔ اسی طرح کا ایک کامیاب مشاعرہ ۱۹۳۱ء میں خان بہادر الطاف احمد خیری صاحب کے دولت کدے پر منعقد ہوا جو نہایت کامیاب رہا۔ انور علی شاہ مرحوم نے تاریخ گوئی میں کمال دکھایا۔ ان کی غزل کا ہر

---

[۱] ملاحظہ ہو فاران - کراچی نومبر ۱۹۷۰ء

[۲] ملاحظہ ہو تذکرہ شعرائے جے پور صد ۲۰-۳۶

مصرع تاریخی تھا۔ مندرجہ ذیل شعر میں امیرالدین خاں کا ذکر ہے۔[1]

زیبِ محفل اظہرؔ و بسملؔ ہیں لے سرمستِ ناز
ہیں امیرالدین خاں بھی اب یہاں جلوہ فگن!

اسی طرح ایک یادگار مشاعرہ جشنِ ماہتاب ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو مسلم ہائی اسکول کی چھت پر منعقد ہوا۔ جبکہ چودھویں کا چاند اپنی پوری تابانی اور آن بان کے ساتھ چمک رہا تھا۔ مصرع طرح تھا۔

چاند ہے پروردگار ہے پیمبر چاندنی

بزم کو نہایت شان سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اسکول کی چھت پر نہایت سفید فرش تھا اور دیواریں براق۔ منتظمین سرتاپا سفید لباس میں مزین۔ سامعین و شعراء بھی لباس ابیض میں ملبوس۔ امیرالدین خاں مرحوم کا بس چلتا تو مردم چشم اور جوانوں کے بال تک سفید کر ڈالتے پان ہو کہ چھالیہ، الائچی کے دانے ہوں یا زردہ سب پر ورق نقرہ کا قبضہ، مشاعرہ نہ تھا بلکہ روم نے حبش پر تسلط جمالیا تھا۔ اس مشاعرہ سراپا نور کے خاتمے پر سفید و شفاف بلوریں طشتریوں میں ورق نقرہ، زردہ فیرنی مع نقرئی چمچوں کے پیش کی گئی۔ عجیب و غریب جدت کی خوشگوار صحبت تھی جس سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔[2]

۱۹۴۳-۴۴ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے راجپوتانہ میں۔ اُردو زبان کا جائزہ لینا چاہا بابائے اُردو مولوی عبدالحق صاحب کے زیر ہدایت امیرالدین خاں مرحوم نے بہت کام کیا۔ اور وہ اپنے رسالے "روشنی" میں مسلسل اس جائزہ کی رُوداد شائع کرتے رہے۔

امیرالدین خاں کی شاعری کا آغاز اوائل عمر ہی میں ہو گیا تھا۔ خاندانی روایات، اور ماحول نے اس کو اور جلا بخشی۔ منشی چھبیتر مل مجبورؔ سے انھوں نے اصلاح لینی شروع کی۔ اس کے بعد سراج کنتوری (ف ۱۳۳۴ھ) سے اصلاح لینے لگے۔ پہلے جوشؔ اور بعد میں

---

[1] ملاحظہ ہو تذکرہ شعرائے جے پور صفحہ ۲۷، ۲۷۳ - ۲۷۴

[2] تذکرہ شعرائے جے پور صفحہ ۳۸ - ۴۰ و مسلم ہائی اسکول میگزین جلد اوّل شمارہ اوّل ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۱

شوخ تخلص اختیار کیا اور جلد ہی ان کا شمار شعرائے جے پور میں ہونے لگا۔ قدرت نے ان کی طبیعت میں شعر سے ایک خاص مناسبت پیدا کی تھی۔ جس کا اکثر مواقع پر اظہار ہوتا تھا۔ ان کا رجحان غزل سے زیادہ نظم کی طرف تھا۔ خاص طور سے قومی و ملی جذبے کے تحت انھوں نے اکثر نظمیں کہی ہیں۔ اس طرح وہ حالیؔ و اقبالؔ کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک شعر میں وہ کہتے ہیں۔

مرے شعر کو تعلق نہیں جب بلبلوں سے
اسے معجزہ نہ کہیئے یہ فقط نواگری ہے

غزل کے سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں[1]

"مجھے اچھی غزل گوئی بقدر تمنا نصیب نہ ہوئی۔ وجہ صرف یہ ہے کہ میرے قلب کی ساخت و باخت اور ذہن کا نمونہ جمالیات کے زیر اثر اتنا نہیں ہوا جتنا زندگی کی آسائش و فکر کمالات میں ہوا۔"

امیر الدین خان نے جو کچھ کہا اس کو حفاظت سے نہیں رکھا۔ آخر عمر میں ان کا خیال اس جانب ہوا۔ لہٰذا جملہ کلام جمع کر کے "خود آرائی" کے نام سے مرتب کیا۔ اس کی ترتیب و انتخاب کے سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں جس سے ان کے نظریۂ شاعری کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے[2]

"اوّل تو کلام بہت ہی کم فراہم ہوا اور میرے ارذل عمر کا یہ اثر ہوا کہ اپنا بہت سا کلام زبان اور محاورہ کے لحاظ سے غلط و ناقص اور عروض و بحر سے خارج معلوم ہونے لگا۔ دوسروں کے کلام سے لغات سے اور بحروں کی تقطیع سے تسلی کی لیکن جھجک باقی رہا۔ زیادہ خیال یہ رہا کہ مطالعہ ادب اور صحبت شعراء کی وجہ سے دماغ میں جو ستھری نکھری کیفیت پروان چڑھی ہے اس کا عکس یا اسلوب بیان

---

[1] قلمی یادداشت منشی امیر الدین خان
[2] ایضاً

اپنے شعروں میں نہیں ہے۔ اس احساس کمتری سے میں نے ایک دن اچھا خاصا حصّہ اپنے کلام کا تلف کر دیا"۔

امیرالدین خاں کردار و عمل کے آدمی تھے۔ لہٰذا وہ اپنے اشعار میں بھی عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

کہیں باتوں سے بھی فرعونیاں دنیا کی ڈوبی ہیں
کمال موسوی و سعیٔ فتح نیل پیدا کر

بہ خستگی نوید ہے منزل کے قرب کی
ہاں اے حیاتِ لنگ! ذرا تیز گام اور

اپنے کردار و عمل سے توڑ دے زور فنا
کر کے دکھلا دے کہ ہاں یوں جاوداں ہے زندگی

تخلیق کی طاقت ہے بڑی دل کی لگن میں
خود اپنا جہاں آپ بنا لیتے ہیں انساں

مذہب کی تنگ نظری اور تعصب کے متعلق لکھتے ہیں:

عنبر نے چھونا بھی جس کو پاپ تھا
خون کے دھبے ہیں اس زنار پر

غازی کے لئے جنگ کے میدان میں مسجد
مسجد میں بھی مُلّا کے لئے جنگ کا میدان

چند تغزل کے اشعار ملاحظہ ہوں:

ہیں رند لاابالی بلوا دے کوئی پیالی
تیری دکان ساقی آباد رکھے داتا

جو تم نہ آئے تو کیا موت بھی نہیں آئی
جو ہونے والا تھا بندہ نواز ہو ہی گیا

اس مست نگاہی کے تصدق کہ دو عالم
ہاتھوں میں لئے ساغر و مینا نظر آیا

یہ دونوں طرف آگ تم نے لگائی
نہ لیلیٰ دوانی نہ مجنوں دوانہ

الٰہی کون سی بستی میں اب ان کا ٹھکانہ ہے
دلوں میں جو لئے پھرتے ہیں اپنے غم کے پروانے

غلام رسول مہر

غلام رسول مہر، نامور صحافی، ادیب، مورخ، مترجم اور مصنف تھے۔ ان کے نام سے کام آشنا تھے۔ مئی ۱۹۵۷ء میں برصغیر پاک و ہند میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی صد سالہ تقریبات منائی گئیں۔ اس موقع پر جنگ آزادی ۱۸۵۷ء سے متعلق بہت سی کتابیں اور اخبارات و رسائل کے خصوصی نمبر شائع ہوئے۔ خاکسار نے بھی ۱۸۵۷ء کے ایک مجاہد مولانا فیض احمد بدایونی کے حالات لکھ کر کتابچہ کی صورت میں شائع کیے اور اس کا ایک نسخہ مہر صاحب کی خدمت میں ارسال کیا۔ انہوں نے نہ صرف اس کتابچہ کی رسید سے سرفراز فرمایا بلکہ مولانا فیض احمد بدایونی کے حالات اپنی کتاب "مجاہدین ۱۸۵۷ء" میں شامل کئے اور اس کتابچہ کا حوالہ بھی دیا۔

مہر صاحب کی مشہور کتاب "سیرت سید احمد شہید" میں بعض باتیں کہیں کہیں کھٹکیں مثلاً انہوں نے جھنڈا شاہ فقیر کو رائے بریلی (اودھ) کا رہنے والا لکھ دیا تھا حالانکہ وہ بانس بریلی (روہیل کھنڈ) کا ساکن تھا۔ میں نے اس بارے میں ان کو ایک خط لکھا۔ مہر صاحب نے میرے عریضہ کا جواب دیا اور ان تسامحات کا اعتراف فرمایا۔

جولائی ۱۹۶۲ء میں لاہور جانا ہوا۔ ایک روز مہر صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا وہ اپنی کوٹھی کے ایک چھوٹے سے بغلی کمرے میں تشریف فرما تھے۔ چاروں طرف کتابیں تھیں۔ سامنے ایک میز پر ان کے رفیق کار نشتر صاحب کام کر رہے تھے۔

میں نے اپنا تعارف کرایا اور عرض کیا کہ خاکسار نے تذکرہ علمائے ہند کا اردو

ترجمہ کیا ہے۔ فرمایا میرے پاس تو اصل فارسی موجود ہے اور یہ کہہ کر گھومنے والی الماری سے کتاب نکال کر دکھائی۔ میں نے کہا کہ جی ہاں! اسی کتاب کا ترجمہ کیا ہے اور کتاب ان کی خدمت میں پیش کی۔ فرمایا خوب! پھر اسے الٹا پلٹا۔ ورق گردانی شروع کر دی اور تھوڑی دیر کے لیے مطالعہ میں گم ہو گئے۔ سید احمد شہید، مولوی خرم علی بلہوری، شاہ اسماعیل، شاہ اسحاق، مولانا سخاوت علی، مولانا کرامت علی وغیرہ وہابی تحریک کے علمائ کے حالات دیکھے اور اظہار مسرت فرمایا۔ کہنے لگے کہ سید احمد شہید کے بارے میں دو نئے ماخذ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ پھر اپنے ملازم تتھو کو بلایا۔ چائے کا اہتمام ہوا۔ گفتگو کے موضوع وہابی تحریک، سید احمد شہید اور مولانا فضل رسول بدایونی رہے۔

لاہور جب بھی جانا ہوتا تو مہر صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ جب میں نے اپنی کتابیں "مخدوم جہانیاں جہاں گشت" اور "کالا پانی" مہر صاحب کی خدمت میں ارسال کیں تو انہوں نے فوراً رسید سے نوازا اور ہمت افزائی فرمائی۔

اس زمانہ میں لاہور کے بعض اخبارات میں تحریک جہاد اور سید احمد شہید کے بارے میں چند تنقیدی مضامین شائع ہوئے۔ مولوی وحید احمد مسعود کی کتاب "سید احمد شہید کی اصل تصویر" خواجہ حسن ثانی نے منادی (دہلی) کے ایک خاص نمبر کی صورت میں شائع کر دی اور بات ذرا آگے بڑھی۔ مہر صاحب سے عرض کیا گیا کہ آپ اس سلسلہ میں لکھیں۔ انہوں نے لکھنے کا وعدہ فرمایا مگر پھر کوئی چیز منصۂ شہود پر نہ آئی۔ معلوم نہیں کیا مصلحتیں تھیں کہ طرح دے گئے اور کچھ نہیں لکھا۔

ایک مرتبہ مہر صاحب سے میں نے عرض کیا کہ سانحہ بالاکوٹ (مئی ۱۸۳۱ء) کے بعد سید احمد شہید کے اہل الرائے رفقا سندھ میں کم و بیش چھ ماہ قیام کر کے ٹونک چلے گئے۔ نواب وزیرالدولہ نے انہیں عہدے اور منصب دے کر ان کی آبادکاری کا انتظام کر دیا۔ مولانا سخاوت علی، مولانا کرامت علی، سید عبداللہ،

اولاد حسن قنوجی اور مولانا خرم علی وغیرہ اصلاحی و تصنیفی کام میں لگ گئے۔ میدانِ یاغستان و چمرکنڈ کو صرف اہلِ صادق پور نے سنبھالا اور "غیبوبیت" اور "مہدویت" کے علم بلند کئے۔ نواب صدیق حسن خان نے اسے "زلتِ عظیم" سے تعبیر کیا ہے۔ میدانِ جہاد سے مولوی محبوب علی دہلوی اور مولوی خرم علی بلہوری دونوں بزرگ واپس آئے۔ محبوب علی پر سخت تنقید کی جاتی ہے اور خرم علی کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ ان نکات پر محققانہ اور غیر جانبدارانہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ مہر صاحب نے میری باتوں کو توجہ سے سنا مگر خاموش رہے۔ "افاداتِ مہر" میں جب مہر صاحب کی یہ سطریں۔

"سرسید مرحوم نے مصلحتاً غلط باتیں کہی تھیں اور آپ جانتے ہیں کہ وہ "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستیِ فتنہ انگیز" کے قائل تھے۔
مَیں مجاہدین کی شان و آبرو بہر حال قائم رکھنے کا قائل ہوں۔ اگرچہ وہ سابقہ بیانات، یا توجیہات سے عین مطابق نہ ہو۔"[1]

نظر سے گزریں تو ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

مہر صاحب غالب پرسند کا درجہ رکھتے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں ادارہ یادگارِ غالب کی طرف سے صد سالہ تقریبات منعقد ہوئیں۔ خاص اجلاس کی صدارت مہر صاحب نے کی اور ایک زوردار مقالہ پڑھا۔ مختلف علمی و ادبی اداروں انجمن ترقی اُردو اور اقبال اکیڈیمی وغیرہ نے انہیں استقبالیہ دیا۔ مہر صاحب سے مستفید ہونے کا موقع ملا اور جب تک ان کا قیام کراچی میں رہا تقریباً روزانہ ہی ملاقات رہی۔ خاکسار کے کتب خانہ کے بعض مخطوطات، گلستانِ رحمت، مکتوباتِ اشرفی وغیرہ ملاحظہ فرمائے۔ غرض خوب علمی صحبتیں رہیں۔

مہر صاحب آوان برادری کے معزز رکن تھے اور اس کی تنظیمی انجمن سے بھی

---

[1] افاداتِ مہر مرتبہ ڈاکٹر شبیر بہادر خان پنی (شیخ غلام علی، لاہور ۱۹۷۳ء) ص ۲۳۱۔ ص ۲۳۲

تعلق رکھتے تھے۔ ایک روز دورانِ گفتگو برِ صغیر میں اسلام کی اشاعت مختلف قبائل کا داخل اسلام ہونا اور بعض برادریوں مثلاً کمبوہوں وغیرہ کا عربی النسل ہونے کا مدعی ہونا زیرِ بحث آیا اور خوب کھل کر گفتگو ہوئی۔ آوان قبیلہ کا بھی ذکر آیا۔ اور میں نے اس قبیلہ کے عربی النسل ہونے سے اتفاق نہیں کیا۔ مہر صاحب نے میری گفتگو بہت توجہ سے سنی۔

مہر صاحب سے جب بھی ملاقات ہوتی تو وہ یو۔پی کے قصبات و بلاد اور قبائل کی تاریخوں کی فراہمی کا ذکر فرماتے۔ خاکسار نے بعض کتابیں مہیا بھی کیں اور بعض انہوں نے مجھ سے عاریتاً لے کر ملاحظہ فرمائیں۔

مہر صاحب کا تمام وقت مطالعہ، ترجمہ کرنے اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں گزرتا تھا۔ مختلف علمی منصوبوں کی رہنمائی بھی کرتے تھے۔ شیخ غلام علی (لاہور) کی فرم کے تو وہ گویا علمی مشیر تھے۔ جب میں نے اپنی کتاب "جنگ آزادی ۱۸۵۷ء" پر تعارف لکھنے کی درخواست کی تو بڑی محبت سے "تعارف" لکھا۔

موت ایک حقیقت ہے جس سے مفر نہیں، ۱۶ نومبر ۱۹۷۱ء کو مہر صاحب نے عالمِ آخرت کی راہ لی۔

مہر صاحب کے انتقال سے ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔ تاریخ و تحقیق، ادب و شاعری، صحافت و حکمت اور علم و فضل کا آفتاب غروب ہو گیا۔ تحریکِ آزادی کا ایک جانباز سپاہی اور مشرقی تہذیب و تمدن کا مثالی نمونہ اُٹھ گیا۔ تحریکِ جہاد و حریت کا مورخ اور غالبؔ اور اقبالؒ کے فلسفہ و حکمت کا مفسر اپنی مسند خالی کر گیا۔ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔ تاریخ اپنے کو دہرائے گی بڑے بڑے شاعر، ادیب، صحافی، مورخ اور محقق پیدا ہوں گے مگر ان میں کوئی غلام رسول مہر نہ ہو گا۔

مہر صاحب تحصیل و ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) کے ایک چھوٹے سے گاؤں پھول پور میں ۱۵ اپریل ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے۔ پھول پور جالندھر سے

جنوب کی طرف تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ والد کا نام چودھری محمد علیخان تھا۔ مہر صاحب نے ابھی عمر کی دس منزلیں طے کی تھیں اور گیارہویں میں قدم رکھا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور تعلیم و تربیت کا تمام بار ان کی والدہ ماجدہ کے نازک کندھوں پر آپڑا۔ اس عفیفہ نے اس ذمہ داری کو باحسن وجوہ انجام دیا اور اچھی طرح تعلیم و تربیت فرمائی۔ ان کی والدہ کا انتقال ۱۹۴۱ء میں ہوا۔

مہر صاحب کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے پرائمری اسکول میں ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۱۱ء میں مشن ہائی اسکول جالندھر سے میٹرک پاس کیا پھر وہ مرکزِ علم و ادب، لاہور آگئے اور اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس درس گاہ نے مہر صاحب کی سیرت و کردار کی تعمیر میں خاصا حصہ لیا۔ مئی ۱۹۱۵ء میں مہر صاحب نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا اور میدانِ عمل کی طرف گامزن ہو گئے۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مہر صاحب نے حیدر آباد دکن کی راہ لی اور وہاں کے شعبہ تعلیم میں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز ہوئے۔ وہاں انھوں نے "سلطنت" نام کا ایک اخبار نکالنا چاہا مگر بعض وجوہ سے ان کو اخبار نکالنے کی اجازت نہ مل سکی اور وہ حیدر آباد دکن میں تقریباً چار سال گزار کر پنجاب واپس آگئے۔ ریاست میں انھیں ان کے مقاصد میں کامیابی نہ ہوئی۔

مہر صاحب ابھی بی اے کے پہلے ہی سال میں تھے کہ "الہلال" کے مطالعہ کی بدولت مولانا ابوالکلام آزادؔ سے عقیدت و ارادت کا تعلق پیدا ہو گیا تھا اور انھوں نے مولانا آزاد کی جماعت "حزب اللہ" میں شامل ہو کر بیعت کر لی۔ اس طرح مولانا آزاد کے زیرِ تربیت ان کے سیاسی خیالات و افکار کی نشو و نما ہونے لگی ان دنوں تحریکِ خلافت زوروں پر تھی۔ مہر صاحب جالندھر میں خلافت کمیٹی کے سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ نومبر ۱۹۲۱ء میں مولانا ظفر علی خان کے مشہور روزنامہ "زمیندار" سے وابستہ ہو گئے مگر جلد ہی یہ تعلق ختم ہو گیا۔ دوبارہ فروری ۱۹۲۲ء میں وہ زمیندار کے عملہ ادارت میں شامل ہوئے۔ اس مرتبہ تقریباً

پانچ سال تک مہرؔ صاحب زمیندار سے وابستہ رہے وہ بالعموم زمیندار کے اڈیٹوریل نوٹ لکھتے تھے اور خوب لکھتے تھے۔ زمیندار مختلف نرم وگرم دوروں سے گزرتا رہا تا آنکہ مارچ ۱۹۲۷ء میں مہرؔ صاحب زمیندار سے علیحدہ ہو گئے۔

اخبار زمیندار کے دورِ ادارت میں مہر صاحب کو ایک ایسا رفیق ہاتھ لگ گیا کہ جس کی رفاقت نے ان کی زندگی میں آب وتاب پیدا کر دی یعنی مہرؔ کو سالکؔ اور سالک کو مہرؔ مل گئے یہ قرأن السعدین تھا۔ مہر و سالک ایک جان دو قالب تھے اس روداد کو سالکؔ مرحوم کی زبانِ قلم سے سنیئے[1]

"جب (میں) لاہور آیا تو سب سے پہلے دفتر زمیندار میں گیا جہاں ان صاحب سے ملاقات ہوئی جن کو غلام رسول مہرؔ کہتے ہیں اور جن کی رفاقت و محبت ۱۰ر نومبر ۱۹۲۲ء سے لے کر الی الآن شامل حال ہے اور جن کو میں ان نعمتوں میں سے سمجھتا ہوں کہ جن کی وجہ سے یہ دکھ بھری زندگی قابلِ برداشت رہی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک زمیندار قسم کا آدمی کھدر کا کرتہ، پاجامہ اور صدری پہنے اور ایک کھردرا سا چار خانہ کمبل اوڑھے بینچ پر بیٹھا ہے۔ بھائی شفاعت اللہ خان نے جو زمیندار کے مینجر اور نگران تھے۔ مہرؔ صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ ہم بہت جلد بے تکلف ہو گئے اور چند ہی ملاقاتوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ زمیندار قسم کا آدمی فارسی اور عربی سے بدرجۂ اتم واقف ہے۔ فلسفہ، تاریخ اور دینیات کے مطالعہ میں بے حد شغف رکھتا ہے اور ادب و شعر میں مذاق سلیم کا سرمایہ دار ہے"۔

زمیندار سے قطع تعلق کے بعد مہرؔ صاحب نے سالک صاحب کی رفاقت میں میدانِ صحافت میں انقلاب کی بنا ڈالی یعنی ۴ر اپریل ۱۹۲۷ء کو "انقلاب" کا آغاز کیا۔ روزنامہ انقلاب کا نام علامہ اقبال مرحوم کی ایک نظم "انقلاب" پر رکھا

---

[1] سرگزشت ص ۱۸۸

جو "انقلاب" کے پہلے شمارہ کے صفحۂ اوّل پر شائع ہوئی۔ آغازِ نظم یہ ہے:۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب   از جفائے دہ خدایان کشتِ دہقانان خراب

انقلاب، انقلاب، اے انقلاب

روزنامہ "انقلاب" نے برِّ صغیر کی مسلم صحافت میں ایک خاص کردار ادا کیا اس نے تحریکِ آزادی میں حصہ لیا۔ مسلمانوں کی وکالت کی۔ پنجاب کے حقوق کا تحفظ کیا۔ کہیں اختلافات کیا کہیں اتفاق کیا وہ اپنوں سے لڑا غیروں سے بھڑا اس نے مناسب بھی کیا اور نامناسب بھی کیا۔ اس نے حکومت کو آنکھیں بھی دکھائیں مصالحت بھی کی۔ اس نے موقع محل بھی دیکھا۔ اس نے عزم و استقلال بھی دکھایا۔ اس سے اپنے ناراض بھی ہوگئے اس نے غیروں کو اعتماد میں رکھا اور ان سے نبھائی۔ اس سلسلہ میں مہر صاحب رقم طراز ہیں[1]

"انقلاب نے خالص سیاسی انتظامی اور دستوری مسائل پر مفصل مباحث کا آغاز کیا۔ ترکِ موالات کے دور میں جن جذباتی مضامین و مقالات کا عام رواج ہو چکا تھا۔ ان کی جگہ ٹھوس قومی اور ملکی مباحث کی طرح "انقلاب" ہی نے ڈالی۔ فخر کے طور پر نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرنا بے جا نہ سمجھا جائے گا کہ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے انقلاب کی آواز کو پذیرائی کا شرف بخشا۔"

ایک دوسرے موقع پر مہر صاحب لکھتے ہیں[2]

"فرائضِ عامہ کی بجا آوری میں انسان اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق دیانتداری سے کام کرنا چاہے تو بعض اوقات نہایت محبوب و عزیز تعلقات کی پوری نگہداشت نہیں ہو سکتی۔ مجھے پبلک زندگی میں ۔۔۔ اس قسم کی آزمائشوں سے سابقہ پڑا۔"

---

[1] نقشِ آزاد۔ صـ ۲۳

[2] نقشِ آزاد صـ ۳۳

۱۰ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو "انقلاب" ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

مہر صاحب نے تصنیف و تالیف کے میدان میں خوب کام کیا۔ ان کا شمار غالب کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ حالی کی یادگار غالب کے بعد غالب کی سیرت و سوانح پر مہر صاحب کی کتاب "غالب" خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ اس کے متعلق مولانا آزاد لکھتے ہیں۔ ؎

"یہ غالب کے حالات پر پہلی کتاب ہے جو مؤلفانہ نظر و کاوش سے مرتب کی گئی ہے۔ آپ نے غالب کی تحریرات کا دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا اور پھر ان کے نتائج اس سلیقے سے ترتیب دیدیئے کہ ایک پوری سوانح عمری وجود میں آگئی"۔

انہوں نے غالب کے اردو دیوان کو مرتب کیا۔ فارسی کلام کی ترتیب و تدوین کے فرائض انجام دیئے اردو خطوط کو دو جلدوں میں مرتب کیا۔ "نوائے سروش" کے نام سے غالب کے اردو دیوان کی شرح لکھی اور غالب کی حیات و شاعری پر بہت سے قیمتی مضامین اور وقیع مقالے لکھے۔

مہر صاحب نے اقبالیات کے سلسلے میں بھی یادگار کام کیا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ وہ علامہ کے رموز و عوارف کے بڑے نباض اور قدرشناس تھے۔ مہر صاحب نے ایک ملاقات میں ارشاد فرمایا کہ علامہ اقبال سے ان کا تعارف ایک ناخوشگوار واقعہ سے ہوا اور پہلی مرتبہ وہ ایک مجرم کی حیثیت سے علامہ مرحوم کی خدمت میں پیش ہوئے ۱۹۲۲ء کی بات ہے کہ علامہ اقبال کے چند اشعار چودھری محمد حسین مرحوم سے سن کر مہر صاحب نے اخبار زمیندار میں نقل کر دیئے جس پر ان سے جواب طلب ہوا مگر بعد کو تعلقات کی یہ نوعیت ہو گئی کہ جب تک شاعرِ مشرق اپنا تازہ کلام مہر صاحب کو سنا نہیں لیتے تھے۔ اس وقت تک چین نہیں آتا تھا مہر صاحب

؎ نقش آزاد صہ ۱۰۳

کے ذخیرہ علمیہ میں اقبالیات پر خاصا مواد ہے۔ انھوں نے بانگِ درا، بالِ جبریل اور ضربِ کلیم کے مطالب لکھے ہیں۔ علامہ اقبال کا بکھرا ہوا کلام "سرودِ رفتہ" کے نام سے مرتب کیا ہے۔ علامہ پر ایک کتاب بھی لکھنے کا ارادہ تھا۔ معلوم نہیں وہ کس منزل میں رہی۔

تصنیف و تالیف کے سلسلے میں مہر صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ تحریکِ جہاد کی مکمل و مفصل تاریخ کی تدوین ہے۔ انھوں نے اکیڈیمی اور ادارے کے کرنے کا کام تن تنہا انجام دے دیا جو نہایت وقیع ہے۔ مہر صاحب نے کم و بیش ایک صدی کے بعد تحریکِ جہاد کی مفصل تاریخ تین جلدوں میں مرتب کی اس کی پہلی جلد (دو حصص) سید احمد شہید کے حالات پر مشتمل ہے دوسری اور تیسری جلد میں جماعت مجاہدین اور سرگزشت مجاہدین کا بیان ہے۔

مہر صاحب نے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء پر دو مفصل کتابیں لکھ کر پہلی جنگِ آزادی کے شہداء کو بھی خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

انہوں نے بے شمار علمی مضامین و مقالات لکھے جن کا احاطہ مشکل ہے۔ تیس سے زیادہ کتابوں کے ترجمے کیئے۔ وقتی چیزیں بھی لکھیں۔ نصابی کتابیں بھی مرتب کیں۔ انہوں نے دوسری جنگِ عظیم ۱۹۳۹-۴۵ء کے زمانہ میں تاریخ ہند کے نام سے ایک کتاب طلبہ کے لئے لکھی اور اس میں اس جنگِ عظیم کو آزادی کی جنگ قرار دیا۔ جنرل خضر حیات خاں ٹوانہ کی لائف بھی لکھی غرض ان کا قلم آخر وقت تک حرکت میں رہا اور علمی سرمایہ میں اضافہ کرتا رہا۔

مولانا مہر کے پاس ایک وقیع کتب خانہ تھا نایاب اور کام کی کتابیں برابر حاصل کرتے رہتے تھے، اکابر و مشاہیر کے کم و بیش دو ہزار خطوط ان کے پاس تھے۔ اگر وہ ان کو تحشیہ و تحقیق سے مرتب فرماتے تو دس جلدوں میں بہ مواد آتا اور ماضی قریب کی تاریخ کا نادرہ کار مرقع ہوتا۔ شیخ اسماعیل پانی پتی نے بہت کوشش کی کہ مرزا بشیر الدین محمود کے خطوط کی نقول مل جائیں مگر مولانا مہر قبضہ میں نہ آئے۔

شورش کاشمیری مرحوم نے ایک موقع پر بڑے وثوق سے فرمایا کہ مولانا مہر اور مرزا بشیر الدین محمود میں ایک زمانہ میں بڑے اعتماد کے روابط رہے ہیں پچھلے دنوں انہوں نے اپنے کتب خانے کا ایک حصہ ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان کے ہاتھ فروخت کردیا۔ اس ذخیرہ کی فہرست بھی طبع ہوگئی ہے۔ بقیہ کتب خانہ ان کے انتقال کے بعد لاہور میوزیم نے خرید لیا۔

مہر صاحب شعر و شاعری کا بھی اعلیٰ مذاق رکھتے تھے۔ کالج کی زندگی میں ان کا یہ ذوق خوب نکھرا فارسی و اُردو کے کلاسیکی ادب پر ان کی بہت گہری نظر تھی۔ عربی زبان و ادب کی نزاکتوں کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ مولانا مہر صاحب علمی و فکری اعتبار سے مولانا ابوالکلام آزاد کے خاندان سے وابستہ تھے۔ وہ آخر وقت تک ان کے افکار و خیالات کے مبلغ و مناد رہے مولانا آزاد کے بہت سے آثار و تبرکات کو مرتب و مدون کیا۔ اس ضمن میں نقش آزاد اور تبرکات آزاد قابل ذکر ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے تفسیری مواد کو جو متفرق جگہ تھا یکجا کر کے ترجمان القرآن کی تیسری جلد قرار دیا۔ مہر صاحب وفاداری بشرط استواری کو اصل ایمان سمجھتے تھے ان کا خاص ذوق ادب، شاعری اور تاریخ تھا۔ برِصغیر کی تاریخ تحریک آزادی پر وہ سند کا درجہ رکھتے تھے۔

ان کی تمام زندگی قلم و کتاب سے عبارت رہی۔ تصنیف و تالیف تحقیق و تنقید، تصحیح و تقدیم ان کے مشاغل تھے۔ شہرت اور نام و نمود سے بے پرواہ رہے ایک مرتبہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی دعوت دی گئی مگر فکری ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے معذرت چاہی ورنہ لوگ تو ایسے مواقع پر جوڑ توڑ کرتے ہیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ ایک زمانے میں ان کو

سرکاری اعزاز و اکرام سے نوازنے کی کوشش کی گئی مگر وہ اپنے علمی وقار کو اس نیلام تمام سے صاف بچالے گئے۔ اس معاملہ میں وہ مرد قلندر تھے۔ دوستوں کے دوست غیروں کے بھی خیر خواہ چھوٹوں کے شفیق اور رہبر، پابند وضع، علمی معاملے

ہیں نہایت صاف گو اور بے لاگ مبصر، لوگ ان کی صاف گوئی سے گھبراتے تھے
خط کا جواب فوراً دیتے۔ علم حاضر تھا۔ غرض مہر صاحب مجموعہ خوبی ہائے گوناں گوں تھے۔

آخر میں ہم مہر صاحب کے ایک عقیدت کیش کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں اور
وہ ہیں لاہور کی علم دوست شخصیت، محمد عالم مختار حق جو ایک اچھے کتب خانہ
کے مالک ہیں۔ انہوں نے مولانا مہر کی تمام تصانیف حاصل کیں۔ جہاں تک
ہو سکا ان کے مضامین اور مقالات کو جمع کیا۔ ان کے آثار و خطوط فراہم کئے۔
مولانا سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی وہ ان کے پڑھے ہوئے پروف بھی محفوظ
رکھتے تھے۔ انہوں نے مولانا مہر صاحب کے کتب خانہ کی فہرست بنائی۔ ان کے
پاس مہر صاحب کے خطوط کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ مستقبل قریب میں اگر
کوئی مہر صاحب پر تحقیق کرے گا تو اس کے لئے محمد عالم مختار حق کا یہ ذخیرہ
نہایت کار آمد ثابت ہو گا۔

پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر

موت سے کس کو مفر ہے جو پیدا ہوا ہے وہ موت کا مزہ ضرور چکھے گا مگر غضنفر صاحب کو ایسی موت آئی کہ سان گمان بھی نہ تھا۔ دس محرم عشرے کے دن اپنے رفیق شفیق اور حبیب لبیب عبدالعزیز ایڈوکیٹ کے ساتھ دو بجے تک مصروف وقت گزاری رہے۔ شام کو میں حاضر ہوا۔ مزاج پرسی کی تو فرمایا کہ بھئی! آج طبیعت ٹھیک نہیں اور سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ یہاں درد ہو رہا ہے۔ پھر حسب معمول گفتگو ہوئی۔ تبصرے ہوئے بات چیت کے وہی تیور، وہی بذلہ سنجی، وہی خوش مذاقی، آج کی نشست میں بابائے اردو مولوی عبدالحق اور مصنف شہیر مولوی حکیم نجم الغنی خاں رام پوری کا ذکر خیر رہا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ ان دونوں بزرگوں پر اپنے تاثرات علیحدہ علیحدہ مضمون کی صورت میں لکھ دیجئے۔ نجم الغنی کے متعلق میں کئی مرتبہ کہہ چکا تھا فرمایا اگلے ہفتے تم آؤ گے تو انشاء اللہ نجم الغنی پر مضمون لکھا ہوا ملے گا۔ مگر نوشتۂ تقدیر کسے معلوم تھا کہ آج تو غضنفر صاحب کی کتاب حیات ختم ہو رہی ہے۔ ۱۱ محرم (۱۳۹۲ھ) (۱۵ فروری ۱۹۷۲ء) بروز جمعرات ٹھیک ۶ بجے صبح ادھر موذن نے "اللہ اکبر" کی صدا بلند کی اور ادھر غضنفر صاحب کے طائر روح نے جنت الفردوس کی راہ لی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

نہ دوا، نہ دارو، نہ علاج نہ معالجہ، نہ عیادت نہ مزاج پرسی نہ تیمار داری، نہ اعزہ و احباب کو تکلیف۔ آخر غضنفر صاحب کا مزاج بھی تو یہی تھا۔ بلکہ غضنفر صاحب نے اپنے ایک شعر میں پیش گوئی کر دی تھی۔

ہنگام نزع زحمت پرسش ہے کیا ضرور　　اب ساتھ چھوڑنے کو ہے عمر رواں مرا

غضنفر صاحب ۲۶ جولائی ۱۹۰۲ء کو روہیل کھنڈ (ضلع مراد آباد) کی مشہور تاریخی اور مردم خیز بستی امروہہ میں لودھی پٹھانوں کے ایک قدیم خاندان میں پیدا ہوئے۔ نام حبیب اللہ خاں رکھا گیا۔ ان کے والد کا نام احمد سعید خاں ابن عبدالرحمٰن خاں ابن مولوی نصر اللہ خاں ابن مینڈھو خاں تھا۔ غضنفر صاحب کے پردادا مولوی نصر اللہ خاں باقاعدہ عالم تھے۔ جب وہ تحصیل علم کر کے آئے تو انھوں نے اپنے خاندان اور قبیلے سے بعض غیر اسلامی اور مشرکانہ رسوم کا خاتمہ کیا۔ معلوم نہیں کن وجہ سے ان کے یہاں ناگ پنچمی کی رسم ہندوؤں کی طرح پورے لوازم و احتیاط سے ادا کی جاتی تھی۔ مولوی نصر اللہ خاں نے نہایت ہمت و جرأت سے ناگ پنچمی کے دن اس "ناگ" ہی کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد یہ رسم اس خاندان سے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گئی۔

ان کے خاندان میں کاشت کاری اور زمین داری کا مشغلہ تھا۔ بچپن میں غضنفر صاحب نے ان مشاغل میں بھی حصہ لیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم حسب رواج گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد وہ اسکول میں داخل ہو گئے مگر پرائیویٹ طور سے عربی و فارسی کی تحصیل کرتے رہے اور بے ترتیبی سے درس نظامی تک انھوں نے عربی کی تحصیل کی۔ ۱۹۲۳ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول امروہہ سے میٹرک پاس کیا اور گورنمنٹ انٹر کالج مراد آباد میں داخلہ لے لیا۔ دو سال مراد آباد میں رہے اور ۱۹۲۵ء میں انھوں نے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ ان کی کامیابی پر مراد آباد میں ان کی شہرت ہو گئی کیونکہ آرٹس کے پچیس طلبہ شریک امتحان ہوئے تھے۔ ان میں دس مسلمان طلبہ تھے۔ مسلمان طلبہ میں صرف غضنفر صاحب ہی کامیاب ہوئے

اس کے بعد غضنفر صاحب الہ آباد گئے اور ۱۹۲۷ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے انھوں نے بی اے پاس کیا۔ مسلم بورڈنگ ہاؤس میں قیام رہتا تھا۔ غضنفر صاحب وہاں کی علمی و ادبی تحریکوں میں خاص طور سے شریک ہوتے تھے۔ پھر ایم اے کے لیے ۱۹۲۷ء ہی میں ڈھاکہ میں داخلہ لیا مگر وہاں جی نہیں لگا اس لیے علی گڑھ چلے آئے اور ۱۹۲۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے عربی میں ایم اے کیا۔ علامہ عبدالعزیز میمن ان کے اسی زمانے کے استاد تھے۔

۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۱ء تک دو سال غضنفر صاحب الہ آباد یونیورسٹی میں ڈاکٹر

عبدالستار صدیقی مرحوم کے زیرِ نگرانی ریسرچ اسکالر رہے۔ اس زمانے میں انہوں نے معالی الہمم (منسوب بہ جنید بغدادی) اور فرہنگ جہانگیری پر کام کیا۔ اول الذکر رسالہ ان کے طویل انگریزی مقدمے کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

غضنفر صاحب نے ناگ پور کی ملازمت کے زمانے میں ۱۹۳۶ء میں فارسی ایم اے اور ۱۹۳۸ء میں اردو ایم اے ناگ پور یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور سے پاس کیا۔

غضنفر صاحب علم کے شیدائی تھے، ہندی اور سنسکرت زبانیں ہندو پنڈتوں سے پڑھیں۔ ہندی ادب کا خاصا مطالعہ تھا۔ انگریزی کا یہ حال تھا کہ براہ راست عربی زبان سے انگریزی میں ضخیم مجلدات ترجمہ کیں۔ ادب، عروض، معانی، بیان، صرف، نحو، تاریخ لسانیات، حدیث، فقہ، تفسیر، تاریخ اسلام، تاریخ ہند۔ سب پر گہری نظر تھی۔ پھر رمل نجوم، جفر، توقیت اور طب کے بھی ماہر تھے۔ معمہ، چیستان، سجع، زائچہ کسی چیز میں بند نہیں تھے۔ اپنا سجع کہا

عالم ہمہ روباہ حبیب اللہ غضنفر

تاریخ گوئی کا بھی ذوق تھا۔ نہایت موزوں اور مناسب مادۂ تاریخ نکالتے تھے۔ غرض اکثر علوم میں ماہر اور جامع صفات بزرگ تھے۔

غضنفر صاحب نے ایک موقع پر لکھا ہے:۔

"میری ولادت کے وقت جب میرے دادا (رشتہ کے) امین اللہ خاں مرحوم نے میرے کان میں اذان کہی تو بر بنائے قیافہ شناسی یہ پیش گوئی کی کہ اللہ تعالیٰ اس بچے کی عمر دراز کرے یہ علم بہت حاصل کرے گا۔"

ان بزرگ کا یہ خیال حرف بحرف صحیح ثابت ہوا۔

امروہہ علم و فضل اور تہذیب و ثقافت کا زمانۂ قدیم سے مرکز رہا ہے، ہر زمانے میں یہاں نامور علماء، صوفیہ، شعرا، حکماء، ادباء ہوئے ہیں۔ اور شعر و ادب کا ہمیشہ چرچا رہا ہے۔ سعادت امروہوی اور مصحفی کا وطن ہے۔

غضنفر صاحب ابھی اسکول ہی میں تھے کہ ان کو شاعری کا چسکا لگ گیا اور وہ وہاں کے

شعری ماحول سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"مصحفی کے وطن امروہہ میں ہمیشہ سے شعر و سخن کا چرچا رہا۔ شمیم، صفی، سخی وغیرہ اپنے زمانے کے مشہور سخن ور تھے۔ میں جب سن شعور کو پہنچا تو عمدہ شعر کہنے والوں کی بڑی تعداد موجود تھی ان میں مولوی قدرت اللہ حباب، سید حبیب احمد افق، وقار علی تاج، منظور احمد افسر، شبیر خان شبیر، اور مولوی عبد القیوم شفق نمایاں تھے۔"

ابتداء میں غضنفر صاحب مولوی عبد القیوم شفق سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور بعد ازاں انھوں نے جلیل القدر نواب فصاحت جنگ، حافظ جلیل مانک پوری سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ وہ شفق مرحوم کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت سے کرتے تھے اور ان کے اشعار سناتے تھے عین عالم شباب میں شفق کا انتقال ہوا۔ ان کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

ذرا وحشت نہ ہوگی ہم کو پیوند زمیں ہو کر ہماری قبر بیٹھے گی ہماری ہم نشیں ہو کر

اجل نے دور کر دی تلخ کامی زندگی بھر کی کنارِ قبر میں راحت ملی آغوش مادر کی

غضنفر صاحب نے پہلے غیرت تخلص اختیار کیا۔ استاد نے کہا کہ غیرت کو "او بے غیرت" کہہ کر بھی بلایا جا سکتا ہے۔ پھر انھوں نے غضنفر تخلص اختیار کر لیا۔ انھیں شروع میں شاعرانہ نوک جھوک سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ طالب علمی کے زمانے میں افسر امروہوی سے شعری بحث چھڑ گئی۔ غضنفر صاحب نے حافظ دین محمد نابینا کے نام سے افسر صاحب کے رد میں مضمون لکھا اور ان کی شاعری پر اعتراض بھی کیا۔ ان کا یہ مضمون میرٹھ کے رسالے "خورشید" میں شائع ہوا۔

ایک موقع پر منشی احمد علی شوق قدوائی کے ایما سے ان کے بعض تلامذہ نے جلیل مانک پوری کی شاعری پر اعتراض کیے اور مضامین لکھے۔ غضنفر صاحب نے اپنے استاد کی تائید میں مضمون لکھا اور شوق قدوائی کی شاعری پر اعتراض کیے۔ شوق قدوائی کا ایک شعر تھا۔

تیری لکنت کا میں قائل مگر اتنا تو کہہ کیا کرتا ہوں میں ہر بات پہ تکرار کہ تو

غضنفر صاحب نے اعتراض کیا کہ الکن ہر بات کی تکرار کر سکتا ہے وہ ہر بات پر تکرار نہیں کر سکتا۔ اس مضمون کا ادبی و شعری حلقوں میں خاصا چرچا رہا۔ بلکہ اس مضمون کو سن کر یاس یگانہ

چنگیزی نے تو غضنفرؔ صاحب سے کہا کہ تم میرے خلاف لکھو اور میں تمہارے خلاف لکھوں اس طرح دونوں کی شہرت ہوگی، مگر غضنفرؔ صاحب اس گوں کے آدمی نہ تھے۔

مسلم بورڈنگ ہاؤس الہ آباد میں اکتوبر کے مہینے میں تقسیم اسناد کے جلسے کے موقع پر مشاعرہ منعقد ہوتا تھا جس میں صفیؔ، ثاقبؔ، عزیزؔ، محشرؔ، ظریفؔ، اور یاسؔ یگانہ چنگیزی جیسے استادانِ فن شرکت کرتے تھے۔ غضنفرؔ صاحب بھی ان مشاعروں میں پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ مشاعرے میں ان کی غزل پر پروفیسر ضامن علی مرحوم نے چالیس نمبر دیئے اور جن دو طلبہ کو غضنفرؔ صاحب نے کہہ کر غزلیں دی تھیں ان کو ۵۰، ۴۵ نمبر دیئے، اگرچہ مسلم بورڈنگ ہاؤس کے طالب علم کو اوّل انعام ملا مگر ٹرافی ہندو ہوسٹل کو ملی۔ غضنفرؔ صاحب نے اس کو ناانصافی پر محمول کیا اور ایک شعر داغ دیا۔

اے غضنفرؔ دیکھ لی احباب کی فکر رسا
بس اسی پر ادعائے فہم استاد انہ تھا

پروفیسر ضامنؔ علی سمجھ گئے مگر انھوں نے کہا کچھ نہیں۔

غضنفرؔ صاحب اکثر مشاعروں میں شرکت کرتے۔ ناگپور کی ملازمت کے زمانے میں ان کی شاعری کا شباب تھا اور وہاں کے مشاعروں میں ان کی دھوم رہتی تھی۔ چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

مر کے ہاتھ آئی منزل مقصود
گوشۂ عافیت نہیں مفقود

چشم عبرت مگر یہ کہتی ہے
دیدنی ہے حباب بحر وجود

یکساں ہو ہجر و سرور شب عشرت
ایسا کبھی اے گردش دوراں نہیں ہوتا

سجدوں کے اضطراب کا عالم نہ پوچھئے
اتنا کہا جو اس نے کہ یہ آستاں مرا

ناکامیوں کو بعد فنا بھی تلاش ہے
اب بے نشانیوں میں ملے گا نشاں مرا

موت شاید اک سکونِ دائمی کا نام ہے
کہہ رہا ہے ... [illegible]

ڈالتا ہے کوئی معمورات نو کی داغ بیل   عالم تکوین میں ویرانی تعمیر سے

نوجوانی کی تاک جھانک گواہ   یہ سرشت بشر ہے کیا کہیئے
حور جنت پہ جان دیتا ہے   زاہد آخر بشر ہے کیا کہیئے

شب تاریک مرقد میں غضنفر یہ اندھیرا ہے   کہ مجھ کو اپنی شمع زندگانی یاد آتی ہے

کاندھا بدل بدل کے اٹھاتے ہیں لاش کو   اللہ کس قدر میں گرانبار ہو گیا

غضنفر صاحب نے تحصیل علوم کے بعد درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کا مشغلہ اختیار کیا۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک انھوں نے ناگ پور انجمن ہائی اسکول میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ پھر ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۳ء تک حبیب ہائی اسکول بمبئی میں رہے۔

۱۹۴۵ء میں کراچی کے مشہور تعلیمی ادارے ایس ایم کالج سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں اس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر امیر حسن صدیقی مرحوم تھے۔ ۱۹۴۸ء تک ایس ایم کالج سے ان کا تعلق رہا۔ جب ڈاکٹر امیر حسن صدیقی اسلامیہ کالج میں آ گئے تو غضنفر صاحب بھی اسی کالج میں چلے آئے اور ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک اسلامیہ کالج میں رہے پھر ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۷ء تک اردو کالج سے وابستہ رہے۔

کچھ دن معاون پروفیسر کی حیثیت سے یونیورسٹی میں بھی پڑھایا۔ جب اسلامیہ کالج میں ایم اے کا ٹیوشن سنیٹر قائم ہوا تو ڈاکٹر امیر حسن صدیقی مرحوم کی تحریک پر وہاں بھی تدریس کے فرائض انجام دیئے اردو کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد عثمانیہ کالج کے پرنسپل بھی رہے۔

خاکسار نے ۱۹۵۳ء میں اردو کالج میں بی اے (سہ سالہ نصاب) میں داخلہ لیا۔ میرا اختیاری مضمون اردو تھا جو غضنفر صاحب کے سپرد تھا، اتفاق سے شروع میں غضنفر صاحب نے تین چار روز تک غالب پر لیکچر دیا۔ جس کا رنگ یگانہ تھا۔ انھوں نے غالب کی ایک

نئی تصویر پیش کی جس سے ان کے وسیع مطالعے اور تبحرِ علمی کا اندازہ ہوا۔ وہ اردو سے زیادہ عربی شعر و ادب، فرزدق، امرأ القیس، ابو نواس، متنبی خلفائے عباسیہ و امویہ کا ذکر کرتے تھے۔ فلسفہ، تاریخ، عمرانیات، عروض و نحو ہر موضوع اور علم پر ان کی گفتگو ہوتی تھی، غرض وہ معلومات کا ایک بحرِ ناپیدا کنار اور علم کا ایک جنگل تھے۔ اگر ان کے مزاج میں ضبط و نظم اور ترتیب ہوتی تو افادے اور استفادے کا دائرہ وسیع تر ہوتا۔ طلبہ کلاس میں لیکچر کے دوران ان کی وسیع معلومات پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے اور وہ اس کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ غضنفر صاحب اپنی تقریر یا لیکچر میں اپنے موضوع سے جلد ہٹ جاتے تھے اور ان کو موضوع سے ہٹانا تو بہت آسان بات تھی جس روز طلبہ کا موڈ پڑھنے کا نہیں ہوتا تھا وہ کوئی غیر نصابی سوال کر دیتے تھے اور پھر غضنفر صاحب کی معلومات کا بحرِ بیکراں جاری ہو جاتا تھا جس کا نہ ساحل ہوتا اور نہ تھاہ۔

طلبہ غضنفر صاحب کا بڑا احترام اور ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ بھی طلبہ سے نہایت شفقت کا برتاؤ کرتے اور طلبہ کی ہر طرح مدد کرتے۔ کالج کے علاوہ گھر پر طلبہ کو پڑھاتے تھے۔ کالج سے سبکدوشی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ان کے شاگردوں کو جب کوئی دشواری ہوتی تو وہ غضنفر صاحب سے رجوع کرتے اور غضنفر صاحب ان کی علمی رہنمائی فرماتے۔ خاکسار ہر ہفتے جمعہ یا اتوار کو حاضرِ خدمت ہوتا تھا، گفتگو کے دوران بہت سے علمی نکتے ارشاد فرماتے تھے۔ علم ان کا مستحضر تھا۔ لیکن اگر کوئی بات معلوم نہ ہوتی تو صاف کہہ دیتے یہ بات مجھے معلوم نہیں ہے یا دیکھ کر بتاؤں گا یہی بات ان کے علم و فضل پر دال ہے۔ غضنفر صاحب کے پاس کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔

غضنفر صاحب کا رہن سہن نہایت سادہ تھا۔ تکلف و تصنع سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ اوسط درجے کی معاشرت تھی، دل کے بالکل صاف تھے بلکہ صاف گوئی ان کا مزاج تھا، چاپلوسی، ابن الوقتی اور زمانہ شناسی سے وہ کوسوں دور تھے۔ کھرے پٹھان، کھری بات چاہے کوئی راضی ہو یا ناراض۔ ایک مرتبہ خیاح کالج میں پرنسپل کے لیے بات چیت ہو رہی تھی، وہ اس ادارے کے سکریٹری کو ایک خاص "لقب" سے پکارتے تھے، انھوں نے

اس زمانے میں بھی القاب و خطاب کا وہی طریقہ رکھا نتیجہ ظاہر تھا کہ غضنفر صاحب اس ادارے کے پرنسپل نہ ہو سکے مگر ان کو ذرہ برابر ملال نہ ہوا۔ ان کے دوست مفتی انتظام اللہ شہابی کو اس عدم تقرر کا ضرور افسوس ہوا۔

اردو کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ عثمانیہ کالج کے پرنسپل ہو گئے۔ انھوں نے اپنے کام سے کام رکھا۔ جوڑ توڑ اور انتظامیہ کے ذریعے آگے بڑھنا ان کے بس کی بات نہ تھی لہٰذا جلد ہی سبکدوش ہو گئے۔

ان کا علم پختہ اور ٹھوس تھا وہ کسی سے مرعوب ہونا تو جانتے ہی نہ تھے۔ بعض لوگ مستشرقین سے خاص طور سے مرعوب ہوتے ہیں۔ غضنفر صاحب مستشرقین کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے تھے بلکہ وہ ان کی غلطیوں، غلط استدلال، استنباط نتائج اور دسیسہ کاریوں کو طشت ازبام کر دیتے تھے۔ سابق وزیر تعلیم مرحوم فضل الرحمن جن کے نام سے علامہ شبلی کی سیرت النبیؐ (جلد اول) کا انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے غضنفر صاحب کے علم، رائے اور صاف گوئی کی بڑی قدر کرتے تھے اور بعض معاملات میں دوسروں کی رائے پر غضنفر صاحب کی رائے کو فوقیت دیتے تھے۔

غضنفر صاحب ایک بااصول شخص تھے۔ بڑوں کا ادب، چھوٹوں کا لحاظ اور اعزہ کی خبر گیری ہر بات کا لحاظ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ کالج میں امتحان کے موقع پر جس کمرے میں غضنفر صاحب نگراں تھے، ایک استاد نے ایک طالب علم کو نقل کی سہولت بہم پہنچانی چاہی غضنفر صاحب کو کسی طرح اس کا اندازہ ہو گیا، انھوں نے فوراً نگرانی سے قطع تعلق کر لیا۔ شدہ شدہ یہ بات ارباب حل و عقد کے علم میں بھی آ گئی لہٰذا تین سال کے لیے کالج امتحانی مرکز نہیں رہا۔ ان کے یہاں سعی سفارش کا کوئی سوال نہ تھا۔ امتحانات کے موقع پر بعض ممتحن رول نمبروں کی ایک طویل فہرست اپنے پاس رکھتے ہیں۔ غضنفر صاحب اس کو سخت ناپسند کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ افسوس استاد اپنے مقام اور امتحان کے تقدس دونوں چیزوں سے ناواقف ہے۔

غضنفر صاحب کا علمی پایہ بہت بلند تھا۔ علوم اسلامیہ پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ تقریباً دس سال تک وہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے وابستہ رہے اور وہاں کے عظیم علمی منصوبوں پر کام کرتے رہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی معرکہ آرا کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" کا ترجمہ سوسائٹی

نے محمود حسین خاں (رام پوری) سے انگریزی میں کرایا تھا، ضرورت تھی کہ کوئی بالغ نظر عالم اس پر نظر ثانی کرے۔ غضنفر صاحب نے اس کام کو باحسن وجوہ انجام دیا۔ ابن خلکان کے انگریزی ترجمے کی ترتیب و تہذیب کے فرائض انجام دے رہے تھے، طبقات ابن سعد کی کئی جلدوں کا عربی سے انگریزی میں بلا شرکت غیرے ترجمہ کیا۔ ابن اثیر کی دوسری جلد کے ایک حصے کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ابھی حال میں البیرونی کی عربی سوانح حیات کا تلخیص و ترجمہ کیا، اقبال اکیڈیمی کے لیے کتاب الام کا ترجمہ کر رہے تھے، معلوم نہیں اس کا کیا ہوا۔ غضنفر صاحب نے وقتاً فوقتاً پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے بہت سے علمی کاموں میں مدد کی اور نظر ثانی تو معلوم نہیں کن کن چیزوں کی کی ہے۔ ہدایہ کے باب مضاربت کا انگریزی ترجمہ کیا۔ اس طرح سید سلیمان ندویؒ کی سیرت النبیؐ کے باب معجزات کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔

غضنفر صاحب کی انجیل (عہد نامہ قدیم و جدید) پر گہری نظر تھی، تالمود کے حوالے ازبر تھے۔ کسی زمانے میں غضنفر صاحب کو مناظرے کا بھی شوق رہا تھا۔ آریوں اور عیسائیوں سے خوب مناظرے کیے تھے۔ شیعہ لٹریچر پر بھی نظر تھی الزامی حوالے بھی خوب یاد تھے، حافظہ اچھا تھا اور اپنے اور معاصرین کے بہت سے اشعار یاد تھے۔

غضنفر صاحب کی اردو کے ادب عالیہ پر بڑی گہری نظر تھی وہ الفاظ کے اشتقاق و استخراج اور عروض کے ماہر کامل تھے۔ بعض اوقات اپنی گفتگو میں خاص علمی و ادبی نکتے بیان کرتے تھے، ایک مرتبہ فرمایا کہ لوگ سودا کے مندرجہ ذیل شعر میں "خدام ادب" کو اضافت کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت   خدام، ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

اس شعر میں ادب کے بعد "سے" اضافہ کر لو مطلب واضح ہو جائے گا۔ اس زمانے میں حرف جار کو حذف کر کے لکھتے تھے، میں نے سند چاہی، دوسرے دن اس طرح کے کئی اشعار سودا و میر کے کلام سے منتخب کر کے دکھائے۔ اس طرح کے نکتے اکثر بیان کرتے تھے۔ مخمور اکبر آبادی کی کتاب "فانی۔ شخصیت اور حسن بیان" ملاحظہ فرمائی تو اس کی تحسین کی مگر فاضل مصنف کی اس رائے سے سخت اختلاف کیا کہ فانی پکے اور گہرے نیشنلسٹ تھے،

فرمایا کہ اس سلسلے میں مخمور صاحب نے کھینچا تانی کی ہے بلکہ جب کتاب میں مندرجہ ذیل رباعی

حب الوطن ز ملک سلیمان خوشتر — خار وطن از سنبل و ریحان خوشتر

یوسف کہ بہ مصر بادشاہی می کرد — می گفت گدا بودن کنعان خوشتر

دیکھی تو کہا کہ یہ رباعی اکثر لوگ غلط پڑھتے ہیں۔ مخمور صاحب نے تو "ال" کا اضافہ بھی کر دیا، اس میں "حب وطن" نہیں ہے۔ یہ لفظ "جب وطن" ہے عربی میں "جب" اندھے کنوئیں کو کہتے ہیں اور قرآن کریم میں سورۂ یوسف میں "جبُ" کا لفظ آیا ہے۔

مندرجہ ذیل علمی و ادبی کام ان سے یادگار رہے۔

۱۔ **معالی الھمم** :۔ یہ جنید بغدادی سے منسوب ہے اور تصوف کے قدیم اور بنیادی ادب میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ انگریزی کے ساتھ یہ عربی رسالہ شائع ہو چکا ہے۔

۲۔ **تنزلات ستہ** :۔ ملا عبد العلی بحر العلوم کے رسالہ تنزلات ستہ کا اردو ترجمہ (اقبال ریویو کراچی ۱۹۶۵ء) میں شائع ہوا ہے۔

۳۔ **ہندی ادب** :۔ شروع میں یہ مقالہ رسالہ اردو میں شائع ہوا ہے۔ ابھی حال میں غضنفر اکیڈیمی نے اس کو کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے۔

۴۔ **اردو کا عروض** :۔ ایم اے کے نصاب میں شامل ہے۔

۵۔ **اردو کا نیا عروض** :۔ اس میں اردو عروض پر بحث کی ہے۔

۶۔ **مثنوی ناسخ** :۔ ناسخ کی مثنوی مقدمے کے ساتھ ترتیب دی کتاب چھپ چکی ہے۔

۷۔ **کلام ناسخ** :۔ ناسخ کے دیوان کو مرتب کیا ہے، ایک طویل مقدمہ لکھا ہے۔ خطی نسخوں سے بہت سا ایسا کلام انتخاب کر کے اس میں شامل کیا ہے جو مطبوعہ نسخے میں نہیں ہے۔ یہ کلام غیر مطبوعہ ہے۔

۸۔ **معمیات جامی** :۔ جامی کے معمے حل کیے ہیں اردو رسالے میں یہ مقالہ شائع ہوا ہے۔

۹۔ **معمیات کاہی** :۔ قاسم کاہی کے معموں کو حل کیا ہے یہ بھی شائع ہو چکے ہیں۔

۱۰۔ **سنسکرت ادب** :۔ ہندی ادب کی طرح سنسکرت ادب پر بھی ایک طویل مقالہ لکھا تھا، یہ بھی رسالہ اردو میں چھپ چکا ہے۔

غضنفرؔ صاحب نے فردوس بریں، فلورا فلورنڈا، مقدس نازنین، منصور اور موہنا اور مشرقی تمدن کا آخری نمونہ پر مقدمے لکھے ہیں۔ کراچی کے مشہور تاجر کتب سلطان حسین نے جب نور اللغات کو دوبارہ شائع کیا تو اس پر نظر ثانی وغیرہ کا کام غضنفرؔ صاحب نے انجام دیا۔ اردو کالج کے مشہور علمی مجلہ "برگ گل" کے نگراں رہے۔

غضنفرؔ صاحب نے یوں تو بہت سے مضامین لکھے ہیں جو پاکستان و ہند کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ہیں لیکن ان کے مندرجہ ذیل مقالے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

(۱) موازنہ سحر البیان اور گلزار نسیم۔

(۲) موازنہ گلزار نسیم، مذہب عشق و ترانۂ شوق۔

(۳) اردو تذکروں کا تقابلی مطالعہ

(۴) اردو میں تمثیل نگاری

(۵) دیسی زبانوں کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ۔

(۶) اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے مختلف نظریے[1]

(۷) خود نوشت غضنفرؔ۔ جو ماہنامہ "شخصیات" کراچی میں شائع ہوئی۔

یہ سب کچھ ہوا مگر بقول شخصے ان کے علم و فضل کے اعتبار سے ان کا کوئی علمی کارنامہ وجود میں نہ آیا، ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے۔

قطعۂ تاریخ انتقال

از خاکسار محمد ایوب قادری

عروض و ادب میں تھے وہ بے مثال
سپہر معارف کے تھے آفتاب

تبحر میں ان کے کوئی شک نہیں
بہت کم ہیں ان ایسے عالی جناب

جو چاہا غضنفرؔ کا سال وفات
صدا آئی "ہے ہے فضیلت مآب"

۱۳۹۳ھ

---

[1] یہ دونوں باب "تاریخ ادب اردو" (کراچی ۱۹۶۱ء) میں شامل ہیں۔

سیّد ایوبؒ احمد صبرؔ

شہباز نگر ضلع شاہجہاں پور (یو۔پی) کا ایک مشہور قصبہ ہے، شہر سے تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ نواب بہادر خاں بانیٔ شاہجہاں پور کے ایک ساتھی شہباز خاں نے یہ قصبہ آباد کیا تھا۔ نواب شہباز خاں کے خاندان میں نواب نظام علی خاں مشہور بطلِ حرّیت گزرے ہیں۔ جنہوں نے انقلاب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ اور جامِ شہادت نوش کیا۔

ہماری درخواست پر اس قصبہ کے تاریخی حالات ایک کتابچہ کی شکل میں مرحوم ایوبؒ احمد صبرؔ نے لکھے ہیں۔ جس کا قلمی نسخہ ہمارے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ ایوبؒ احمد صبرؔ صاحب نے اپنے اور اپنے خاندان کے حالات اس کتاب میں تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

ایوبؒ احمد صبرؔ ایک مشہور قومی کارکن تھے۔ اُنھوں نے تحریکِ آزادی میں عملی حصّہ لیا۔ اور قید و بند کے شدائد بھی برداشت کئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آگئے تھے۔ اور یہاں زندگی کے دن پورے کرکے ۱۶ر مارچ ۱۹۷۳ء کو جنت الفردوس کی راہ لی۔ اب ان کا حال خود اُن کی زبانی سُنیئے۔

"میں سید ایوب احمد صبرؔ، مولانا محمد علی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے کارکنوں میں سے تھا۔ جب مولانا کو مالٹا میں نظر بند کیا۔ اور ہندوستان میں انجمنِ خُدّام کعبہ قائم کی گئی۔ تو پہلا شخص میں تھا جس نے کعبہ کی حفاظت کے لئے زندگی وقف کی۔ اور اس کے بعد تیس سال تک اسلامی اور سیاسی اُمور میں حصّہ لیتا رہا۔ تقریباً

چار پانچ مرتبہ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ میں نصف درجن
کتابوں کا مصنف و مؤلف ہوں۔ آفتابِ نبوت، الطیبات، گلِ رعنا
پُر اسرار موت ——— شائع ہو چکی ہیں۔ خلفائے راشدین، بنتِ
رسول اور بنتِ بتول عنقریب کراچی میں شائع ہونے والی ہیں۔[۱]
مجھے "صبر" کا تخلص مولانا محمد علی اور مولانا حسرت موہانی نے دیا تھا۔ ۱۹۱۹ء
میں رولٹ ایکٹ کی مخالفت میں "میں" نے ایک جلسہ کیا۔ اس سلسلہ
میں مجھ پر مقدمہ چلا۔ سال بھر کی سزا اور سو روپیہ جرمانہ ہوا۔ آنریبل
سر رضا علی خاں نے اپیل پر آکر وکالت کی تو رہائی ہوئی۔
۱۹۲۰ء میں پراونشل خلافت کمیٹی یو۔پی کا اسسٹنٹ سکریٹری
تھا۔ میں نے ایک نظم "شکریۂ انگلینڈ" لکھی۔ وہ چار صوبوں میں ضبط
ہوئی۔ دفعہ ۱۲۴ اور ۲۶ میں مقدمہ چلا۔ اس میں سزا ہو گئی۔ میں نے
میرٹھ جیل میں قیدیوں کی ہمدردی میں بھوک ہڑتال کی، اور بہت سی
آسانیاں قیدیوں کو دلوائیں۔ خود کئی اخبار نکالے۔ کانپور کے روزنامے
"مشیر" اور "منیر" کئی سال میری ادارت میں چلے، اور بہت مقبول ہوئے
اخبار کے سلسلہ میں پھر مجھے ایک مرتبہ جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ میں
انگریزوں کا سخت مخالف رہا۔ آج پاکستان میں یہ کوئی نہیں جانتا۔ کہ
کون قومی کارکن ہے، اکاکوری کیس میں بھی مجھے لیا جا رہا تھا۔ مگر بال
بال بچ گیا"
سید ایوب احمد صبر نے کن حالات میں ہجرت کی، اور آج کیا حالات ہیں۔

---

[۱] صبر مرحوم کی متعدد کتابیں۔ رحمان برادرس کراچی اور سلطان حسین کتب فروش کراچی نے شائع
کیں۔ مرحوم نے آخر میں اہلِ شاہجہاں پور کی درخواست پر تاریخ شاہجہانپور مرتب کی تھی، جو سلطان حسین
"کتب فروش کراچی" کے یہاں طبع ہو رہی تھی کہ اسی دوران میں صبر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ معلوم نہیں اس مسودہ کا کیا حشر ہوا۔

اس کے متعلق ملاحظہ ہو۔

"تقسیم ہند کے بعد ہندوؤں نے خودسری شروع کی۔ اور تعصب میں آکر شہباز نگر کے مسلمانوں پر دس ہزار کے ہندو مجمع نے چڑھائی کی جس میں سنگھی سورما پیش پیش تھے۔ یہ قصبہ اُجاڑ ہوگیا۔ کچھ مسلمان اب بھی شہباز نگر میں آباد ہیں۔ بہت سے پاکستان چلے آئے، اور خانہ بدوشوں کی زندگی گزار رہے ہیں۔ فٹ پاتھ آباد کئے ہوئے ہیں۔ اور جھگیوں میں برسات اور سردیاں گزار رہے ہیں۔ اور پاکستان میں کوئی ان کا پرسان حال نہیں۔" وائے بر حال ما"

کتاب کا اختتام ان سطور پر ہوا ہے۔

"میں نے مہاجرت کی حالت میں وطنِ عزیز قصبہ شہباز نگر (ضلع شاہجہانپور قسمت روہیل کھنڈ) کے یہ مختصر حالات بعض احباب کی تحریک پر قلمبند کئے۔ اور ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو اختتام پذیر ہوئے۔"

مولوی حفیظ اللہ پھلواروی

۱۹۶۱ء کا ذکر ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس کی لائبریری میں ایک چھوٹی سی کتاب "سلاطین ہند کی علم پروری" نظر سے گزری۔ اس کو الٹا پلٹا تو معلوم ہوا کہ مؤلف نے برصغیر کے مسلم سلاطین کی معارف نوازی اور علمی سرپرستی پر صحت و سند کے ساتھ لکھا ہے طبیعت خوش ہوگئی۔ اس کتاب کے مؤلف تھے "مولوی حفیظ اللہ پھلواروی" اور اس کو "مسلم اکیڈیمی پھلواری" نے شائع کیا تھا۔ پھلواری، صوبہ بہار کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے مگر صدیوں سے علم و عرفان کا مرکز چلا آرہا ہے۔ وہاں کے اصحاب شریعت و طریقت، برصغیر میں مشہور و معروف رہے ہیں دور آخر کے اکابر میں شاہ بدرالدین (ف ۱۳۴۳ھ) اور شاہ محمد سلیمان پھلواروی (ف ۱۳۵۴ھ) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شاہ غلام حسنین، شاہ جعفر ندوی، اور مولانا حسن مثنی بھی اس خانوادہ تصوف کے معزز ارکان ہیں۔

مولوی حفیظ اللہ پھلواروی کی اس کتاب کو ہم نے دلچسپی سے پڑھا اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ انگریزی زبان میں نریندر ناتھ لا (این۔ این۔ لا) کی مشہور کتاب

(PROMOTION OF LEARNING UNDER THE MOHAMMEDAN RULE)

ہے جو فارسی کتابوں کے انگریزی تراجم کی مدد سے لکھی گئی ہے اور اس کا خاص ماخذ ایلیٹ کی کتاب

(HISTORY OF INDIA AS TOLD BY ITS HISTORIANS).

رہا ہے۔ بہت سی خامیوں اور نقائص کے باوجود اس موضوع پر یہ کتاب غنیمت ہے۔ اس سلسلے میں ایس۔ ایم جعفر صاحب (پشاور) کی کتاب EDUCATION IN MUSLIM INDIA) بھی قابل ذکر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر اردو زبان میں کام کا آغاز دارالمصنفین اعظم گڑھ نے کیا اور اس کی خشت اول مولوی ابوالحسنات (ف ۱۹۲۴ء) کی کتاب "ہندوستان

کی قدیم اسلامی درسگاہیں،" ہے پھر اس موضوع پر معرکہ کی کتاب "مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" مولانا مناظر احسن گیلانی (ف ۵ جون ۱۹۵۶ء) نے لکھی۔ مولانا حکیم عبدالحی صاحب نزہتہ الخواطر (ف ۱۳۴۱ھ) کی قلمی کاوشیں بھی قابلِ ذکر ہیں مگر مولوی حفیظ اللہ پھلواروی کی مختصر سی کتاب "سلاطینِ ہند کی علم پروری" خاصے کی چیز نظر آئی اور مصنف کے وسعتِ مطالعہ اور خلوص کا ہمارے دل پر ایک نقش ثبت ہوگیا۔

۱۹۶۴ء کا ذکر ہے کہ کراچی میں پیر الٰہی بخش مرحوم کے دولت کدہ پر "یوم سلطان ٹیپو شہید" کی مناسبت سے ایک علمی مجلس منعقد ہوئی جس کے انعقاد و اہتمام کا تمام تر سہرا مولانا اسد القادری صاحب کے سر تھا۔ مولانا نے کراچی کے نامور اصحابِ علم وفضل کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ ممتاز دانشوروں اور مؤرخین نے سلطان شہید کی زندگی کے مختلف پہلوؤں، نظام سلطنت، بے تعصبی وغیرہ پر معلوماتی اور تحقیقاتی مقالے پڑھے لیکن جب مولوی حفیظ اللہ پھلواروی نے سلطان ٹیپو کی معارف پروری اور علمی کارناموں اور سرپرستی پر اپنا شاہکار مضمون پڑھا تو مجموعی طور سے اہلِ مجلس اس مقالہ کی طرف متوجہ ہوگئے اور سب نے پسندیدگی کا اظہار کیا۔ صدر مجلس نے اپنی صدارتی تقریر میں اس مقالہ پر خاص طور سے اظہار رائے کیا۔ یہ مقالہ اس مجلس کا حاصل اور شاہکار ٹھہرا اور میرے خیال سے اسی جلسے اور مقالے کے ذریعے کراچی کے اصحابِ علم وفضل میں مولوی حفیظ اللہ پھلواروی کا پہلی مرتبہ تعارف ہوا۔ افسوس کہ یہ مضمون شائع نہیں ہوا۔ بعد میں انھوں نے اس پر نظر ثانی اور مزید اضافے کیے تھے۔

اس جلسے کے بعد مولوی حفیظ اللہ پھلواروی سے اکثر علمی اجتماعات ومجالس میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ خاص طور سے جو اجتماعات مولانا اسد القادری صاحب کے زیر اہتمام ہوتے تھے ان میں وہ ضرور تشریف لاتے تھے۔ مولوی حفیظ اللہ کے مقالات ومضامین پاکستان کے مختلف، علمی، ادبی اور مذہبی پرچوں میں نظر سے گزرتے تھے جن کا موضوع بالعموم اسلامی تہذیب و ثقافت اور تعلیم وتعلم ہوتا تھا۔ بہاولپور کے مشہور علمی رسالہ "الزبیر" کے "کتب خانہ نمبر" شائع ہونے کا اعلان ہوا۔ اس کے فاضل مدیر "جناب مسعود حسن شہاب دہلوی" نے مضامین کی فراہمی کے سلسلے میں مجھ سے بھی مشورہ اور تبادلہ خیال کیا۔ حبیبی وصدیقی حکیم محمود احمد برکاتی صاحب

کے ذریعہ مولوی حفیظ اللہ صاحب نے اس موضوع پر دو قیمتی مضمون مجھے بھجوائے۔ مولوی صاحب کتابوں اور کتب خانوں کے بہت قدرداں تھے۔ وہ اہل علم، کتابوں کے شائقین اور کتب خانوں کی ٹوہ اور تلاش رکھتے تھے۔ ایک صاحب "محمد نسیم گوالیاری ایم۔اے" ہیں ان کے پاس کتابوں کا بہت اچھا ذخیرہ ہے۔ مولوی صاحب کی معیت میں گوالیاری صاحب کے ذخیرۂ علمیہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور اب مولوی حفیظ اللہ کے یہاں آمد و رفت شروع ہوگئی پھر وہ "ادارۂ تحقیق و تصنیف" کے باقاعدہ رکن بن گئے اور ۱۹۷۲ء کے انتخاب میں اس ادارہ کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ اب ان سے ہفتہ وار ملاقات لازمی ہوگئی۔ علمی گفتگو، مقالوں کے عنوانات کی تجویز، کتابوں اور مواد کی تلاش، اور مختلف علمی مباحث پر تبادلہ خیال ہوتا۔ ان کی عالی ظرفی کا یہ عالم کہ مضمون لکھتے وقت مشورہ فرماتے، غرض ان کی نیک نفسی، خلوص اور محبت کا نقش روز بروز گہرا اور پائیدار ہوتا گیا۔

اُن کی ایک کتاب "اسلامی مساوات" ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ علامہ اقبال مرحوم نے اس کتاب پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا اور اس کے انگریزی ترجمہ کی تحریک کی علامہ اقبال تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ کا رسالہ اسلامی مساوات بہت معنی خیز ہے اس قسم کا لٹریچر کثرت سے ملک میں شائع ہونا چاہیئے اور بالخصوص ہندوستان کی غیر مسلم اقوام میں، کیونکہ ان اقوام کو اسلام کے اس پہلو سے مطلق آگاہی نہیں، اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ہوجائے تو بہت بہتر ہو۔"

چنانچہ علامہ مرحوم کی تجویز و تحریک پر اس کتاب کا انگریزی ترجمہ (ISLAMIC BROTHERHOOD) کے نام سے شائع ہوا۔ جس کی اشاعت کا سہرا جناب فخر الدین سابق وزیر تعلیم بہار کے سر رہا۔ مولوی صاحب نے ۱۹۷۱ء میں اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن کے شائع کرنے کا ارادہ کیا تو راقم الحروف کو "مقدمہ" لکھنے کا حکم دیا میں نے بطور تعمیل ارشاد مقدمہ لکھا۔ مقدمہ پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

مولوی حفیظ اللہ پھلواروی سیدھے سادھے سچے پکے مسلمان تھے۔ صوم و صلوٰۃ

کے پابند اور زیارتِ حرمین شریفین سے مشرف کیا۔ ان کی تمام صلاحیتیں اور جد وجہد تصنیف و تالیف میں صرف ہوتی تھیں۔ ملک کا شاید ہی کوئی علمی و مذہبی پرچہ ایسا ہوگا جس میں پھلواروی مرحوم کے مضامین و مقالات نہ شائع ہوتے ہوں ان کا موضوع تمام تر اسلامیات، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و ثقافت، تعلیم اور علمی و تہذیبی ادارے اور شخصیات ہوتا تھا۔ صلہ و ستائش سے بے پرواہ ہو کر لکھتے تھے۔ "العلم" کراچی۔ "فاران" (کراچی) "البلاغ" (کراچی) "بینات" (کراچی)۔ "بہار نو" (کراچی) "قومی زبان" (کراچی) "الوارث" (کراچی) "بصیر" (کراچی) روزنامہ "جنگ" (کراچی)، روزنامہ "حریت" کراچی۔ "انجمن" (کراچی)۔ "ماہ نو" (کراچی)۔ "مہر نیمروز" (کراچی)۔ "الولی" (حیدرآباد)۔ "الحق" (اکوڑہ خٹک) "المعارف" (لاہور)۔ "الزبیر" بہاولپور "ارشاد" (سیالکوٹ)۔ "ضیائے حرم" (لاہور) وہ رسائل و جرائد ہیں جن میں مولوی حفیظ اللہ پھلواروی کے مضامین مستقل شائع ہوتے رہے ہیں۔ بعض پرچوں میں تو ان کے طویل مضمون بالاقساط شائع ہوتے تھے۔

پچھلے دنوں میرے محترم دوست حامد نظامی صاحب (لاہور) کا گرامی نامہ آیا کہ "ضیائے حرم" کا "فاروق اعظم نمبر" نکل رہا ہے۔ خود اور اپنے احباب سے مضمون بھجوایئے۔ میں نے مولوی مولوی حفیظ اللہ سے ذکر کیا، فرمانے لگے کہ اس موضوع پر میرے پاس دو مضمون تیار ہیں — (۱) عہدِ فاروقی کی تعلیمی ترقی (۲) فتوحاتِ فاروقی، آخر الذکر طویل ہے اور اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، آپ پہلا مضمون بھیج دیجئے۔ چنانچہ دو تین دن کے بعد اپنے صاحبزادے جناب شفیع اللہ صاحب کے ذریعہ مندرجہ ذیل خط کے ساتھ وہ مضمون میرے پاس بھیج دیا۔ مولوی صاحب کا یہ آخری مکتوب میرے نام ہے۔

مکرمی و عزیزی جناب قادری صاحب

سلام مسنون!!

حسبِ ارشاد ایک مضمون "ضیائے حرم" فاروق نمبر کے لیے حاضر ہے۔ آپ یہی بھیج دیں۔ فتوحات پر لکھ رہا ہوں۔ اس میں دیر لگے گی۔

خیریت کا خواہاں :- حفیظ اللہ ۱۵ دسمبر ۷۳ء

پڑھنے سے معلوم ہوا کہ اس موضوع پر قابلِ قدر مضمون ہے۔

کراچی کے علمی حلقوں میں مولوی صاحب کا تعارف تھا۔ مشرقی تہذیب و اقدار کے وہ امین و محافظ تھے۔ خوردی و بزرگی اور خاطر احباب کا خاص لحاظ رکھتے تھے جن لوگوں سے تعلقات اور روابط تھے انھیں ہر حال میں نبھاتے تھے۔ مولانا حسن مثنیٰ خاندانِ پھلواری کے گل سرسبد ہیں۔ اُن کے عمِ محترم شاہ جعفر صاحب جب لاہور سے کراچی آتے تو مولوی حفیظ اللہ مرحوم، مولانا حسن مثنیٰ کے یہاں "العمران" ضرور پہنچتے علماء و اہل علم کے تذکرے، تصوف و اہل تصوف کے اذکار، تاریخی واقعات، علمی نکات، مسائلِ حاضرہ زیر بحث آتے۔ مولانا شاہ جعفر پھلواروی اس مجلس کے صدرِ اعظم ہوتے تھے۔ مولوی صاحب کی معیت میں اکثر میں شریک ہوتا تھا۔ اس قسم کی آخری مجلس مولوی حفیظ اللہ صاحب کے خویش جناب عبدالحکیم صاحب کے یہاں ان کے نو تعمیر مکان واقع سوسائٹی کے افتتاح کے موقع پر ہوئی تھی۔ شاہ جعفر صاحب نے موقع کی مناسبت سے مختصر سی تقریر بھی کی۔ اختتام تقریب کے بعد جو نشست ہوئی وہ یادگار رہے۔ شاہ جعفر صاحب نے تفسیری نکات، علمی نکتے، تاریخی واقعات، پھلواروی کے بزرگوں کے حالات اور ماضی قریب کے بعض سیاسی معاملات پر دلچسپ انداز میں روشنی ڈالی۔ کاش یہ گفتگو قلم بند کرلی جاتی تو نادر علمی تحفہ ہوتی اور معلومات کا خزینہ، شاہ جعفر صاحب دسمبر ۷۳ء کے تیسرے ہفتے میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ میں بعض مصروفیات کی وجہ سے مولوی حفیظ اللہ کی معیت میں شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا۔ افسوس کہ اب ایسا اجتماع کہاں ہوگا کہ جس میں شاہ جعفر صاحب ہوں، مولانا حسن مثنیٰ ہوں، شاہ زید ہوں، مولوی حفیظ اللہ ہوں اور میں ہوں، اور پھر داستانِ ماضی اور تذکرۂ اربابِ فضل و کمال۔

مولوی حفیظ اللہ صاحب ایک علمی خاندان کے رکن تھے ان کے پردادا مولوی عظیم اللہ مرحوم صاحب علم و فضل تھے انھوں نے فقہی مسائل کا انتخاب "منتخب المسائل" کے نام سے اردو زبان میں ۱۲۵۳ھ میں کیا تھا اسی طرح انھوں نے ۱۲۵۱ھ میں تین ہزار تیرہ اشعار پر مشتمل ایک منظوم معراج نامہ لکھا اس کی تاریخ اتمام اس طرح کہی ہے:۔

ہوا معراج نامہ ختم بس جب — ہوئی تاریخ اس کی مجھ کو مطلوب
کہ اتنے میں کہا ہاتف نے مجھ سے — سُنو اب قصۂ معراج ہے خوب

مولوی عظیم اللہ مرحوم نے معراج نامہ کا آغاز "حمد" سے کیا ہے اور سورۂ الحمد کا منظوم ترجمہ بطور حمد لکھا ہے جس کو ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔

تمامی حمد ثابت ہے خدا کو — کہ رب ہژدہ ہزار عالم کا ہے جو
بہت ہی مہرباں بندوں کے اوپر — وہ نعمت دینے والا ہے مقرّر
وہ مالک دن قیامت کا ہے مولا — کہ لیوے گا حساب اُس روز سب کا
تری ہم بندگی کرتے ہیں کرتار — تجھی سے ہم مدد چاہیں ہیں ہر بار
بتا دے ہم کو سیدھی راہ ربّی — کہ ہم ہوویں نہیں گمراہ ربّی
اونہوں کی راہ جن پر تو نے نعمت — عطا کی ہے خدایا اور رحمت
نہ اون کی راہ جن پر تو غضب ہے — فقط گمراہی کا اون پر سبب ہے
نہ اون کی راہ جو ہیں گمراہ بے دیں — کہ ہیں روز ازل سے دشمن دیں
خدایا مجھ کو اور سب مومنوں کو — ہدایت ایسی ہی دے ہم سبھوں کو

مولوی عظیم اللہ مرحوم کے صاحبزادے مولوی یقین اللہ تھے جن کی تمام زندگی درس و تدریس اور خطابت و امامت میں گزری ان کے صاحبزادے امین اللہ ہوئے۔ حاجی امین اللہ (ف ۱۹۵۰ء) ریلوے کے محکمے میں ڈرافسٹمین تھے۔ وہ نہایت دیانتدار اور نیک بزرگ تھے۔ یہ خاندان موضع متھیا کانسرائے کا رہنے والا تھا جو پھلواری سے دس بارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حاجی امین اللہ صاحب کی شادی پھلواری میں ہوئی تھی لہٰذا انھوں نے پھلواری میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

مولوی حفیظ اللہ صاحب کی پیدائش ۴ فروری ۱۸۹۶ء کو پٹنہ میں ہوئی جہاں ان کے والد ماجد بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے۔ ابتدائی تعلیم بھی پٹنہ میں ہوئی۔ حسب رواج عربی و فارسی سے تعلیم کا آغاز ہوا۔ پھر ان کے والد کا تبادلہ کلکتہ ہوگیا۔ ۱۹۱۶ء میں کلکتہ سے مولوی حفیظ اللہ نے میٹرکولیشن کا امتحان پاس کیا اور بوجوہ مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکے مگر مطالعہ اور تصنیف و

تالیف ان کا جزو زندگی بن گیا، کچھ دنوں انھوں نے ریلوے کے محکمے میں ملازمت کی پھر صوبہ بہار کے پی ڈبلیو ڈی میں ملازم ہو گئے۔ اور "سردفتر" قرار پائے۔ ۱۹۶۱ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۶۲ء میں حج بیت اللہ کی زیارت سے مشرف ہوئے چونکہ مولوی صاحب کے بچے پاکستان آچکے تھے لہذا مارچ ۱۹۶۳ء میں وہ بھی پاکستان (کراچی) آگئے۔

مولوی حفیظ اللہ تاریخ اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت پر گہری نظر رکھتے تھے اور اس سلسلے میں ان کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ وہ ۱۹۱۹ء سے مستقل طور سے پھلواری میں مقیم رہے۔ اسی سال ۱۹۱۹ء میں پھلواری میں انھوں نے ایک علمی و اصلاحی انجمن "مسلم ایسوسی ایشن" کے نام سے قائم کی جس کا مقصد مسلم نوجوانوں کی تعلیمی و علمی تربیت تھا اسی طرح چھوٹے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ۱۹۳۶ء میں انھوں نے "انجمن تعلیم الاطفال" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ مولوی حفیظ اللہ اس کے سکریٹری تھے۔ انھوں نے ایک پبلشنگ ہاؤس کے قیام کا منصوبہ بھی بنایا مگر بعض لوگوں کے اختلاف کی وجہ سے یہ اسکیم عملی شکل اختیار نہ کر سکی۔ بعد ازاں مولوی صاحب نے "مسلم اکیڈمی" کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا، جس کی طرف سے انھوں نے مسلم تہذیب و ثقافت پر مختلف کتابیں شائع کیں اس ادارے کی طرف سے مولوی حفیظ اللہ مرحوم کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئیں۔

۱۔ اسلام اور غلامی۔ مولوی حفیظ اللہ مرحوم کی یہ سب سے پہلی تالیف ہے۔ اس کتاب میں غلامی کے مسئلہ پر مخالفین اسلام کے اعتراضات کے دندان شکن اور مسکت جواب دیئے گئے ہیں۔ مولوی صاحب نے اس کتاب میں مسلم معاشرہ کی بعض ان خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے جن سے مسلمانوں میں عدم مساوات کے رجحان کو تقویت ملتی ہے۔ اس سے بعض حلقوں میں تہلکا مچ گیا مگر شاہ بدرالدین پھلواروی مرحوم نے نہ صرف اس کتاب کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا بلکہ تنقید و تعریض کے جواب لکھے اور مدافعت کی۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ملا واحدی دہلوی نے اپنی کتاب "سیرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم" میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ مولوی حفیظ اللہ کی کتاب ہی سے

بحوالہ نقل کر دیا ہے۔ اس کتاب کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ مولوی صاحب نے اس کتاب پر نظرِ ثانی کی اور اس کے مختلف حصص مضامین کی صورت میں مختلف رسالوں میں شائع کرائے اس طرح نظرِ ثانی شدہ کتاب مع اضافات برائے اشاعت تیار ہے۔

۲۔ اسلامی مساوات ۔ اسلامی مساوات مولوی حفیظ اللہ صاحب کی دوسری کتاب ہے اس کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ جون ۱۹۷۱ء میں کراچی سے اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

۳۔ اسلامی کارنامے ۔ یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مسلمانوں کے علمی، ثقافتی اور تہذیبی کارنامے اس خوبی سے بیان کیے گئے ہیں کہ مسلمانوں کی گزشتہ عظمت کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ مولوی صاحب نے اس کتاب پر بھی نظرِ ثانی اور اضافہ کیا ہے۔

۴۔ اسلامی روایات ۔ اس کتاب میں تاریخ اسلام کے سبق آموز واقعات اور شاندار روایات بیان کی گئی ہیں۔ اس کتاب کا گجراتی زبان میں بھی ترجمہ ہوا ہے جو ہماری نظر سے گزرا ہے۔ اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔

۵۔ اسلام اور غیر مسلم ۔ اس کتاب میں غیر مسلم مصنفوں اور مورخوں کے حوالے سے اسلام اور شاہان اسلام کی بے تعصبی ثابت کی گئی ہے۔ مولوی صاحب نے اس کتاب کو نظرِ ثانی اور اضافات کے ساتھ مرتب کیا اور اس کا نام "مسلمانوں کی رواداری" تجویز کیا ہے۔

۶۔ اسلامی حکایات ۔ اس کتاب میں سبق آموز اور نصیحت آمیز منظوم اخلاقی حکایات جمع کی گئی ہیں۔

۷۔ سلاطینِ ہند کی علم پروری ۔ برصغیر پاک و ہند میں مسلم سلاطین کے عہد میں جو تعلیمی اور علمی ترقیاں ہوئیں اُن کا یہ دلچسپ اور مستند ریکارڈ ہے۔ کتاب ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اس موضوع پر مولوی صاحب نے مزید تحقیق اور نظرِ ثانی کی اب یہ مفصل مستند جامع اور مکمل کتاب ہو گئی ہے۔

۸۔ **مسلمانوں کی ایجادیں۔** مسلمانوں نے مختلف عہد میں جو ایجادیں کیں ان کا تاریخی بیان ہے اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۶۳ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ مولوی صاحب نے اب اس میں خاصا اضافہ کیا اور اس کا نام "مسلمانوں کی ایجادات واختراعات" تجویز کیا ہے۔ مولوی حفیظ اللہ صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں مسودات کی شکل موجود ہیں۔

۹۔ **مسلمانوں کے آلاتِ حرب۔** اس موضوع پر مولوی صاحب کا ایک طویل تحقیقی مقالہ ماہِ نو "(کراچی) میں شائع ہوا۔ علمی حلقوں میں یہ مضمون بہت پسند کیا گیا۔ ڈپٹی ڈائریکٹر جناب انجد علی صاحب نے فرمائش کی کہ اس موضوع پر مزید تحقیقات ہونی چاہیے اور ایک کتاب لکھی جائے۔ مولوی صاحب نے نہایت تحقیق وتلاش سے اس موضوع پر ایک کتاب لکھ دی۔ افسوس کہ اس دوران میں ماہِ نو کا دفتر اسلام آباد منتقل ہوگیا اور یہ کتاب اشاعت پذیر نہ ہوسکی۔

۱۰۔ **مسلم جغرافیہ داں۔** مسلمانوں کی جغرافیہ نگاری پر ایک اہم کتاب ہے۔

۱۱۔ **مسلم مورخین۔** اس کتاب میں مسلم مورخین کے حالات یکجا کیے گئے ہیں۔

۱۲۔ **دنیائے اسلام کے قدیم مدارس اور کتب خانے۔** ماہنامہ بینات (کراچی) میں دنیائے اسلام کے قدیم مدارس پر چار قسطوں میں ایک طویل مضمون شائع ہوا ہے اور اب اس پرچے میں دنیائے اسلام کے کتب خانوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اس طرح یہ کتاب مکمل ہوجاتی ہے۔

۱۳۔ **اسلامی فتوحات۔** ایک کتاب اسلامی فتوحات کے نام سے تیار کی۔

مولوی حفیظ اللہ مرحوم صاحب کا سب سے پہلا مضمون ۱۹۱۵ء میں مولانا راشد الخیری کے رسالہ "عصمت" میں شائع ہوا۔

مولوی حفیظ اللہ مرحوم کو تصنیف وتالیف کے ساتھ سیاست سے بھی خاصی دلچسپی اور تعلق رہا۔ مگر سرکاری ملازمت کی پابندیوں کی وجہ سے وہ بلا واسطہ تو اس میں حصہ نہ لے سکے مگر انھوں نے بالواسطہ ضرور تعلق رکھا۔ سب سے پہلے انھوں نے پھلواری سے ایک پندرہ روزہ اخبار "مساوات" جاری کیا جو بعد کو ماہانہ ہوگیا اور بعد ازاں اس نے

ہفتہ وار کی شکل اختیار کی۔ اس رسالہ کے ذریعہ مولوی حفیظ اللہ نے ایک مستحکم مسلم معاشرہ کے قیام کی جدوجہد کی اور مسلمانوں کو ایک بنیان مرصوص کی دعوت دی۔ نسلی، نسبی، علاقائی، جغرافیائی، لسانی، سماجی اور معاشرتی اختلافات و امتیازات کو نظر انداز کر کے اخوت و مساوات کی اہمیت ذہن نشین کرائی اور بتایا کہ اسلام کا معیار شرافت " ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم " ہے۔ دس بارہ سال یہ پرچہ نہایت کامیابی سے چلتا رہا۔ اس پرچہ کے متعلق مولانا حسن امام وارثی مالک و مدیر " ندیم " پٹنہ لکھتے ہیں۔

" اخوت و مساوات کا حامی، نسلی امتیازات کا مخالف، علمی، اخلاقی، معاشرتی مضامین کا مجموعہ، صنعتی و اقتصادی معلومات کا مرقع، سوشل رفارم کا معین و مددگار، تجارت کا شفیق، تنظیم کا حامی اور عام تعلیم کا خواہاں ہے۔"

(ندیم بہار نمبر ۱۹۳۳ء)

اس رسالہ نے مسلم لیگ کی ڈٹ کر تائید کی اور اس کے تین خاص نمبر نکلے بہار کے ممتاز اہل قلم کا اس کو تعاون حاصل رہا۔ بحیثیت اڈیٹر ڈاکٹر محمد اظہر صاحب کا نام شائع ہوتا تھا۔

مولوی حفیظ اللہ روزنامہ " ساتھی " پٹنہ کے منیجر بھی رہے پھر ان کی نگرانی میں مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر ایک ہفتہ وار اخبار " الکلام " جاری ہوا جس کے ایڈیٹر شاہد رام نگری تھے۔ پٹنہ سے ایک اور اخبار " صداقت " ہفتہ میں دو مرتبہ نکلتا تھا۔ مولوی حفیظ اللہ اس کے بھی منیجر رہے۔ پھلواری سے ایک طبی رسالہ " مسیحا " حکیم عبدالمنان کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کے مہتمم اعلیٰ مولوی حفیظ اللہ رہے۔

کراچی میں آنے کے بعد انگریزی روزنامہ یونٹی " .... " (چاٹگام) بنگلہ روزنامہ " انصاف " (چاٹگام) اور اردو ہفتہ وار " پیام مشرق " (چاٹگام) کے کراچی میں نمائندے رہے۔

مولوی حفیظ اللہ مرنجاں مرنج، باوقار، ملنسار اور وضعدار و سنجیدہ بزرگ تھے۔ اہل محلہ، احباب، اعزہ اور رشتہ داروں میں محبت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے

تھے۔ صبح وشام باقاعدگی سے چہل قدمی کرتے تھے۔ صحت اچھی تھی۔ دو ہفتے بیمار رہے۔ ایک ہفتے مکان پر رہے اور ایک ہفتے کراچی کے ہسپتال انکلسریا میں علاج ہوا۔ ۲ جنوری ۷۴ء بروز چہار شنبہ ہسپتال میں ملاقات ہوئی۔ وہی گفتگو اور اہل علم کے تذکرے رسالہ کا اجراء اور کتابوں کی اشاعت پر اظہار خیال کرتے رہے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ کمزوری بڑھ رہی ہے۔ ۴ جنوری ۱۹۷۴ء (۹ ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ) بوقت ۹ بجے صبح مولوی حفیظ اللہ اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

قطعہ تاریخ انتقال

ازخاکسار محمد ایوب قادری

مرے مخلص حفیظ اللہ جنت کے ہوئے راہی
ہے تصنیفات و تالیفات سے ظاہر کمال ان کا

نمونہ تھے سلف کا وہ متانت اور شرافت میں
تھا اخلاق کریمہ سے نمایاں حال و قال ان کا

افق پر تیرگی تھی، دل ہجوم غم سے بیٹھا تھا
الم انگیز کچھ ایسا تھا وقت ارتحال ان کا

ارادہ قادری نے جب کیا تاریخ لکھنے کا
کہا ہاتف نے ہے "شیخ حفیظ اللہ" سال ان کا

۱۳۹۳ھ

○

شعرائے بریلی

بدایوں میں مسلم اقتدار قائم ہونے کے بعد بہت سے مسلمان خاندان آکر آباد ہوئے۔ خاندانی روایات کے مطابق مشہور عثمانی خاندان کے مورث شیخ دانیال "عہد شمسی" میں وارد بدایوں ہوئے ان کی اولاد واحفاد خوب پھلی پھولی۔ ملا عبدالقادر بدایونی سے منسوب قصیدے میں ایک شعر ہے:

شیخ عثمانی کہ بُد در پارسائی بے عدیل ۔۔۔ نازل در بہرہ منونہ اصل دیبین را اسلام

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ بدایوں کے عثمانی خاندان کے بزرگ دیوبند سے منونہ آئے اور وہاں سے بدایوں پہنچے۔ منونہ کی بستی آج بھی آنولہ سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ خاندانی تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس خاندان میں اصحاب علم وفضل پیدا ہوتے رہے ہیں۔

حافظ الملک حافظ رحمت خاں نے بدایوں کے عثمانی خاندان کے ایک نامور رکن مفتی درویش محمد عثمانی (ف ۱۱۸۳ھ) کو بریلی کا مفتی مقرر کیا۔ مفتی صاحب کے انتقال کے بعد مفتی صاحب کی اولاد نے بریلی ہی کو اپنا وطن بنالیا۔ یہ خاندان بریلی میں خوب پھولا پھلا اور اس نے علم وفضل اور دولت وامارت ہر اعتبار سے شہرت حاصل کی۔

مفتی محمد عوض، مفتی ابوالحسن، مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور، قاضی عبدالجلیل جنون اور مولوی سلطان حسن خاں اپنے دور کے وہ نامور اکابر ہیں جن کا ذکر علم وادب کے نوشتوں اور کتابوں میں ملتا ہے۔

مفتی محمد عوض نے ۱۸۱۶ء میں سب سے پہلے انگریزی استعمار سے ٹکر لی۔ مفتی ابوالحسن مشہور شیخ طریقت حضرت اچھے میاں مارہرویؒ کے خلیفہ اور نامور عالم تھے مولوی محمد حسن صدر الصدور عالم وشاعر کی حیثیت سے متعارف تھے۔ سرور تخلص تھا۔ ان کا دیوان

طبع ہو چکا ہے۔ مرزا غالب سے ان کی رسم و راہ تھی۔ مرزا نے اپنے خطوط میں ان کا ذکر کیا ہے بلکہ ایک موقع پر انہوں نے مرزا غالب کی میزبانی بھی کی ہے۔ قاضی عبدالجمیل جنون تو مرزا غالب کے مشہور شاگرد ہیں جن کے نام مرزا غالب کے اکثر خطوط ہیں۔ ان خطوط میں مرزا نے بریلی کے آموں کی تعریف کی ہے اور بریلی آنے کی خواہش بھی ظاہر کی ہے۔ قاضی عبدالجمیل جنون کے صاحبزادے قاضی محمد خلیل جبرانؔ مرحوم تھے۔

مولوی سلطان حسن خاں صدر الصدر مشہور عالم اور مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد تھے۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کا ایک مطبوعہ عربی رسالہ ہمارے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ مفتی سلطان حسن خاں کے فرزند حکیم عماد الحسن محوؔ تھے۔ جنہوں نے علوم مروجہ کی تحصیل کے ساتھ ساتھ علم طب بھی باقاعدہ حاصل کیا تھا۔ شعر و شاعری میں وہ مرزا غالب کے تلمیذ مولوی غلام بسم اللہ بسملؔ بریلوی کے شاگرد تھے۔ حضرت محوؔ نے شعر و ادب کی بہت خدمت کی اور تمام عمر شاگردوں کی اصلاح و تربیت میں گزار دی۔ ۱۴ ستمبر ۱۹۲۶ء کو حضرت محوؔ کا انتقال ہوا۔

مجتہد الدین عیشؔ بدایونی نے قطعہ تاریخ کہا ہے:

مبارک تھا سفر اے مفتیِ عالی گہر تیرا	جو حج سے واپس آیا ہے جناں میں جا کے ٹھہرا ہے
کہا رضواں نے حوروں سے چلو اٹھو زیارت کو	لبِ کوثر مدینہ کا مسافر آ کے ٹھہرا ہے

حضرت محوؔ نے شعر و ادب کی ترقی اور اصلاح تلامذہ کی غرض سے ۱۹۱۲ء میں بزم ادب بریلی کی بنا ڈالی جس کے زیر انتظام ماہانہ مشاعرے مسلسل ان کی زندگی میں بارہ سال تک ہوتے رہے۔

۸ جنوری ۱۹۲۷ء کو بزم ادب بریلی نے حضرت محوؔ کے لائق فرزند صابر حسن شیواؔ کو ان کا جانشین منتخب کیا اور بزم ادب کی سربراہی سپرد کی۔ حضرت شیواؔ نے صحیح طور سے اپنے باپ کی جانشینی کا حق ادا کیا۔

حضرت شیواؔ ۱۹۰۵ء میں محلہ ذخیرہ (بریلی) میں پیدا ہوئے۔ حسب رواج اردو فارسی کی تحصیل کی۔ بعد ازاں عربی کی طرف رجوع کیا۔ کچھ دنوں مدرسہ مصباح العلوم (بریلی) میں

استفادہ کیا۔ اعلیٰ قابلیت اور منشی کامل کے امتحانات پاس کئے۔ پرائیویٹ طور سے ۱۹۳۵ء میں الٰہ آباد بورڈ سے میٹرک پاس کیا۔ اور بریلی کے ایک ہائی اسکول میں تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ نامور باپ کے جانشین کی حیثیت سے بزم ادب کی سرپرستی اور تلامذہ کی تربیت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ان کی جانشینی کے موقع پر تلامذہ محوؔ اور دوسرے اساتذہ فن نے ان کے انتخاب کو پسند کیا۔ بزرگ اُستاد مولوی قاسم علی خواہاں بریلوی کا ارشاد ہے۔

چھوڑی اولاد نیک خو، ہشیار — لائق و فائق و خجستہ شعار

جملہ ہیں قابل و خجستہ خصال — ایک شیواؔ ہے ان میں اہلِ کمال

حافظ خلیل الدین احمد حافظؔ پیلی بھیتی فرماتے ہیں:

ہے آج بریلی میں فصیح و بلیغ — وہ حضرت محوؔ کا خلف شیواؔ ہے

ایک خط میں قاضی محمد خلیل حیرانؔ شیواؔ بریلوی کو لکھتے ہیں[1]

"میں نے چودہ پندرہ سال سے شعر کہنا بالکل چھوڑ دیا ہے اور تم ماشاءاللہ مشاق ہو۔ میں تمہارے کلام پر کیا اصلاح دوں گا۔ بخدا سخت جدوجہد سے اگر لکھنا بھی چاہوں تو ایسا نہیں لکھ سکتا۔ البتہ دیکھ کر لطف اُٹھایا اور بہت پسند آیا۔"

حضرت شیواؔ بریلوی بیس برس تک درس و تدریس مشق سخن اور تربیت تلامذہ سے متعلق رہے۔ بریلی کے جمے ہوئے معاشرے میں زندگی ایک ڈگر پر گزر رہی تھی کہ پاکستان کا قیام عمل میں آگیا۔ اور ۲۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو شیواؔ صاحب بریلی سے لاہور آگئے۔ دو سال لاہور میں قیام رہا، وہاں پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ سے وابستہ ہو گئے۔ اور "استقلال" پرچہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں جو اس محکمہ سے نکلتا تھا۔ جب پرچہ بند ہو گیا تو شیواؔ صاحب تخفیف میں آگئے اور کراچی چلے آئے۔ کچھ دنوں اُردو بورڈ سے وابستہ رہے۔ شیواؔ صاحب

---

[1] مکتوب قاضی محمد خلیل حیرانؔ بنام شیواؔ بریلوی مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۲۷ء

کے متعلق ڈاکٹر لطیف حسین ادیب لکھتے ہیں :

"آپ اس وقت اس خاندان شاعری کی آبرو ہیں۔ فاضل مشرقیات ہیں۔ پندرہ سال بریلی کے ایک ہائی اسکول میں فارسی و اُردو کے مدرس رہے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ وہاں اُردو لغت کی تدوین کے سلسلے میں ترقی اُردو بورڈ کے رکن ہیں۔ فنِ شاعری میں اپنے والد سے فیض یاب ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر میں پہلا شعر موزوں کیا۔ چودہ سال کی عمر میں فارغ الاصلاح ہوئے۔ سولہ سال کی عمر میں دوسروں کی غزلوں پر اصلاح دینے لگے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں والدِ بزرگوار کے انتقال کے بعد ان کے جانشین مقرر ہوئے۔ ہر صنفِ سخن پر قادر ہیں۔"

اپنی شاعری کے متعلق خود شیوا بریلوی لکھتے ہیں :

"جس کی پشت در پشت شاعرانہ ذوق منتقل ہوتا رہا اور جس نے صحیح شاعرانہ ماحول میں آنکھ کھولی ہو اور آغوشِ شعر و ادب میں نشو و نما پائی ہو اس میں اگر ذوقِ سلیم کی صلاحیتیں، استعداد اور موزونیت کو اجاگر کر دیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ مجھے خلوصِ دل سے اعتراف ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، حکیم مومن خاں مومن، رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی کے مطالعہ کلام سے اکتسابِ فیض کیا ہے اور میں ان حضرات کو اپنا اُستادِ معنوی تصور کرتا ہوں۔ ان کے علاوہ دوسرے اساتذہ متقدمین کے کلام سے بھی کچھ نہ کچھ ضرور مستفید ہوا۔"

شیوا مرحوم مشرقی تہذیب کے نمائندہ تھے اور خودداری، متانت،

سنجیدگی کی مکمل تصویر، وضعداری و شرافت کا پیکر، کراچی کی ہنگامی زندگی میں جب کبھی ملاقات ہو جاتی تو نہایت محبت و خلوص سے ملتے۔ افسوس یہ شرافت و محبت کا پیکر اور شعر و سخن کا استاد ۶، نومبر ۱۹۸۵ء بروز جمعرات راہی ملک جناں ہوا۔

إنا للہ و إنا إلیہ راجعون۔

شیوا مرحوم نے یوں تو ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا خاص میدان نعت و منقبت تھا۔ بریلی بدایوں کے مذہبی ماحول اور ان کی خاندانی روایات نے نعت گوئی کو اور جلا بخشی۔ نعت گوئی میں حفظِ مراتب کا خاص خیال اور افراط و تفریط سے دامن بچانا پڑتا ہے۔ شیوا اس امتحان میں پورے اترتے ہیں۔ ان کا مختصر سا کلام ہم دست ہوا ہے۔ اس میں سے کچھ اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں۔

مدینہ منورہ کی تعریف میں فرماتے ہیں:

فردوس نظر ڈھونڈنے والے ادھر آئیں	دیکھیں مری آنکھوں سے مدینے کی فضائیں
جبینِ عقیدت ہو اس آستاں پر	اجل آئے تو اس قرینے سے آئے
خیابانِ مدینہ کا ہر اک منظر نرالا ہے	نہ داماں خار سے الجھیں نہ الجھیں خار داماں سے
ذرا اے اجل! مجھ کو سننے کی مہلت	کوئی کہہ رہا ہے مدینے کی باتیں
نگاہوں سے کہہ دو کہ آداب سیکھیں	دیارِ مقدس قریب آ رہا ہے

حبِ رسولؐ اور عظمتِ رسولؐ کا اظہار اس طرح کیا ہے:

زمانے کے ہر غم سے ہے بے تعلق	جو اُن کی محبت میں کھویا ہوا ہے
وہ حقدار ہے جاوداں زندگی کا	جو اُس نام کی عظمتوں پر مٹا ہے

نعت گوئی اُن کا مقصدِ حیات ہے:

ہو عمر بسر یارب مدحِ شہِ والا میں	ساماں مری بخشش کا یہ نغمہ سرائی ہے
مرتب کر رہا ہوں نعت کا گلدستۂ رنگیں	چنے ہیں پھول کچھ میں نے عقیدت کے گلستاں سے

آنچہ ہمہ خوباں دارند تو تنہا داری کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

سرِ زمیں ان کی عظمتیں ہیں سرِ فلک احترام ان کا	شعورِ رفعت کی [illegible] سے بلند تر مقام ان کا

جمالِ مصطفےٰ حسنِ دو عالم — جمالِ مصطفےٰ کا پوچھنا کیا
خلاصہ ہے یہ اوجِ رفعت کا تیرے — کہ ہے عرش زیرِ قدم اللہ اللہ
کوئی شاہکار قدرت جسے یہ شرف ملا ہے — نہ کبھی ترے سوا تھا نہ کبھی ترے سوا ہے

ایک نعت ملاحظہ ہو جس میں سہلِ ممتنع کا رنگ ہے:

اے فخرِ آدم و عالم — صلی اللہ علیہ وسلم
اپنوں کے دلدار محمدؐ — دشمن کے غمخوار محمدؐ
آئے ڈوبتی ناؤ ترانے — بھٹکے ہوؤں کو راہ بتانے
کمزوروں دکھیوں کے سہارے — بیکس مجبوروں کے پیارے
غیروں کی سدھ لینے والے — دشمن کے سکھ دینے والے
فقر و غنا کی دولت والے — شفقت والے رحمت والے
قدرت کا انعام محمدؐ — کیسا پیارا نام محمدؐ

کیوں نہ ہو شیوا ورد یہ ہر دم
صلی اللہ علیہ وسلم

یہ نہیں کہ لطف ان کا مرے حال پر نہیں ہے — مگر اس ادا کے قرباں کہ مجھے خبر نہیں ہے
مرے رنجِ مستقل کا ترا لطف ہے مداوا — کوئی ہم نفس نہیں ہے کوئی چارہ گر نہیں ہے
تکلم نے رحمت کے دریا بہائے — یہ اعجازِ حسن کلام اللہ اللہ
محمدؐ کا یہ احترام اللہ اللہ — خدا بھیجتا ہے سلام اللہ اللہ
خطاؤں کے بدلے دعائیں ملی ہیں — تری رحمت انتقام اللہ اللہ
ترا سبز گنبد تجلی کا مرکز — ترا روضۂ محترم اللہ اللہ

مولانا ظفر علی خاں کے انداز میں شیوا مرحوم فرماتے ہیں:

تخلیقِ کائنات کا عنواں تمہیں تو ہو — روحِ روانِ عالمِ امکاں تمہیں تو ہو
پرتو ہے جس کے فیض کا ہر نقشِ کائنات — کونین کی وہ شمعِ فروزاں تمہیں تو ہو
جس کی نگاہ لاکھ جراحت کا اک علاج — وہ دن کا چین درد کا درماں تمہیں تو ہو

ابنِ انشاء

فروری ۱۹۷۷ء کا غالباً تیسرا ہفتہ تھا، میں بندر روڈ سے گزر رہا تھا، خیال ہوا کہ بہت دنوں سے انشاء جی سے ملاقات نہیں ہوئی ہے، مل لیں۔ جب میں دفتر پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا، ان کا چہرہ تمام تر سیاہی مائل تھا، وہ کسی سے ٹیلیفون پر باتیں کر رہے تھے، معلوم ہوا کہ اگلے ہفتے لندن جا رہے ہیں۔ وہاں ان کا تقرر کسی اعلیٰ عہدے پر ہوا ہے۔ ٹیلیفون سے فارغ ہوئے تو علیک سلیک اور مزاج پرسی ہوئی۔ بیماری کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ خوب آئے میں آپ سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ لندن میں میرا تقرر اس کام کے لیے ہوا ہے کہ انڈیا آفس لائبریری سے اہم تاریخی اہمیت کی کتابوں کی مائکرو فلمیں حاصل کی جائیں اور اس کے بدلے میں پاکستان کے مخطوطات کی مائکرو فلمیں انڈیا آفس لائبریری کے لیے بنوائی جائیں۔ آپ ایسی کتابوں کی ایک فہرست بنا دیجیے۔ میں نے کہا ضرور، میں معاملہ کی نوعیت کو پوری طرح سمجھ گیا۔ اور میرا دل کچھ پریشان سا ہو گیا۔ پھر ادھر اُدھر کی بہت سی باتیں ہوتی رہیں۔

اگلے ہفتے ابن انشاء کے لندن جانے کی خبر اخباروں میں آ گئی۔ اب ان کی خیریت کی فکر رہتی، کبھی کبھی مشفق خواجہ صاحب سے خیریت معلوم ہوتی رہتی، پچھلے دنوں وقفہ وقفہ سے ان کے کالم بھی جنگ میں آنے لگے۔ قدرے اطمینان ہوا مگر اچانک ۱۹۷۸ء کے پہلے ہفتے میں ان کی علالت کی خبر شائع ہوئی اور ناظرین سے دعا کی درخواست کی گئی تھی۔ دل دھک سے ہو گیا۔ ۱۲ر جنوری ۱۹۷۸ء کی صبح کو روزنامہ جنگ (کراچی) میں

تصویر کے ساتھ خبر شائع ہوئی کہ ۱۱ جنوری ۱۹۷۸ء کو ابن انشاء کا لندن میں انتقال ہو گیا اور جمعہ کے بعد ان کی میت پہنچ رہی ہے تدفین پاپوش نگر (کراچی) کے قبرستان میں ہو گی۔ بعد نماز جمعہ ان کے مکان پر پہنچا۔ اصحاب علم و فضل کا ایک مجمع تھا، صحافی، ادیب، شاعر، اساتذہ، اعلیٰ سرکاری و نیم سرکاری عہدیدار اور ان کے قارئین و مداح سب ہی موجود تھے، مگر خاموش اور آنکھیں اشکبار، آج انشاء جی کا کوچ ہو رہا تھا۔ بہت سے دوست تو واقعی پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ مغرب کے وقت انشاء جی اپنی والدہ مرحومہ کے پہلو میں سپرد خاک کر دیئے گئے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون ۔ رہے نام اللہ کا۔

ابن انشاء کا نام مدتوں سے کانوں میں پڑا تھا۔ ان کی بعض چیزیں بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا اور اردو کالج سے تعلق کی وجہ سے ایک نوع کی مناسبت بھی پیدا ہو گئی۔ ۵۹-۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ میں ایک روز "پاک سرزمین" کے دفتر کے پاس سے گزر رہا تھا کہ ابن انشاء سے ملنے کے لیے ان کے دفتر میں چلا گیا۔ میں نے اپنا نام بتایا اور تعارف کرایا، کہنے لگے بھئی میں "العلم" وغیرہ میں آپ کے مضامین پڑھتا رہتا ہوں۔ آپ کی کتاب "فیض احمد بدایونی" بھی میں نے دیکھی ہے۔ آپ جنگ آزادی کے بزرگوں کو نئی نسل سے متعارف کرا رہے ہیں۔ یہ بڑا کام ہے۔ یہ تھی ابن انشاء سے میری پہلی ملاقات، پھر اکثر ان سے علیک سلیک اور ملاقات ہوتی رہی۔

ابن انشاء رائٹرز گلڈ کے ارباب حل و عقد میں سے تھے۔ ۱۹۶۵ء میں میں نے کراچی ریجن کی مجلس عاملہ کے انتخاب میں حصہ لیا۔ انتخاب کے دن خوب سرگرمی رہی۔ دوپہر کے بعد تک ووٹ ڈالے گئے ووٹوں کی گنتی کے ختم ہوتے ہی شاہد احمد دہلوی نے کچھ اشاروں کنایوں میں ہماری کامیابی کی نشاندہی کی۔ چند منٹ کے بعد ابن انشاء مسکراتے ہوئے آئے اور

چپکے سے میرے کان میں کہا کہ مبارک ہو۔ آپ اور نور الصباح بیگم کامیاب ہو گئیں۔

اپریل ۱۹۶۸ء کا آخری ہفتہ تھا۔ اردو کالج کے طلبہ نے ابن انشاء کے ساتھ ایک شام منانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اردو کالج کے ایک ممتاز طالب علم رہ چکے تھے اور کالج کے میگزین "برگ گل" کے ایڈیٹر بھی۔ ابن انشاء پر تعارفی مقالہ لکھنا میرے ذمہ ہوا۔ میں نے مضمون لکھا اور ابن انشاء کے ساتھ شام منائی گئی۔ اس ہفتے کے جنگ کے سنڈے ایڈیشن میں انہوں نے میری بھی کھنچائی کر دی اور وہی مضمون اس شام میں پڑھا اور کچھ کلام بھی سنایا۔

ابن انشاء کی دنیا، ادب و شاعری اور کتابوں کی دنیا تھی، عالمی مطبوعات پر ان کی نظر رہتی تھی۔ ملک کے مصنف، ادیب، شاعر ان کو کتابیں تحفتہً پیش کرتے تھے مگر اس کے باوجود وہ کتابیں خریدتے بھی تھے اور کتابوں کو پڑھتے بھی تھے۔ مجھ سے جب بھی ملاقات ہوتی۔ موضوع گفتگو کتابیں رہتا۔

مذہب کے معاملہ میں وہ نہایت راسخ العقیدہ تھے۔ مذہب کی اساسی کتابوں پر ان کی نظر تھی اور وہ ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ ان میں اکثر موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ ان کی معلومات اور فکر سے خوشی ہوتی تھی۔ نیشنل بک سنٹر کے سلسلۂ کتابیات میں "سیرت رسول" اور "تاریخ" پر فہرستیں شائع ہوئیں۔ جن پر بعض حلقوں کی طرف سے اعتراضات ہوئے۔ ابن انشاء نے ان کتابوں پر میری رائے چاہی، میں نے حقیقتِ حال اور مؤلف کے مذہبی افکار کی نشاندہی کر دی۔ اسی دوران میں اسلامیات پر کتاب شائع ہو رہی تھی، اس کے کاوڈ بن چکے تھے۔ اس کے مرتب تو عاصم صحرائی تھے مگر ان "صاحب" کا مشورہ بھی شامل رہا تھا۔ ابن انشاء نے مجھ سے کہا کہ آپ اس کتاب پر نظر ثانی کر دیں۔ میں نے نظر ثانی کے بعد صورت حال سے انہیں مطلع کر دیا کہ مرتب

"سیرت رسول" نے اپنے "فرقہ" کی تمام کتابیں اس میں شامل کر دی ہیں۔ میں اس پر نظر ثانی کر چکا ہوں اگر آپ اس فرقے کی کتابیں بھی اس میں شامل کریں تو نظر ثانی کرنے والے کی حیثیت سے میرا نام کتاب پر نہ دیجیے۔ ابن انشاء نے میری بات توجہ اور غور سے سُنی اور میں نے اندازہ کیا کہ وہ میری بات سے مطمئن ہیں اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ "چونکہ آپ اپریل ۱۹۷۴ء کے آخری ہفتے میں لاہور جا رہے ہیں، ہم اس سلسلے میں ایک میٹنگ وہیں رکھے لیتے ہیں۔ ذوالفقار تابش صاحب بھی موجود ہوں گے۔" ۴ مئی ۱۹۷۴ء کو نیشنل بک سنٹر (لاہور) کے دفتر میں میٹنگ ہوئی۔ میری رائے سے اتفاق کیا گیا۔ مئی کے دوسرے ہفتے میں اس فرقہ سے متعلق ایک ملک گیر ہنگامہ شروع ہو گیا اور پھر ایک تاریخ ساز فیصلہ ہوا۔ خود ابن انشاء کی قادیانیت پر گہری نظر تھی۔

ابن انشاء ایک روز میرے گھر تشریف لائے۔ بعض کتابیں اور رسالے دیکھے۔ میرے مضامین "مطبع صدیقی بریلی کی تاریخی مطبوعات" اور "مولوی حافظ عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی دہلی" پر اظہار پسندیدگی فرمایا۔ ہندوستان کے مسلم مطابع کی علمی و دینی خدمات پر بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ مصطفائی و علوی پریس لکھنؤ، نظامی پریس کانپور، احمدی پریس کلکتہ، صفدری و محمدی پریس بمبئی، نظامی پریس بدایوں اور دہلی و لاہور کے پریس موضوع گفتگو رہے، کہنے لگے ان مطابع پر کام ہونا چاہیے۔ میری فرمائش پر سید اشتیاق اظہر صاحب نے نظامی پریس کانپور پر ایک معلوماتی مقالہ لکھا جو ماہنامہ "البلاغ" کراچی میں شائع ہوا۔ کراچی یونیورسٹی کے ایم۔ ایل۔ ایس کے ایک طالب علم نے میری نگرانی میں "نظامی پریس بدایوں" پر ایک مضمون لکھا۔ ابن انشاء یہ دونوں مقالے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

ابن انشاء کا نام شیر محمد خاں ولد چودھری منشی خاں ہے وہ کھوکھر راجپوت تھے۔ اساڑھ کے مہینے کی پہلی تاریخ ہفتہ کے دن ۱۹۲۷ء کو ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں پھلور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی ۱۹۴۲ء میں لدھیانہ سے ہائی اسکول فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا، فارسی میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔ ہندی اور گورمکھی بھی پڑھی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی۔ اے اور ۱۹۵۳ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے پاس کیا۔ ایم۔ اے کے کلاس اس زمانے میں اردو کالج میں ہوتے تھے۔ اس طرح ابن انشاء اردو کالج کے بھی طالب علم رہے۔ ایم۔ اے کے بعد ابن انشاء نے "اردو نظم کا فنی اور موضوعی ارتقاء" کے عنوان پر بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی زیر نگرانی کچھ دنوں ریسرچ بھی کی۔ اس طرح بابائے اردو سے باقاعدہ شاگردی کا تعلق قائم ہوا اور ابن انشاء نے دورِ ابتلا میں حق شاگردی بھی خوب ادا کیا اور اپنی فراست کا بھی ثبوت دیا۔

ابن انشاء کی ملازمت کا آغاز امپیریل کونسل آف ایگریکلچرل ریسرچ (دہلی) سے ہوا۔ وہ اس کونسل کے رسالے (INDIAN FARMING) کے اردو اڈیشن کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے مگر جلد ہی آل انڈیا ریڈیو میں منتقل ہو گئے۔ اسی زمانے میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور ابن انشاء ۱۲ اگست ۱۹۴۷ء کو لاہور منتقل ہو گئے۔ اب وہ گویا ریڈیو پاکستان کے ملازم تھے۔ لاہور سے کراچی آ گئے اور ۱۹۵۰ء تک ریڈیو سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد دستور ساز اسمبلی میں سینئر مترجم کی حیثیت سے ۱۹۵۶ء تک کام کیا۔ پھر محکمہ اصلاح دیہات میں چلے گئے اور ۱۹۶۱ء تک "پاک سرزمین" ایڈٹ کرتے رہے۔

۱۹۶۱ء میں یونیسکو نے پاکستان میں کتابوں کی ترقی کے لیے نیشنل بک سنٹر (موجودہ نام نیشنل بک کونسل) نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ ابن انشاء اس کے سکریٹری

مقرر ہوئے اور بعد ازاں اس ادارے کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے تک ترقی کی مطالعاتی مواد کے بارے میں ابن انشاء پاکستان میں یونیسکو کے نمائندے بھی رہے اور یونیسکو کی طرف سے بطور مشیر وہ افغانستان، انڈونیشیا، فلپائن اور سیلون وغیرہ بھی گئے تھے۔ بہت سی بین الاقوامی کانفرنسوں میں انہوں نے پاکستان کی نمائندگی کی۔ بک ڈویلپمنٹ کانفرنس کے سلسلے میں جاپان اور چلڈرن لٹریچر کے سلسلے میں تہران پہنچے۔ ۱۹۶۱ء میں بلجیم میں شاعروں کے میلے میں شریک ہوئے اور اسی طرح دنیا کے بہت سے ملک دیکھے۔

شعر و شاعری کا مشغلہ دس گیارہ سال کی عمر سے شروع کر دیا تھا۔ عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی پختگی آئی۔ اپنی آغاز شاعری کے بارے میں خود لکھتے ہیں۔

”میں نے دس گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا۔ تیرہ چودہ برس کی عمر میں بے شمار غزلیں کہیں اور اسکول کی کتاب کی نظموں کے اردو ترجمے کر ڈالے۔ اب میں دیکھتا ہوں تو وہ بُرے معلوم نہیں ہوتے۔ خیر اس دور کی غزلیں نہ میرے پاس محفوظ ہیں اور نہ وہ اس لائق تھیں۔ ۱۹۴۴ء میں پہلی نظم ایک ادبی پرچے میں شائع ہوئی اور تقسیم تک کچھ نہ کچھ کہتا رہا، لیکن سچ یہ ہے کہ سنجیدگی سے اپنے آپ کو شاعر سمجھنے کا آغاز ۱۹۴۹ء سے ہوا۔ اسی سال ”بغداد کی رات“ چھپی اور لوگوں نے اسے پسند کیا۔ اب تک میری بہترین نظم یہی سمجھی جاتی ہے۔ مختلف لوگوں نے اسے مختلف زبانوں میں ترجمہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ ایک دو بار اسٹیج بھی ہوئی۔“

ابن انشاء کے نثری کام کا آغاز تراجم سے ہوا۔ ۱۹۴۶ء میں انہوں نے یوجین چرچوف

کے روسی ناول کا ترجمہ "سحر ہونے تک" کے نام سے کیا۔ اس ناول کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں "مجبور" کے نام سے شائع ہوا۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء میں امریکی مصنف ایڈگرایلن پو کے ناول کا ترجمہ "اندھا کنواں" کے نام سے کیا اور اوہنری (امریکی مصنف) کے ناول کا ترجمہ ۱۹۵۸ء میں "لاکھوں کا شہر" کیا۔ اسی طرح ۱۹۶۰ء میں جان اسٹینبیک کے ناول کا ترجمہ "شہر پناہ" کیا۔ ان میں سے بعض کتابوں کے دو دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں جن سے ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ابن انشاء کا پہلا سفر نامہ ۱۹۶۰ء میں "چلتے ہو تو چین کو چلئے" شائع ہوا یہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس میں طنز و مزاح اور انشا پردازی کا حسین امتزاج ملتا ہے۔

ابن انشاء نے مختلف اخبارات میں فکاہی کالم لکھے، شروع شروع میں بے نام یا مختلف ناموں دو درویش، دمشقی، نانا فرنویس اور حاجی بابا وغیرہ کے ناموں سے لکھتے رہے۔ پھر ابن انشاء کے نام سے لکھنے لگے۔ انہوں نے دس سال تک امروز میں مزاحیہ کالم لکھا، پھر انجام اور "حریت" کی طرف رجوع ہوئے اور جولائی ۱۹۶۶ء سے روزنامہ "جنگ" میں لکھنا شروع کیا، پھر اخبار خواتین" اور "اخبار جہاں" میں بھی ان کا کالم آنے لگا۔ ابن انشاء کی مزاحیہ نگاری مستقل مضمون کی مستحق ہے۔ اس کی وساطت سے ان کا سلسلہ میر محفوظ علی بدایونی، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک اور مجید لاہوری سے ملتا ہے۔

ان کے مزاحیہ کالم صرف ذہنی عیاشی اور پھکڑپن کا مظاہرہ نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے کالم میں مذہبی اجارہ داری، سرمایہ پرستی، جاگیردارانہ نظام، استحصال زر کی دوڑ اور طبقاتی و معاشی کشمکش پر بھرپور طنز کرتے ہیں۔ ابن انشاء کی طبیعت میں ذہانت اور طباعی تھی۔ اظہار بیان پر وہ پوری قدرت رکھتے تھے۔ ابن انشاء نے جب شاعری شروع کی تو اس کے کچھ دنوں بعد جنگِ عظیم دوم (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء) کا آغاز ہوا اور پانچ سال تک ساری دنیا اس جنگ کی لپیٹ میں رہی۔ پھر تقسیم ملک کے نتیجہ میں

فرقہ وارانہ فسادات کی ہولناکیاں اور بربادیاں سامنے آئیں گویا ابن انشاء کی شعور کی آنکھ جنگ، بربادی، ایٹم بم، دھماکوں، تباہیوں اور مصیبتوں کے زمانے میں کھلی۔
جنگ کی آواز اور بربادی کے نقشے پوری طرح ان کے کلام میں ابھرتے ہیں اور ان کی نظموں میں انسانیت کی بربادی کی کراہ اور جنگ کے عفریت کی گھن گرج صاف سنائی دیتی ہے۔

ابن انشاء کے یہاں ہندی زبان کا ایک اچھا امتزاج ملتا ہے اور سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہندی زبان و ادب سے ایک لگاؤ رہا ہے اور ہندی الفاظ و فرہنگ کے استعمال پر ان کو پوری دسترس حاصل ہے۔ بعض ہندی الفاظ تو ان کے کلام میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ایران و توران کی تشبیہات کی بجائے ہند و پاکستان کی تشبیہات و استعارات استعمال کرتے ہیں۔

ابن انشاء کا پہلا مجموعہ "چاند نگر" ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے شائع ہوتے ہی ادبی حلقوں میں ایک تموج سا پیدا ہوا اور معلوم ہوا کہ اردو شاعری کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ ان کا دوسرا مجموعہ "بستی کے ایک کوچے میں" ہے۔ انہوں نے بچوں کی نظمیں "بلو کا بستہ" کے عنوان سے لکھی ہیں، جو بچوں کے ادب میں ایک اضافہ ہیں۔ انہوں نے چینی نظموں کا اردو میں کامیاب ترجمہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں:

> "میری کوشش یہ رہی کہ ترجمے اصل کے پابند رہیں لیکن شاعری کے رنگ، و بو اور رچاؤ سے عاری نہیں ہونے چاہئیں۔ ان میں آپ کو اظہار کے پیرائے اور تکنک کی کچھ بدعتیں بھی ملیں گی۔"

ابن انشاء کو روایات اور تلمیحات کے استعمال کرنے کا بڑا سلیقہ ہے وہ ان روایات کو خوب برتتے ہیں اور ایک فضا قائم کر دیتے ہیں "بغداد کی رات"

اور "مضافات" ایسی ہی خوبصورت نظمیں ہیں جن میں ابن انشاء نے روایات اور تلمیحات سے کام لے کر جادو جگائے ہیں۔

آوارہ گرد کی ڈائری، دنیا گول ہے، ابن بطوطہ کے تعاقب میں اور اردو کی آخری کتاب ابن انشاء کے وہ ادبی صحیفے ہیں جو اردو ادب میں یادگار رہیں گے۔

ماہرالقادری

۱۱ مئی ۱۹۷۸ء کو حضرت ماہر القادری نے جدہ کی ایک مجلس مشاعرہ میں نعت پڑھی اور اعلیٰ علیین کی راہ لی۔ دوسرے روز جمعہ کو مسجد الحرام میں ان کی نماز جنازہ ہوئی اور جنت معلیٰؓ (مکہ) میں مدرسہ صولتیہ کے اکابر کے قریب دفن ہوئے۔ ان کی موت واقعی قابل رشک ہے۔ ماہر القادری ایک ممتاز شاعر صاحب طرز ادیب، معروف تنقید نگار، لغات و فرہنگ کے نکتہ رس، زبان و بیان کے پارکھ مجلہ فاران کے مدیر اور اسلامی علوم و فنون اور تاریخ و ثقافت کے دلدادہ تھے۔ ان کی تمام زندگی شعر و ادب اور کتاب و قلم سے عبارت رہی۔

ماہر القادری کا تاریخی نام منظور حسین ہے جس سے ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء برآمد ہوتے ہیں۔ والد کا نام معشوق علی ولد شیخ علی بخش ہے۔ موضع کسیر کلاں (ضلع بلند شہر، یو۔پی) میں پیدا ہوئے ایک متوسط الحال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم کا آغاز گاؤں کے مکتب سے ہوا۔ قرآن کریم اور ابتدائی اُردو کی تعلیم مکتب میں پائی۔ فارسی گلستاں تک اپنے والد سے پڑھی، ان کے والد ذی علم تھے اور شعر و شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ ظریف تخلص تھا۔ ۱۹۲۴ء میں انتقال ہوا۔ ماہر القادری کی عمر سات سال کی تھی کہ ان کی والدہ فوت ہو چکی تھیں۔

ماہر القادری نے ۱۹۲۴ء میں الہ آباد بورڈ سے میٹرک کا امتحان دیا مگر ناکام رہے۔

۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک میں کامیابی حاصل کی، پھر باقاعدہ مطالعہ کیا۔ زبان و بیان اور ادب کی باریکیوں کو سمجھا۔ علم سے طبعی مناسبت تھی ابتدائی عربی کی تحصیل مولانا سید سعید اشرف سے کراچی میں کی۔ مولانا ظفر احمد انصاری ان کے ہم سبق ہوتے۔ اس زمانہ میں ماہر القادری، ظفر احمد انصاری صاحب کے قریب ہی رہتے تھے۔ ماہر القادری کو ریاضی سے مناسبت نہ تھی۔ اسی طرح عروض سے بھی ان کی طبیعت اکتاتی تھی۔ بارہا انھوں نے اس کا

اظہار کیا۔

ماہر صاحب کا گاؤں کسیر کلاں، ضلع بلند شہر میں واقع تھا، مگر ضلع بدایوں کی سرحد تھی، اس بستی پر بدایوں کے علماء و ادباء کے مذہبی اور تہذیبی اثرات تھے، کسیر کلاں (باغ قادری) کے مسلمان، بدایوں کے مشہور خانوادۂ قادری سے وابستہ تھے، ماہر صاحب بھی اس خاندان کے مشہور عالم و بزرگ مولانا عبدالقدیر بدایونی سے بیعت تھے، مولانا بدایونی نے ماہر القادری کی تعلیم و تربیت میں خاصا حصہ لیا۔ وہ بدایوں میں مقیم رہے، بلکہ شعور و آگہی کی آنکھ انھوں نے بدایوں میں کھولی اور شعر و ادب کا ذوق یہیں پروان چڑھا۔ اس زمانے میں بدایوں، میں نامور اساتذہ فن، شعر و سخن کی مجلسیں جمائے ہوئے تھے۔ مفتی اکرام احمد لطف اور مولانا ضیاء القادری ایسے نعت گو شعراء درگاہ قادریہ کے خاص ارکانِ شعر و ادب میں تھے۔

حضرت مولانا عبدالقدیر بدایونی کے ہمراہ ماہر القادری حیدرآباد دکن گئے۔ مختلف دفاتر میں ملازم رہے۔ شعر و سخن کے ذریعے علمی و ادبی حلقوں میں رسائی ہوئی، مہاراجہ سرکشن پرشاد نے خاصی سرپرستی فرمائی، مجلس اتحاد المسلمین کے ہر جلسے میں بہادر یار جنگ کی تقریر کے ساتھ ماہر القادری کی نظم یا نعت لازمی تھی۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں بھی یہی صورت ہوتی تھی۔ نواب بہادر یار جنگ نے ایک موقع پر قائداعظم سے کہا تھا کہ اس علاقے میں مسلم لیگ کی مقبولیت میں ماہر القادری کی نظم خوانی نے خاص کردار ادا کیا ہے۔

۱۹۳۳ء میں مولانا عبدالقدیر بدایونی کی معیت میں بغداد شریف گئے۔ دوسرے تاریخی بلاد و قصبات کی بھی سیر کی، آثار قدیمہ دیکھے، بعض ممتاز شخصیتوں، امراء اور ارکان دولت سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔ اسی سال ماہر صاحب کا تعلق مشہور اخبار "مدینہ" بجنور سے ہوا۔ اس زمانے میں "مدینہ" سہ روزہ کے بجائے روزنامہ ہو گیا تھا۔ اسی ادارہ کے بچوں کے رسالہ "غنچہ" کے ماہر صاحب مدیر تھے۔ مگر یہ تعلق جلد ہی ختم ہو گیا۔

ماہر صاحب کچھ دنوں بمبئی میں فلمی صنعت سے بھی وابستہ رہے، ڈرامے، گیت مکالمے اور کہانیاں لکھیں مگر جلد ہی اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا۔ ۱۹۴۵ء میں ماہر القادری دہلی آگئے اور ۱۹۴۷ء تک دہلی میں قیام رہا۔ سبزی منڈی کے قریب انھوں نے ایک

شاندار مکان بنا لیا تھا۔

حیدرآباد دکن میں ماہر القادری کا چودہ پندرہ سال قیام رہا۔ یہ ان کی زندگی کا بہترین زمانہ تھا۔ وہ وہاں کی مجلسوں اور اکابر و مشاہیر کا والہانہ انداز میں ذکر کرتے تھے، نوجوانی کا عالم، شعروسخن کا ذوق، شعراء کی مجلسیں، رؤسا و امراء کی محافل شب غرض ان ہنگاموں سے زندگی عبارت تھی، کہیں کہیں ڈاکٹر شرف الحق کے مجموعہ کلام میں بھی اس دور کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

۱۳ستمبر ۱۹۴۷ء کو وہ اپنے گاؤں میں تھے کہ قرب و جوار کے کئی ہزار ہندوؤں نے ایک منظم منصوبے کے تحت ان کے گاؤں پر حملہ کر دیا۔ وہاں کے مسلمانوں نے پامردی سے مقابلہ کیا۔ چار پانچ مسلمان شہید ہوئے۔ ہندو بڑی تعداد میں کھیت رہے۔ اس موقع پر ماہر القادری نے بھی عملی طور پر جرأت کا ثبوت دیا۔

اس ہنگامے کے بعد ماہر صاحب اسپیشل ٹرین سے پاکستان کے لئے روانہ ہوئے ۱۶ر نومبر ۱۹۴۷ء کو کراچی پہنچے چند مہینے ملتان رہے مگر انھوں نے مستقر کراچی ہی کو بنایا۔ اپریل ۱۹۴۹ء سے ماہر القادری نے ایک ماہنامہ "فاران" جاری کیا جس کا دینی و علمی حلقوں میں خاص مقام ہے۔

ماہر القادری نے ۱۹۵۴ء میں فریضۂ حج ادا کیا اور اس مقدس سفر کی روداد "کاروانِ حجاز" کے نام سے شائع کی ان کا یہ سفر دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔ ۱۹۶۹ء میں وہ بعض علمی و ادبی انجمنوں کی دعوت پر جنوبی افریقہ گئے اور شعروسخن کی مجلسوں میں شرکت کی، مذہبی اجتماعات کو خطاب کیا۔ اور اس علاقے میں اُردو کی جوت جگائی، افریقہ سے یورپ گئے اور کئی ملک دیکھے۔ ان کا یہ سفر نامہ پانچ چھ قسطوں میں فاران میں شائع ہوا ہے ابھی پچھلے دنوں ۱۹۷۷ء میں بھی لندن کے ایک مشاعرے میں گئے تھے، اور بی بی سی کے اردو پروگرام میں بھی شرکت کی۔ جنگ اور العلم میں اس سفر سے متعلق تاثرات بھی شائع ہوئے تھے۔

ماہر القادری ایک خوش فکر شاعر تھے۔ نعت گوئی ان کا خاص میدان تھا، غزلیں اور نظمیں بھی انھوں نے خوب کہی ہیں۔ ان کا مندرجہ ذیل سلام مقبول انام ہے۔

سلام اس پر کہ جس نے بیکسوں کی دستگیری کی
سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

ان کی نظمیں ظہور قدسی، قرآن کی فریاد اور جمنا کا کنارا وغیرہ نہایت مقبول ہوئی ہیں، نظم و نثر کی بیس پچیس کتابیں ماہر القادری سے یادگار ہیں۔ ان کے شعری مجموعوں میں جذبات ماہر، نغمات ماہر، محسوسات ماہر، فردوس، ذکر جمیل اور ظہور قدسی مشہور ہیں انھوں نے ناول اور افسانے بھی لکھے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "میخانے" جلد بندی کی حالت میں دہلی کے فسادات میں ضائع ہوگیا، ان کی کتاب "دُرِ یتیم" بھی خاصی مقبول ہوئی، ماہر القادری کا رسالہ "فاران" ایک وقیع ماہنامہ ہے۔ وہ اس میں ٹھوس علمی، ادبی، سیاسی اور مذہبی مسائل پر اظہار خیال کرتے تھے اور خوب کرتے تھے۔ ان کے رسالے کا ایک خاص عنوان "وفیات" ہوتا تھا جس میں وہ مرنے والے کی زندگی پر اپنے ذاتی تعلقات کی روشنی میں لکھتے تھے ـــــــ وہ بعض اوقات جزئیات کا احاطہ کرتے تھے۔ خاکہ نویسی میں ان کو خاص ملکہ حاصل تھا۔ تبصرہ نگاری میں ماہر صاحب نہایت محنت کرتے تھے۔ نہ صرف کتاب کو اوّل سے آخر تک پڑھتے تھے بلکہ بعض اوقات اس موضوع سے متعلق بھی کتاب پڑھتے تھے، احباب سے معلومات بہم پہنچاتے تھے، وہ کتاب کی خوبیوں کے ساتھ اس کے کمزور پہلو کی نشاندہی ضرور کرتے تھے، زبان و بیان پر خاص توجہ دیتے تھے اور اس باب میں وہ کسی رواداری کے قائل نہ تھے، یہاں تک کہ وہ مولانا مودودی تک کو نہیں بخشتے تھے، لغات و فرہنگ سے ان کو خاص شغف تھا اور وہ اس سلسلے میں خاص توجہ دیتے تھے۔

ماہر القادری، مشرقی تہذیب کے دلدادہ اور مذہبی ذہن و فکر کے آدمی تھے، جماعت اسلامی سے بہت قریب سلفی عقائد سے ہم آہنگ محبت اہل بیت سے سرشار، ترقی پسند تحریک کے سخت مخالف، پاکستان میں اسلامی ادب کی تحریک کے بانی۔ ع حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

مولانا شائق احمد عثمانی

غالباً ۱۹۲۶ء کی بات ہے کہ میرے مولد قصبہ آنولہ ضلع بریلی میں چند تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ایک لائبریری اور دارالمطالعہ قائم کیا جس میں مسلم اخبارات وحدت، الامان (دہلی) خلافت (بمبئی) زمیندار (لاہور) اور عصرِ جدید (کلکتہ) وغیرہ آتے تھے، عصرِ جدید (کلکتہ) ہی کے ذریعہ سے میں اس اخبار کے فاضل ایڈیٹر مولانا شائق احمد عثمانی سے متعارف ہوا۔

قیامِ پاکستان کے بعد مولانا شائق احمد عثمانی کلکتہ سے ہجرت کر کے کراچی پہنچ گئے کچھ مدت کے بعد کراچی کے مشہور روزنامہ "انجام" کے جمعہ ایڈیشن میں مولانا عثمانی کے مقالات "درس قرآن" کے عنوان سے شائع ہونے شروع ہوئے جن میں علوم و معارف قرآنی کو عام فہم انداز میں پیش کیا جاتا تھا تاکہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو معارفِ قرآنی سے کچھ مناسبت پیدا ہو جائے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں مولوی شیخ محمد سلیمان بدایونی کے ذریعہ مولانا شائق احمد عثمانی سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ مولانا عثمانی ایک بالغ نظر عالم، علوم و معارف قرآنی کے مفسر، پُرجوش خطیب، کامیاب صحافی اور گوناگوں خصوصیات کے مالک ہیں۔

مولانا شائق احمد عثمانی (بن رافق علی بن کاظم علی) کے بزرگوں کا قدیم وطن بھاگلپور تھا۔ مولانا کے خاندان کے اکثر ارکان زیورِ علم و فضل سے آراستہ تھے۔ اسی علم و فضل کے انتساب کی وجہ سے اس محلہ کا نام "مشائخ چک" ہو گیا۔

مولانا شائق احمد عثمانی ۲۵ ربیع الثانی ۱۳۱۱ھ بروز پنجشنبہ بوقت ڈھائی بجے دن قصبہ پورینی (ضلع بھاگلپور) میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر ابھی ڈیڑھ سال ہی کی تھی کہ ۱۳۱۳ھ میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا آغاز حسب رواج پورینی

کے مکتب سے ہوا۔ کچھ دنوں پرائمری اسکول میں پڑھا پھر مونگیر کی انجمن حمایت الاسلام کے مدرسہ میں داخل ہوئے مگر مونگیر سے جلد ہی پورینی واپس آگئے اور وہیں مولوی حکیم ابوالخیر محمد سعید مرحوم سے فارسی کی تعلیم شروع کر دی مگر عمدہ تعلیم کے لئے جس نگرانی انتظام اور سرپرستی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ اس سے مولانا عثمانی محروم تھے۔ اتفاق کی بات کہ اسی زمانہ میں مولانا محمد سہول اور مولوی فقیر حسن کی متحدہ کوششوں سے پورینی میں ایک اسلامی درس گاہ "مدرسہ نعمانیہ" کے نام سے قائم ہوئی جس کے صدر مدرس دیوبند کے مشہور فاضل مولانا محمد اعزاز علی مقرر ہوئے۔ مولانا محمد سہول مرحوم کی تحریک پر مولانا عثمانی مدرسہ نعمانیہ میں داخل ہو گئے۔ تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ شروع ہوا۔

مدرسہ نعمانیہ میں مولانا اعزاز علی کی خاص توجہ عثمانی صاحب پر رہی۔ ان کی ذہانت و فطانت نے خوب جوہر دکھائے۔ ایک مہینے سے کم وقت میں مولانا عثمانی نے میزان الصرف ختم کرلی، منشعب ختم ہوتے ہی مولانا عثمانی کو اس جماعت میں شامل کر دیا گیا جو پنج گنج اور زبدہ ختم کر کے علم الصیغہ شروع کر رہی تھی۔ مولانا عثمانی کے حافظہ اور ذہانت کا یہ حال تھا کہ ان کو علم الصیغہ کے باب مغتل کے تعلیلات کے تمام قواعد اور نحو میر کا بیشتر حصہ آخر عمر تک یاد رہا۔

صرف و نحو کے بعد ادب کی ابتدائی درسی کتاب نفحۃ الیمن کا آغاز ہوا۔ مولانا عثمانی نے نہایت توجہ اور محنت سے عربی ادب اور زباندانی میں دلچسپی لی۔ چار سال کے عرصہ میں فاضل اُستاد نے ذہین شاگرد کو علم حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح علم تفسیر میں تفسیر بیضاوی اصول فقہ میں نور الانوار اور منطق میں قطبی تصدیقات تک پہنچا دیا۔ مولانا عثمانی کے ذوق و ذہانت کے سلسلے میں مولانا اعزاز علی فرمایا کرتے تھے کہ

"شائق احمد کا پہلے پڑھا سبق دوسرے کے
پڑھے ہوئے سبق کی طرح ہوتا ہے۔"

پورینی کے مدرسہ نعمانیہ میں قریب چار سال تحصیل علم کے بعد مولانا محمد سہول اور مولانا اعزاز علی کے مشورہ سے مولانا عثمانی ۱۳۲۶ھ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند گئے

مولانا حبیب الرحمٰن نائب مہتمم مقاماتِ حریری کا سبق پڑھاتے تھے مولانا عثمانی نے مقاماتِ حریری کے پچیس مقامات کا بڑا حصہ زبانی یاد کر لیا جو ان کو آخر عمر تک ازبر رہا۔

ان دنوں دارالعلوم کا قدیم اندازِ تعلیم تھا کہ طلبہ جو کتاب چاہتے پڑھ سکتے تھے۔ مولانا عثمانی نے ادب میں مقاماتِ حریری تفسیر میں تفسیر جلالین، منطق میں ملا حسن (شرح سلم تصورات) اور فلسفہ میں میبذی چار کتابیں شروع کر دیں یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مولانا عثمانی نے پورینی میں قطبی تصدیقات تک پڑھی تھی اور اس کے بعد سلم العلوم پڑھے بغیر ملا حسن مولانا رسول خاں سے شروع کر دی۔ ابتداء میں مولانا عثمانی کو ملا حسن سمجھنے میں دقت پیش آئی مگر ایک خاص واقعہ نے یہ مشکل حل کر دی ہوا یہ کہ مولانا عثمانی ایک روز ملا حسن کی کسی عبارت میں اُلجھے اور اُنہوں نے اپنے کسی ہم جماعت سے اس عبارت کا مطلب سمجھنا چاہا اس نے قدرے ترش روئی کا اظہار کیا، اس واقعہ نے تازیانۂ عبرت کا کام کیا۔ مولانا عثمانی نے اس کتاب پر مسلسل محنت شروع کر دی اور ملا حسن پر ایسا عبور حاصل کر لیا کہ مولانا عثمانی سے بڑے بڑے طالب علم ملا حسن کی پیچیدہ عبارتوں کا مطلب سمجھتے تھے۔ پہلے سال کے گزرنے کے بعد مولانا عثمانی دارالعلوم کے اونچے درجے کے طلبہ میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہو گئے اور سالانہ امتحان میں امتیازی طور سے کامیاب ہوئے۔ اس سال مولانا عثمانی نے ملا حسن میر زاہد رسالہ ملا جلال، مقاماتِ حریری، متنبی، حماسہ، تفسیر جلالین، میبذی اور صدرا ختم کر ڈالیں۔

دوسرے سال مولانا عثمانی شیخ الہند مولانا محمود حسن کے یہاں حدیث کے دورہ میں شریک ہو گئے۔ یہ سال حدیث کا تھا التزام یہ رہا کہ شیخ الہند کے یہاں جامع ترمذی بھر بخاری شریف، مولانا حافظ احمد مہتمم مولانا حکیم محمد حسن اور مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری کے پاس مسلم شریف، مفتی عزیز الرحمٰن کی مسجد میں بعد نماز ظہر طحاوی شریف، بعد عصر شیخ الہند کی خدمت میں ابوداؤد اور جامع مسجد میں بعد عشا مولانا رسول خاں

کی خدمت میں سنن ابن ماجہ شروع کر دی۔ ان اسباق کے علاوہ محمد انور شاہ کشمیری کے یہاں ہدایہ آخرین اور دوسرے اساتذہ کے یہاں ہیئت میں تصریح اور شرح چغمینی اور فلسفہ میں شمس بازغہ ختم کر لیں۔ غرضیکہ شفیق اساتذہ کی توجہ اور اپنے ذوق، محنت اور حافظہ کی بنا پر ڈیڑھ سال میں درس نظامی کی بقیہ ساری کتابیں ختم کر لیں۔

دارالعلوم دیوبند کے زمانۂ طالب علمی کا ایک واقعہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہے کچھ مسلم اعلیٰ سرکاری عہدیداران دارالعلوم دیکھنے آئے۔ انہوں نے یہ اعلان کیا کہ اس سال فلسفہ اور ہیئت کی تین کتابوں شمس بازغہ، صدرا اور شرح چغمینی میں جو طالب علم اول آئیگا اُسے انعام میں ایک گھڑی دی جائے گی۔ جب یہ اعلان بورڈ پر نظر آیا تو مولانا عثمانی کو قلق ہوا کیونکہ وہ ایک سال پہلے صدرا ختم کر چکے تھے اور اب صرف دو کتابوں کا امتحان باقی تھا، جب مولانا عثمانی کا عندیہ مولانا حبیب الرحمٰن نائب مہتمم کو معلوم ہوا تو انہوں نے مہتمم صاحب اور شیخ الہند سے مشورہ کر کے مدرسہ کی طرف سے عثمانی صاحب کو مطلع کیا کہ اگر تم ان دونوں کتابوں میں اول آئے تو مدرسہ کی طرف سے تم کو ایک قیمتی گھڑی انعام میں دی جائے گی۔ چنانچہ اس اطلاع کے بعد مولانا عثمانی نے اپنی تیاری مکمل کر لی اور دونوں کتابوں کے امتحان میں اول آکر انعام حاصل کیا چونکہ یہ امتحان انعام کے اعلان کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا تھا اس لئے تینوں کتابوں کے امتحانی سوالات شیخ الہند نے خود مرتب کئے اور خود ہی جوابات دیکھے مولانا عثمانی کے جوابات دیکھ کر کاپی پر "اَلسَّائِقُ هُوَ الْفَائِقُ" لکھ دیا۔ اس جملہ نے دارالعلوم میں خوب شہرت پائی۔ تقسیم انعامات کے جلسہ میں شیخ الہند نے مولانا عثمانی کی قابلیت، مناسبت فن اور طرزِ تحریر کی خاص طور سے تعریف کی کیونکہ وہ امتحانوں کے پرچے ہمیشہ عربی زبان میں لکھا کرتے تھے۔

مولانا عثمانی نہایت خوش گلو اور اچھی آواز کے مالک تھے۔ بعض اساتذہ نے مولانا عثمانی کو قرأت و تجوید سیکھنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے قاری عبدالوحید صاحب سے ایک سال تک فن تجوید کی تحصیل کی جن لوگوں کو محمد علی پارک (کلکتہ) میں مولانا عثمانی کی تقاریر سننے کا اتفاق ہوا ہے وہ جانتے ہوں گے کہ مولانا عثمانی خطبۂ ماثورہ اس قدر

اثر آفریں انداز میں پڑھتے بغنے کہ سامعین جلسہ مسحور ہو جاتے تھے۔ درس نظامی سے فراغ کے بعد مولانا عثمانی نے شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ہاتھ پر بیعت کی۔

قدیم طلبائے دارالعلوم دیوبند کی ایک مجلس جمعیۃ الانصار کے نام سے قائم ہو چکی تھی۔ اور مولانا عبیداللہ سندھی کی تحریک پر دارالعلوم میں درجۂ تکمیل قائم کیا گیا جس میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" اور مولانا قاسم نانوتوی کی بعض کتابیں نصاب میں رکھی گئیں۔ ایک دارالاخبار کھولا گیا۔ بظاہر درجۂ تکمیل کا مقصد طلبہ میں علمی مہارت کا پیدا کرنا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حقیقی مقصد ان کو دُنیا کے حالات سے باخبر رکھنا اور سیاست کے میدان کے لئے تیار کرنا تھا۔ مولانا عبیداللہ سندھی کی سرگرمیوں نے طلبہ کے حلقوں میں ایک خاص قسم کی سیاسی بیداری اور انقلاب کی تڑپ پیدا کر دی۔ ۱۳۲۸ھ کا دستار بندی کا جلسہ، جمعیۃ الانصار کا قیام، درجۂ تکمیل کا اجراء، دارالاخبار کا افتتاح، نظارۃ المعارف القرآنیہ اور ریشمی خطوط کی تحریک ایک ہی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ مولانا عثمانی درجۂ تکمیل میں داخل ہو گئے، وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبیداللہ سندھی کے رجحانات سے خاص طور سے متاثر ہوئے اور ان ہی خطوط پر مولانا عثمانی نے اپنی آئندہ زندگی کی بنیاد رکھی۔

دیوبند میں مولانا عثمانی کا درجۂ تکمیل تھا کہ بہاولپور کے چیف کورٹ کے جج میر سراج الدین نے اپنے ایک دوست کے ذریعے دارالعلوم سے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک فارغ التحصیل عالم بلایا۔ مولوی حبیب الرحمٰن نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا اور مولانا عثمانی کو بہاولپور بھیج دیا کیونکہ وہ عثمانی کی سیاسی دلچسپیوں سے خاص طور سے کھٹک رہے تھے۔ مولانا عثمانی بہاولپور پہنچ گئے۔ بچوں کی تعلیم کے بعد ان کا محبوب مشغلہ یہ تھا کہ وہ جج صاحب کے بھائی امیر علی صاحب کے ہمراہ جنگل میں شکار کے لئے چلے جاتے وہاں انہوں نے بندوق چلانے اور صحیح نشانہ لگانے میں خوب مشق بہم پہنچائی۔ بہاولپور میں مولانا عثمانی کی طبیعت نہیں لگی اور وہ جلد ہی بہاولپور سے اپنے وطن پوربنی پہنچے۔

مولانا عثمانی کے پوربنی پہنچنے پر اہلِ وطن بہت خوش ہوئے اور انہوں نے ان کو قدیم درسگاہ

"مدرسہ نعمانیہ" کو سنبھالنے پر زور دیا کیونکہ بانی مدرسہ مولوی فقیر حسن کا انتقال ہو چکا تھا مولانا اعزاز علی اور مولانا محمد سہول دارالعلوم دیوبند آچکے تھے مگر مولانا عثمانی اس پر آمادہ نہ ہوئے اور وہ سیدھے دہلی پہنچے اور مولانا عبیداللہ سندھی سے سابقہ تعارف اور ان کے سیاسی رجحانات سے متفق ہونے کی وجہ سے نظارۃ المعارف سے منسلک ہو گئے اور مولانا عبیداللہ سندھی سے علوم قرآنی میں استفادہ کیا۔

مولانا سندھی نظارۃ المعارف کے ارکان سے اپنے آئندہ سیاسی پروگرام کے متعلق گفتگو کرتے تھے اور ان کی ذہنی تربیت کرتے تھے۔ مولانا عثمانی کا بیان ہے کہ مولانا سندھی کبھی کبھی اس طرح کا مضمون لکھنے کو دیتے کہ اگر تم کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنا دیا جائے تو تم ملک کا انتظام کس طرح کرو گے؟ اسی طرح کے چبھتے ہوئے عنوانات دے کر ان نوجوانوں کی صلاحیتوں، تدبیر، سیاست فہمی اور اعتماد کا اندازہ لگاتے تھے۔ کبھی کبھی اس جماعت کو لے کر دہلی سے باہر بھوپال وغیرہ بظاہر سیر و سیاحت اور بباطن سیاسی تربیت کے لئے لے جاتے تھے۔ مولانا سندھی کے اس پروگرام میں بھوپال کے بعض اہل الرائے حضرات کی بھی ہمدردیاں شامل تھیں۔ مولانا سندھی نے ہر طالب علم کا جو وظیفہ مقرر کر رکھا تھا وہ اسے باقاعدہ ملتا تھا۔ سب طلبہ کھانا ایک جگہ کھاتے تھے۔ کبھی کبھی تو صرف بھنے چنوں پر گزر ہوتی تھی۔ نظارۃ المعارف کا قیام دو سال رہا ۱۳۳۴ھ میں مولانا سندھی شیخ الہند کے سیاسی پروگرام کے تحت کابل ہجرت کر گئے اور اس طرح بظاہر یہ ادارہ ختم ہو گیا مگر مولانا سندھی اپنے پروگرام کے تحت بہت سے نوجوانوں کو تیار کر گئے جن میں سے ایک مولانا عثمانی بھی تھے۔

مولانا عثمانی دہلی سے اپنے رفیق کار کے ہمراہ علی گڑھ پہنچے۔ یہ رفیق بھی مولانا سندھی کی جماعت میں شریک تھے۔ ان دونوں حضرات نے یہ پروگرام بنایا کہ تبلیغ کے نقطۂ نظر سے قرآنی تعلیمات پر چھوٹی بڑی کتابیں اُردو میں لکھ کر شائع کی جائیں۔ اس کام کے لئے مولانا عثمانی نے خاص طور سے عربی کتابوں سے مواد فراہم کیا مگر کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد مولانا عثمانی پھر اپنے وطن چلے گئے۔

مولانا عثمانی کو قرآن اور علوم قرآنی سے خاص شغف تھا۔ وہ قرآنی علوم میں استفادہ کی غرض سے مشہور عالم و مفسر مولانا حمید الدین فراہی کی خدمت میں حیدر آباد حاضر ہوئے۔ اور کچھ دنوں استفادہ کیا۔

حیدر آباد دکن سے واپس آنے کے بعد مولانا عثمانی اپنے قصبہ کے ایک خوش حال، قدر شناس اور علم دوست بزرگ مولوی انوار الحسن کے بچوں کی ابتدائی تعلیم کی نگرانی کے لئے باڑہ ضلع پٹنہ میں رہے مگر جلد ہی یہ تعلق ختم ہو گیا اور وہ مونگیر (خانقاہ رحمانیہ) میں مولانا محمد علی کی خدمت میں پہنچے جو حضرت شاہ فضل رحمان گنج مراد آبادیؒ کے خلیفہ اور تحریک ندوہ کے ایک اہم رکن تھے۔ مولانا محمد علیؒ نے مولانا عثمانی کے علمی ذوق اور انہماک کو دیکھ کر اپنے کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ عظیم الشان کتب خانہ تھا۔ عربی کی جو علمی کتاب مصر یا یورپ میں طبع ہوتی۔ مولانا محمد علی فوراً اس کو منگواتے۔ مولانا عثمانی نے نہایت محنت اور توجہ سے کتب خانہ کی ترتیب و تنظیم کا کام انجام دیا۔ ان کے کام سے مولانا محمد علی بہت خوش ہوئے اور انہوں نے "رحمانیہ پریس" کے نام سے ایک مطبع قائم کیا، ایک ماہانہ رسالہ کا اجرا عمل میں آیا جس کی ادارت مولانا عثمانی کے سپرد ہوئی۔

مولانا عثمانی مونگیر میں تھے کہ ان کے ایک دوست نے سورت سے تحریک کی کہ "ہم نے قرآن کریم اور حدیث شریف کی کتابوں کو انگریزی میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ آپ فوراً سورت پہنچیں۔ ہمیں اس کام میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔" مولانا عثمانی قرآن کریم کی خدمت کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتے تھے۔ سیدھے سورت پہنچے اور قرآن کریم کی تفسیر کے کام میں منسلک ہو گئے مگر یہ اہم کام بعض دشواریوں اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور مولانا عثمانی پھر مونگیر واپس آ گئے۔

چونکہ مولانا عثمانی قرآنی علوم کی نشر و اشاعت کا زبردست جذبہ رکھتے تھے اس لئے انہوں نے طے کیا کہ اُردو میں ایسی عام فہم تفسیر مرتب کی جائے جس میں لفظی تحقیقات، صرفی و نحوی ابحاث اور فقہی تفصیلات کی بجائے آیتوں کے مطالب اور سورتوں کے مقاصد

سیدھے سادھے انداز میں بیان کیے جائیں، اس مقصد کے لئے مولانا عثمانی نے مونگیر سے ایک ہفتہ وار اخبار "سبیل الرشاد" جاری کیا اور انگریزی زبان کی تحصیل بھی شروع کی تاکہ اس کے ذریعہ سے مغربی تعلیم یافتہ طبقے میں قرآن کا ذوق پیدا کیا جائے۔

اس زمانہ میں تحریک خلاف زوروں پر تھی۔ مونگیر میں خلافت کانفرنس کے سلسلے میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس کی صدارت کے فرائض مولانا شوکت علی نے انجام دیئے مقامی زعماء میں شاہ محمد زبیر بیرسٹر تحریک خلافت کے رُوح رواں تھے مولانا عثمانی اور بیرسٹر صاحب میں بہت اچھے تعلقات تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا عثمانی پورے جوش و ولولہ سے تحریک خلافت میں شریک ہو گئے۔ اگست ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں کانگریس کا خصوصی اجلاس لالہ لاجپت رائے کی صدارت میں ترک موالات کا فیصلہ کرنے کے لئے منعقد ہوا اس اجلاس میں شاہ محمد زبیر بیرسٹر کے ہمراہ مولانا عثمانی بھی مونگیر کانگریس کمیٹی کے ڈیلی گیٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور "یوم خلافت" کے موقع پر کلکتہ ٹاؤن ہال میں مولانا عثمانی نے ایک ولولہ انگیز تقریر مسئلہ خلافت پر کی۔ مولانا محمد اکرم خاں اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ اس زمانہ میں اخبار "محمدی" اور "زمانہ" کلکتہ کے مالک و مدیر اور بنگال خلافت کمیٹی کے صدر تھے۔ انہوں نے مولانا عثمانی کو بنگال خلافت کمیٹی کے صیغہ نشر و اشاعت کے انچارج کی حیثیت سے کلکتہ بلا لیا، رفتہ رفتہ مولانا محمد اکرم خاں کو مولانا عثمانی کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا تو انہوں نے مولانا عثمانی کو اپنے روزنامہ اخبار "زمانہ" کے ادارہ میں بحیثیت "مترجم" شامل کر لیا۔ یہاں سے مولانا عثمانی کے قیام کلکتہ کی ابتداء ہوئی۔

مولانا عثمانی نے کچھ دنوں "زمانہ" اخبار میں کام کیا۔ مولانا محمد اکرم خاں کو خلافت کمیٹی کی سرگرمیوں کی وجہ سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ اکثر اخبار کا اداریہ جناب وحشی شاہجہان پوری لکھا کرتے تھے۔ جب وحشی صاحب بیمار ہو کر اپنے وطن شاہجہان پور چلے گئے تو مولانا عثمانی نے اخبار "زمانہ" کا اداریہ لکھنا شروع کیا۔ کچھ دنوں تک تو مولانا عثمانی کے لکھے ہوئے اداریئے مولانا محمد اکرم خاں نے اشاعت سے پہلے دیکھے

اس کے بعد وہ مطمئن ہو گئے ۔ مولانا عثمانی پورے طور سے اخبار کے انچارج بنا دیئے گئے اور مولانا محمد اکرم خاں پوری توجہ سے خلافت کمیٹی کا کام انجام دینے لگے ۔ اس طرح مولانا عثمانی کی اخبار نویسی کا آغاز مولانا محمد اکرام خاں کی سرپرستی اور نگرانی میں ہوا۔ مولانا عثمانی فرمایا کرتے تھے کہ

" مولانا محمد اکرم خاں صاحب اخبار نویسی

میں میرے اُستاد ہیں "

مولانا عثمانی نے اخبار " زمانہ " میں کام کرنے کے دوران خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام کلکتہ اور مضافات میں منعقد ہونے والے جلسوں اور اجتماعات میں تقاریر کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ۔ ان ہی دنوں اخبار " زمانہ " میں مولانا عثمانی کا ایک اہم مضمون " مسئلہ خلافت اور ترکِ موالات مذہبی نقطۂ نظر سے " مسلسل تین قسطوں میں شائع ہوا ۔ اس مضمون نے کلکتہ کی پبلک میں ہیجان بپا کر دیا ۔ اس طرح ان تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ مولانا عثمانی کلکتہ کی پبلک میں نمایاں اور متعارف ہو گئے ۔

مولانا محمد اکرم خاں کے اخبار " زمانہ " میں کچھ عرصے کام کرنے کے بعد مولانا عثمانی نے دو تین احباب کی مشترکہ کوششوں سے ایک روزنامہ " دورِ جدید " کے نام سے نکالا جس میں اُمید سے زیادہ کامیابی ہوئی ۔ اس سلسلے میں ان کے رفقاء میں مولوی حکیم راحت حسین کا نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہے جو کلکتہ کے مشہور طبیب ' ہر دلعزیز خطیب ' اور نامور مقرر تھے ۔ ترکِ موالات کے زمانہ میں مولانا عثمانی اور حکیم راحت حسین صاحب جلسوں میں ساتھ ساتھ تقریریں کرتے تھے ۔ اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے ۔ کئی مہینے تک دورِ جدید نہایت آب و تاب سے نکلتا رہا مگر مولانا عثمانی اس شرکت کے کام سے مطمئن نہ تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کا اپنا اخبار ہو جس کی پالیسی اور جملہ امور میں وہ کسی کے پابند نہ ہوں چنانچہ انہوں نے " دورِ جدید " سے علیحدگی اختیار کر لی اور اپنا اخبار روزنامہ " عصرِ جدید " ۱۰ / اکتوبر ۱۹۲۱ء سے کلکتہ سے نکالنا شروع کر دیا جو تھوڑے ہی عرصہ میں آسمانِ صحافت پر بدرِ کامل ہو کر چمکا ۔ اب مولانا عثمانی اطمینان سے

اپنے اخبار اور خلافت کمیٹی کے کاموں میں لگ گئے۔

۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء کو پرنس آف ویلز ہندوستان پہنچ رہے تھے۔ ۲۴ دسمبر ۱۹۲۱ء کو کلکتہ میں ان کی آمد تھی۔ اس لئے ۲۴ دسمبر کو کلکتہ میں مکمل ہڑتال کا پروگرام تجویز کیا گیا حکومت نے آغاز دسمبر ہی سے سختی شروع کر دی کلکتہ میں دیش بندھو سی آر داس اور مولانا ابوالکلام آزاد کی موجودگی کی وجہ سے تحریک نے اور بھی زور پکڑا۔ جلسے جلوسوں کی ممانعت ہو گئی۔ رضا کاروں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا مگر رضا کار اتنی کثرت سے خود کو پیش کرتے تھے کہ پولیس ان کی گرفتاری سے عاجز آگئی۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو علی الصبح مولانا عثمانی گرفتار کر لئے گئے جس کا انہیں پہلے سے انتظار تھا۔ چیف پریزیڈنسی کی عدالت میں پیش ہوئے۔ مولانا محمد اکرم خاں، مولانا حکیم عبدالرؤف دانا پوری، مولانا ابوالکلام آزاد، دیش بندھو سی آر داس سب اسی دن گرفتار کئے گئے۔ مولانا عثمانی کے مقدمہ کی آخری سماعت ۲۳ دسمبر کو ہوئی دفعہ ۵۰۵ تعزیرات ہند کے تحت ایک سال قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اسی دفعہ کے تحت مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی وغیرہ کراچی کے مقدمہ میں ماخوذ ہوئے تھے مقدمہ کا فیصلہ سنانے کے بعد مولانا عثمانی کو علی پور جیل بھیج دیا گیا۔ ان کے رفقاء میں مولانا محمد عثمان مینیجر روزنامہ "ہند" کلکتہ، مسٹر ہاشم عبدالرحمٰن، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی مولانا حکیم سعید الرحمٰن اور مولانا محمد اکرم خاں وغیرہ تھے۔ مشقت کے سلسلے میں ان حضرات کو لفافے بنانے کا کام ملا۔ مولانا عثمانی نے اسیری کے زمانہ میں بنگلہ زبان سیکھی اور اہل زبان کی طرح نوشت و خواند کی مشق بہم پہنچائی۔ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے دوسرے ہفتہ میں مولانا عثمانی کی جیل سے رہائی ہوئی۔

مولانا عثمانی کی اسیری کے زمانہ میں مولانا کے بعض رفقاء نے عصر جدید کو جاری رکھنا چاہا مگر اس میں ان کو کامیابی نہ ہوئی اور عصر جدید بند ہو گیا۔ مولانا عثمانی کی رہائی کے بعد نومبر ۱۹۲۲ء سے عصر جدید دوبارہ جاری ہو گیا۔ مولانا خیر رحمانی دربھنگوی نے عصر جدید کے دوبارہ جاری ہونے پر مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے:-

تاریخ جدید اجرائے عصرِ جدید

۱۹۲۲ء

غل ہے شہید آسا مر کر ہوا ہے زندہ

۱۹۷۹ء سمبت
مسرور زندگی ہے ضابط شہید نکلا
۱۸۴۴ء شاکھا

کیسی خوشی ہوئی ہے نکلا حدیقۂ گل

۱۳۳۰ف
ایک شور اہلِ فن تھا وہ ماہِ عید نکلا
۱۳۴۱ھ

تھا جس کے بند ہونے سے حرج و فکر سب کو

۱۳۰۱ شمسی
پھر شان سے وہ آخر عصرِ جدید نکلا

۱۹۲۴ء (۱۹۲۲ء) میں عصرِ جدید کا اپنا ذاتی پریس ہو گیا۔ عصرِ جدید ایک کامیاب اخبار تھا۔ باوجودیکہ بنگال سے نکلتا تھا جہاں کی زبان بنگلہ ہے مگر اس کا دائرہ صوبۂ بہار، اڑیسہ، یوپی، حیدرآباد دکن، آسام، برما تک وسیع تھا۔

عصرِ جدید سے پہلے کلکتہ سے رسالت، جمہور، نقاش، رہبر اور زمانہ وغیرہ اخبارات نکل چکے تھے مگر عصرِ جدید کی یہ خصوصیت ہے کہ طرح طرح کے موانع، مشکلات اور مخالفتوں کے باوجود زندہ اور کامیاب رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۵ء میں عصرِ جدید کی شاندار جوبلی منائی گئی۔ اگست ۱۹۴۷ء تک عصرِ جدید نہایت آب و تاب اور کامیابی کے ساتھ کلکتہ سے نکلتا رہا۔ خاکسار محمد ایوب قادری کی تحریک پر مولانا عثمانی نے عصرِ جدید کا مکمل فائل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی لائبریری کو مرحمت فرما دیا جو اب ہمدرد دواخانہ کی لائبریری (ناظم آباد) میں منتقل ہو چکا ہے۔ یہ مولانا عثمانی کا بہت بڑا ایثار اور معارف پروری ہے۔ عصرِ جدید کو احمد حسین بھاگلپوری (مولانا عثمانی کے ایک عزیز) مولوی خلیل الرحمٰن بی۔اے (کلکتہ کے مشہور جرنلسٹ) غلام احمد شیخ (فاضل جامعہ ملیہ دہلی) مولانا نجیب اشرف ندوی، مولانا جمیل مظہری ایم۔اے، مولانا چراغ حسن حسرت کشمیری، مظفر حسین شمیم رائے پوری، ڈاکٹر عبدالحمید ارشد عظیم آبادی اور مولانا عبدالجبار وحیدی شہید وغیرہ

کا تعاون حاصل رہا اور ان میں سے اکثر حضرات نے عصرِ جدید کے شعبۂ ادارت کی ذمہ داریوں کو سنبھالا۔

عصرِ جدید کلکتہ نے ملتِ اسلامیہ کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ تحریک خلافت اور مسلمانانِ برِ صغیر کی وحدت و تنظیم میں بڑا کردار ادا کیا ہے ۱۹۳۷ء سے تحریکِ پاکستان میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ مسلم لیگ اور قائد اعظم کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ قیامِ پاکستان کے بعد مولانا عثمانی اور عصرِ جدید کی بھارت میں کہاں گنجائش تھی۔ نئے حالات بدلے ہوئے ماحول اور ارضِ پاک کی کشش کا تقاضا یہ ہوا کہ مولانا عثمانی فروری ۱۹۴۸ء میں کراچی آ گئے۔ حالات جب ذرا درست ہوئے تو دسمبر ۱۹۵۱ء میں کراچی سے پھر عصرِ جدید جاری کر دیا۔ خیال تھا کہ پاکستان میں عصرِ جدید خوب ترقی کرے گا اور یہاں ملتِ اسلامیہ کی خدمت کا اچھا موقع ملے گا مگر ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

۱۹۵۴ء میں کثیر نقصان اٹھا کر عصرِ جدید بند ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ ربع صدی میں مسلم اخباروں میں بہت کم ایسے اخبار ہوں گے جن میں اسلامی سیاست پر قرآن اور اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں علیٰ وجہ البصیرۃ بحث کی جاتی ہو۔ عصرِ جدید نے شیخ الہند محمود حسن کی پالیسی کو اپنایا، مسلمانوں کو جمود و تعطل سے چونکا کر قوت و عمل کی دعوت دی اور ان کو تنظیم و اتحاد کا سبق دیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے اکتوبر ۱۹۴۸ء میں کراچی میں عصرِ جدید پریس کے قیام کی تقریب کے موقع پر ایک عام جلسہ میں فرمایا تھا کہ:

"میں عصرِ جدید کو صرف ایک اخبار نہیں
بلکہ ایک تبلیغی ادارہ سمجھتا ہوں"

۱۹۳۳ء سے مولانا شائق احمد عثمانی کی بیماری کا سلسلہ شروع ہوا مگر اس بیماری کے باوجود مولانا عثمانی نے قومی، سیاسی، علمی اور مذہبی خدمات کو مسلسل جاری رکھا۔ ان کی خدمات کی پوری روداد اور تفصیل عصرِ جدید کی تیس سالہ فائلوں میں محفوظ ہے۔

مولانا عثمانی کا علمی سلسلہ شیخ الہند سے وابستہ ہے۔ انہیں قرآن کریم کی خدمت کا ذوق ہمیشہ رہا۔ مولانا عثمانی نے پارۂ عم بتساؤلون کی تفسیر ۱۹۱۷ء میں اور تبارک الذی کی تفسیر ۱۹۱۹ء میں شائع کی جو بہت مقبول ہوئیں جب کراچی سے عصر جدید شائع ہوا تو اس میں تین سال تک مستقل درس قرآن کے عنوان سے ایک کالم نکلتا رہا۔ جس میں اہم ترین اور دینی مسائل کا حل قرآن کریم کی روشنی میں بتایا جاتا تھا اگر اس مواد کو کتابی شکل میں مرتب کیا جائے تو کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں۔ قرآن کریم کی چھ سورتوں (۱) بینہ (۲) عادیات (۳) علق (۴) شمس (۵) لیل (۶) عصر کی مفصل تفسیر جدید انداز میں لکھی جو افسوس زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکی۔

مولانا شائق احمد عثمانی نے معذور و مجذوم ہونے اور صحت کی نااستواری کے باوجود قلم و کتاب سے تعلق رکھا اور کئی کتابیں لکھیں۔ وہ کالج کے طلبہ کو انگریزی پڑھاتے تھے۔ گرامر اور ترجمہ کی مشق کراتے تھے۔ اس طرح خدمت علم و ادب کرتے رہے تا آنکہ آخر وقت آپہنچا۔ اور ۲۶ اگست ۱۹۷۸ء مطابق ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ کو عالم آخرت کی راہ لی۔

---

*

زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر محمد ایوب قادری کے اُن سوانحی و شخصی مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے مختلف اخبارات و جرائد میں وقتاً فوقتاً لکھے۔ یہ مضامین جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، مرحومین کے بارے میں ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو متعلقہ افراد کی وفات کے فوراً بعد لکھے گئے اور بعض مضامین ایسے افراد کے متعلق ہیں جن کا انتقال سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۴۲ء تک کے دوران ہوا۔ اس دور کے جن افراد پر لکھا گیا ہے، ان کے بارے میں بعض نئی معلومات کی فراہمی کا خیال بطورِ خاص رکھا گیا ہے، اور بعد کے دور کے افراد پر لکھتے ہوئے، ان کے مکمل حالاتِ زندگی قلمبند کیے گئے ہیں، اور ساتھ ہی قادری صاحب نے ان افراد سے اپنے تعلقات کی روداد بھی بیان کر دی ہے۔ اس اعتبار سے یہ مضامین، شخصی خاکے بھی ہیں اور مختصر سوانح عمریاں بھی۔ قادری صاحب نے خاکہ نگاری اور سوانح نویسی کو یکجا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جس سے کتاب کی دلچسپی اور افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

مشفق خواجہ